URDU ADAB MAIN KHAKA NIGARI MIZAH NIGARON KE HAWALY SE

DISSERTATION

SUBMITTED TO THE UNIVERSITY OF HYDERABAD IN PARTIAL FULFILMENT OF THE REQUIREMENT FOR THE AWARD OF DEGREE OF
DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN URDU.

SUBMITTED BY
Ms.RAHAMATH BI K
M.Phil(Urdu)

Supervisor By
Dr.Arshia Jabeen
Assistant Professor, Dept. of Urdu,University of Hyderbad

DEPARTMENT OF URDU
SCHOOL OF HUMANITIES.
UNIVERSITY OF HYDERABAD
GACHIBOWLI
HYDERABAD - 500046.(T.S)
2016

DECLARATION

I ***RAHAMATH BI K*** here by declare that this thesis entitled ***URDU ADAB MAIN KHAKA NIGARI MIZAH NIGARON KE HAWALY SE"***. Submitted by me under the guidance and supervision of Assistant Professor ***Dr.Arshia Jabeen*** is a Bonafide research work which is also free from plagiarism. I also that it has not been submitted previously in part or in full to this University or Institution for award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodganga/INFLIBNET.

Name: ***Ms.RAHAMATH BI K***

Date:29-06-2016

Signature of the Student

Regd.No.11HUPH03.

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled***URDU ADAB MAIN KHAKA NIGARI MIZAH NIGARON KE HAWALY SE***".. Submitted by ***RAHAMATH BI K*** bearing **Reg.No. 11HUPH03** in partial fulfillment of the requirements of the award of Doctor of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by her under my supervison and guidance.

The thesis has not been submitted previously in part or in part of in full to this or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

Date:29-06-2016

Signature of the Supervisor

Head of the Department

Dean of the School

اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح نگاروں کے حوالے سے

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

نگران

ڈاکٹر عرشیہ جبین

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

مقالہ نگار

کے رحمت بی

ایم اے، ایم فل

شعبہ اردو اسکول آف ہیومانیٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد-500046

2016

اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح نگاروں کے حوالے سے

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

نگران

ڈاکٹر عرشیہ جبین

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

مقالہ نگار

کے رحمت بی

ایم اے، ایم فل

شعبہ اردو اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔500046

2016

اردو ادب میں خاکہ نگاری

مزاح نگاروں کے حوالے سے

خاکہ اردو ادب کی منفرد صنف کی حیثیت سے مقبول عام ہے۔ خاکہ نہایت مختصر عرصے میں ادب کی ایک اہم ترین صنف کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ جن کی ایک وجہ یہ ہے کہ ادب کا بنیادی مقصد بزات خود انسان ہی کا مطالعہ و مشاہدہ قرار پاتا ہے اور خاکے میں یہ مقصد باقی اصناف کی نسبت زیادہ نمایاں ہو کے سامنے آتا ہے۔ خاکے کے لئے انگریزی اصطلاح Sketch رائج ہے۔ اس کے لغوی معنی کچے نقشہ، ڈھانچہ، چربہ اور حدود وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاح میں خاکہ دراصل کسی شخصیت کی قلمی تصویر ہوتی ہے جس کا خالق ایک ادیب ہوتا ہے جو اپنی ادیبانہ قوتوں سے کسی شخص کی عکس کشی یا مرقع نگاری کرتا ہے۔ اس کے بنانے میں نہ سنگ تراشی کے اوزاروں کی ضرورت ہے، نہ رنگا رنگ پیالوں اور برش کی، نہ پنسل چارکول کی اور نہ کیمروں، بلکہ یہ صورتیں محض الفظ سے مرتب کی جاتی ہیں اور ان میں تصویروں اور مجسموں سے زیادہ دلکشی اور اثر خیزی ہوتی ہے۔ اور خاکے میں خارجی شخصیت کے مقابلے میں داخلی شخصیت یعنی عادات و اطوار، مزاح، نفسیات، پسند نہ پسند وغیرہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔

خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش شعراء کے تذکروں، مرزا غالب کے خطوط وغیرہ میں ملتے

ہیں۔مگر محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' تذکروں کی ترقی یافتہ شکل میں نمودار ہوتی ہے۔اس میں شعراء کے جاندار تصویریں نظر آتی ہیں۔جن کا ثبوت ہمیں ''آب حیات'' میں شامل میرؔ، انشاؔ اور آتش وغیرہ کے مضامین سے ہوتا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد حسین آزد نے خاکہ نگاری کا ناک نقشہ کافی حد تک تیار کر چکے تھے۔

محمد حسین آزاد کے ذریعے رکھی ہوئی اس بنیاد کو مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مضمون ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کے ذریعہ اس کی عمارت کی طرف پہلا قدم رکھا۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد مولوی عبدالحق ، رشید احمد صدیقی ، خواجہ حسین نظامی ، شوکت تھانوی ،آغا حیدر حسن دہلوی ،عصمت چغتائی ،تخلص بھوپالی ،فکر تونسوی ، رئیس احمد جعفری، شاہد احمد دہلوی،سعادت حسن منٹو،مجتبیٰ حسین اور عطاالحق قاسمی وغیرہ نے خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔خاکہ نگاری کے بارے میں عام بات یہ ہے کہ زیادہ تر خاکہ نگاروں نے اس صنف کے پہلو بہ پہلو طنز و مزاح اور انشائیہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔اس طرح خاکہ نگاری میں دوسرے اصناف کی خصوصیات بھی اس میں شامل ہوگئی ہیں۔اس طرح ان کی ادبی اہمیت کے پیش نظر میں نے ''اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح نگاروں کے حوالے سے'' کو اپنی پی۔ایچ ڈی کے تحقیق کے لئے انتخاب کیا ہے۔اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب ''اردو ادب میں خاکہ اور مزاح کی تعریف اور فن'' رکھا گیا ہے۔اس باب میں

خاکہ اور مزاح کے لغوی معنی مختلف لغات کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔مثلاً اردو، ہندی، انگریزی، اور تلگو وغیرہ کی لغات کی مدد سے خاکہ اور مزاح کے معنی و مفہوم پیش کئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ مختلف ناقدین کی آراء کی مدد سے خاکہ اور مزاح کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔

دوسرا باب ''اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت'' کے تحت ہے۔اس بات میں شروع سے لے کر اب تک کہ خاکہ نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے اہم خاکوں کو بھی پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ ان کے اہم خاکوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس کی وجہ سے خاکہ نگاری کی تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم ''اردو ادب میں مزاح نگاری کی روایت'' ہے۔اس باب میں شروع سے لے کر اب تک اردو ادب میں مزاح نگاروں کے آغاز وارتقاء کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔مثلاً مرزا غالب سے لے کر اب تک کے مزاح نگاروں کی ادبی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔اور ان کی اہم اور مشہور تصانیف کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

چوتھا باب ''اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح، نگاروں کے حوالے سے'' رکھا گیا ہے۔اس باب میں ایسے خاکہ نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے جو مزاح نگار بھی ہیں۔اس باب میں خاکہ نگاروں کے حالات زندگی اور شخصیت کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے ان کی خاکہ نگاری کی خصوصیات جیسے پہلی ملاقات، حلیہ، عادات واطوار، گفتگو، مزاح، لطیفے، محاوروں اور تشبیہات وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

پانچواں باب ''مجموعی جائزہ'' کے تحت ہے اس میں مزاحیہ خاکہ نگاروں کی خصوصیات کا مجموعی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔اور ناقدین کے آراء کی مدد سے ان کے خاکوں کی خصوصیات کا احاطہ

کیا گیا ہے۔

آخر میں کتابیات درج کی گئی ہے۔اس میں ان کتابوں کی فہرست درج ہے جو حوالے کے طور پر استعمال کی گئی ہیں۔

کے۔رحمت۔بی

(ایم۔اے ایم۔فل)

☆☆☆

فہرست

پیش لفظ	03
پہلا باب	
اردو ادب میں خاکہ اور مزاح کا مفہوم اور فن	08
(الف) مزاح کا مفہوم اور فن	08
(ب) خاکے کا مفہوم اور فن	35
دوسرا باب	
اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت	58
تیسرا باب	
اردو ادب مزاح نگاری کی روایت	104
چوتھا باب	
اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح نگاروں کے حوالے سے	
(الف) پس منظر	153
(ب) مزاح نگاروں کی خاکہ نگاری	155
1۔مرزا فرحت اللہ بیگ	156
2 ۔خواجہ حسن نظامی	184
3۔رشید احمد صدیقی	190
4 ۔شوکت تھانوی	216

5 ۔اشرف صبوحی	245
6۔شاہد احمد دہلوی	257
7۔سعادت حسن منٹو	289
8۔سید ضمیر جعفری	314
9۔فکر تونسوی	321
10۔شفیق الرحمٰن	335
11 ۔محمد خالد اختر	348
12۔یوسف ناظم	345
13۔مجتبیٰ حسین	369
14۔عطاالحق قاسمی	395
15۔پرویز اللہ مہدی	402
16 ۔انور ظہیر خان	408
17۔مشفق خواجہ	430
پانچواں باب	
مجموعی جائزہ	433
کتابیات	442

☆☆☆

پیش لفظ

خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ جس نے بہت ہی مختصر عرصے میں ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ انگریزی میں خاکے کے لیے اسکیچ یاPen Portriat کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں اس کو ''ریکھا چتر'' کہتے ہیں۔ یہ صنف اردو، انگریزی اور ہندی ادب کی مقبول ترین اصناف میں شامل ہے۔ خاکہ کے لغوی معنی ڈھانچہ، چربہ، پلان یا مسودہ اور کسی کی تصویر کو لفظوں میں ادا کرنا کے ہیں۔ اصطلاح میں خاکے سے مراد وہ صنف ہے کسی شخصیت کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی آمیزش سے ایسی جیتی جاگتی تصویر بنانا جس کی وجہ سے شخص کی پوری تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ اس صنف میں اختصار کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور موضوع خاکہ کی شخصیت کے ان مخصوص واقعات کو اختصار کے ساتھ اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ موضوع خاکہ کی ہو بہ ہو عکاسی ہو جائے۔ اس کے لیے خاکہ نگار کے لیے اسلوب پر قدرت ضروری ہے۔

اردو خاکہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اس کے ابتدائی نقوش تذکروں اور داستانوں میں شامل ہیں۔ مگر اس کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاتھوں ہوا۔ یہ دراصل ایک مزاح نگار تھے۔ مجھے خاکہ نگاری سے بے حد دلچسپی تھی۔ میں نے جب رشید احمد صدیقی پر ایم فل کا کام کیا اس لیے میری دلچسپی خاکہ نگاری کی جانب رہی اور جب پی ایچ ڈی میں موضوع کے انتخاب کا

مرحلہ آیا تو میں نے خاکے میں مزاح کے پہلو پر کام کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ میری نگران نے بھی اس موضوع ہی کو پسند فرمایا۔ اور صدر شعبہ اردو اور دیگر اساتذہ کی منظوری کے بعد ''اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح نگاروں کے حوالے سے'' میری پی ایچ ڈی کا موضوع طے پایا۔ میں نے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

مقالے کا پہلا باب ''اردو ادب میں خاکہ اور مزاح کی تعریف اور فن'' رکھا گیا ہے۔ اس باب میں خاکہ اور مزاح کے لغوی معنی مختلف لغات کی مدد سے پیش کیئے گئے ہیں۔ مثلاً اس سلسلے میں اردو، ہندی، تلگو اور انگریزی لغات کی مدد لی گئی ہے اور مختلف ناقدین کی آراء کی مدد سے خاکہ نگاری اور مزاح نگاری کی تعریفیں پیش کرتے ہوئے ان کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب ''اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں خاکہ نگاری کی ابتدا سے لے کر تا حال کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے تاکہ اردو میں خاکہ نگاری کا ایک خاکہ ہمارے سامنے موجود ہو۔

باب سوم ''اردو ادب میں مزاح نگاری کی روایت'' کے عنوان کے تحت ہے۔ جس میں مزاح نگاری کی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ اردو میں مزاح نگاری کی روایت سے بھی واقفیت حاصل ہو جائے۔

اس مقالے کا چوتھا باب ''اردو میں خاکہ نگاری مزاح نگاروں کے حوالے سے'' کے عنوان سے رکھا گیا ہے۔ یہ مقالے کا اہم باب ہے۔ اس میں اردو کے اہم اور مقبول مزاح نگاروں کی خاکہ نگاری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں ان کے خاکوں کے اہم اجزاء کے علاوہ ان کی مزاحیہ عناصر کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

اس مقالے کا باب پنجم ''مجموعی جائزہ'' کے تحت ہے۔ اس میں اردو کے مزاح نگاروں کی

خاکہ نگاری کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مجموعی حیثیت سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

شکریہ کے فرائض میں سب سے پہلے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ہدیہ تشکر بجالاتی ہوں، جس نے مجھے وقت پر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ مقالے کی تکمیل کے اس موقع پر میں سب سے پہلے اپنے دادا اور دادی کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے میری تربیت کی۔ جن کے زیر سایہ میں نے تعلیمی مراحل طے کئے اور ان ہی کی بدولت میں اردو کی طرف راغب ہوئی۔ مقالے کی تکمیل میں میرے والدین کا ہاتھ بھی رہا ہے۔ میرے والد نے میری نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ہر مشکل میں میرا ساتھ بھی دیا ہے اور میری والدہ محترمہ نے ہر وقت یہی دعا کی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں اور سماج میں اپنا مقام بناؤں۔ ان کی محبت و شفقت میرے ساتھ ہمیشہ رہی۔ اس موقع پر میں اس چھوٹی سی پری کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو میری پیاری سی بیٹی ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے کبھی بھی اپنے تحقیق کے دوران دقت اٹھانی نہیں پڑی۔ اس نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ تمام افراد خاندان کی محبتیں اور دعائیں بھی میرے ساتھ رہیں۔ خاص کر میرے بھائیوں اور بہنوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور میرے حق میں دعا کی۔ میں میرے رفیق حیات کی تاحیات شکر گذار رہوں گی جن کا بھرپور تعاون میرے ساتھ رہا۔ ان کی مدد نہ ہوتی تو شاید وقت پر میرا مقالہ مکمل نہ ہو پاتا۔

میں صدر شعبہ اردو پروفیسر مظفر علی شہ میری کی ممنون و مشکور ہوں جن کی رہنمائی اور تعاون ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ تدریس کے دوران تحقیق سے متعلق اہم معلومات فراہم کیں اور وقت پر مقالہ مکمل کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

میں اپنی نگران ڈاکٹر عرشیہ جبیں صاحبہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جنھوں نے ہر موڑ پر میری مدد کی ہے۔ انھوں نے موضوع کے انتخاب، مواد کی فراہمی اور مقالے کی تکمیل تک ہمیشہ مشوروں سے میری مدد فرمائی اور ناقدانہ نوازا اور ہر مشکل وقت پر انھوں نے محبت و شفقت سے میری حوصلہ

افزائی ورہنمائی کی ہے۔انھیں کے کوششوں اوردعاؤں کی وجہ سے آج وقت پر میرا مقالہ تکمیل کو پہنچ پایا۔

میں یونیورسٹی آف حیدرآباد کے شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ کی تہہ دل سے شکرگذار ہوں کیوں کہ یہاں کے اساتذہ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میں اپنی تمام سینئر، جونیئر اور ساتھی طالب علموں کی بھی سپاس گذار ہوں۔جنھوں نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں میری مدد کی ہے۔ان میں میری سینئر ساتھی واجدہ بیگم کی بے حد ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے ہر موڑ پر میری مدد فرمائی ہے۔ان کے علاوہ میں فریدہ بیگم اور ناہیدہ سلطانہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کا خلوص میرے ساتھ رہا۔ میں محمد مخدوم محی الدین صاحب اور محمد کلیم محی الدین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے کمپوزنگ کی ذمہ لے کر میری مشکل کو آسان کر دیا۔

شکریہ!

کے رحمت بی

(ایم فل۔اردو)

باب اول

اردو ادب میں مزاح اور خاکے کا مفہوم اور فن

اردو ادب میں مزاح اور خاکے کا مفہوم اور فن

(الف) مزاح کا مفہوم اور فن

طنز و مزاح اور خاکہ دو علحدہ اصناف ہیں۔اس لئے یہاں ابتدا میں طنز اور مزاح کی تعریفین پیش کرتے ہوئے اس کے فن پر روشنی ڈالی جائیگی پھر لغت اور مختلف دانشوروں کی آراء کے حوالے سے طنز و مزاح کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے فن پر بھی روشنی ڈالی جائے گی ۔طنز عربی زبان کا لفظ ہے، جسے انگریزی زبان میں Satire کہتے ہیں۔

طنز کے لغوی معنی رمز کے ساتھ بات کرنے کے ہیں۔جامع فیروزلغات میں طنز کے معنی یوں درج ہیں:

''طعنہ، مہنا، ٹھٹھر، تمسخر، رمز کے ساتھ بات کرنا''۔ 1

اعجاز الغات میں طنز کے معنی ان الفاظ میں شامل ہیں:

''طعنہ، مذاق، رمز کے ساتھ بات کرنا''۔ 2

رابعہ اردو لغت میں طنز کے معنی اس طرح سے بیان کئے گئے ہیں:

''رمز و کنایہ، ناز و غزہ، چھیڑ، بولی ٹھولی، طعنہ''۔ 3

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے شائع کردہ ڈکشنری میں طنز کی تعریف یوں کی ہے:

ا۔''ہجو، ہجویہ نظم، ہجویہ تذنیف یا قصیدہ۔

۲۔تضحیک،موجب تنگ،باعث عار۔

۳۔طعن،طنز،تعریض۔''

Urdu english dictionary, N.C.P.U.L. ص:357

علمی اردو لغت میں طنز کے معنی کچھ اس طرح سے شامل ہیں:

''طعنہ،مہنا،ٹھٹھا،تمسخر،رمز کے ساتھ بات کرنا''۔ 4

لغات کشوری میں طنز کے معنی ان الفاظ میں شامل ہیں:

''ناز،رمز کی بات کہنا،طعنہ'' 5

طنز کے معنی Standered 21 st century اردو انگلش ڈکشنری میں طنز کے معنی ان الفاظ میں شامل ہیں:

"Tanund, Sarcasm, wit, witticism" 6

طنز کو انگریزی میں Satire کہتے ہیں۔یہ لفظ Satire لاطینی لفظ ہے،اس لفظ کو سب سے پہلے استعمال کرنے والے یونانی ہیں،آکسفورڈ ڈکشرنی میں طنز Satire کے معنی یوں شامل ہیں۔

''ا۔ہجو،طنزیہ،مضحک تحریر جو کسی کی حماقت یا شرارت وغیرہ کو موضوع بنا کر لکھی جائے۔

۲۔طنز پر مبنی نظم ونثر کی کوئی تحریر۔

۳۔طنزیہ ادب۔

۴۔کوئی بات جس میں کسی کی مذمت یا تضحیک کا پہلو نکلتا ہو''۔7

Satire یا طنز کے معنی The Standard Englis Urdu ڈکشنری میں یوں درج ہے:

''ہجو،ہجو یہ نظم،ہجو یہ تصنیف،تضحیک''8

طنز کی ان تعریفوں کے مطالعے کے بعد اس بات کا احساس ہوتا ہے۔طنز عربی زبان کا

لفظ ہے۔اس کو انگریزی میں Satire کہتے ہیں اور لفظ سیٹائیر لاطینی زبان کا لفظ ہے۔
اس کو سب سے پہلے استعمال کرنے والے یونانی ہیں۔اور طنز کے معنی رمز کی بات کہنا، ہجو، ہجویہ نظم، طعنہ بنا، تمسخر وغیرہ کے ہیں۔

طنز کو انگریزی میں Satire کہتے ہیں۔اردو میں Satire کے معنی ادا کرنے کے لئے صرف ایک لفظ کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے عربی اور فارسی زبان میں اور بھی اصطلاحات رائج ہیں وہ ہجو، ہجا، تعریض، ملیح، تنقیص، لعن وطعن، استہزا، مذمت، مضحکات، اور ہزل وغیرہ ہیں۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''سٹائر کا مفہوم جو انگریزی ادب میں ہے اس کی پوری اور صحیح ترجمانی ہمارے یہاں کے کئی ایک لفظ میں تقریباً نامکمل ہے، عربی اور فارسی میں اس موقع پر چند الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً ہجو، ہجا، ملیح، تعریض، تنقیص، لعن و طعن، طنز، استہزا، مذمت، مضحکات، تلمیحات، ہجو، ہزل وغیرہ''۔9

طنز دردمند انسان کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے۔ جو زندگی کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے انسان کے ذہین میں پیدا ہوتی ہیں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''طنز جو بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حساس اور دردمند انسان کے ذہنی رد عمل کا نتیجہ ہے، جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختہ مشق بنالیا ہو''۔10

خواجہ عبدالغفور نے طنز کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ طنز ایک تنقید ہے جو کسی کا مذاق اڑانے کے لئے کی جاتی ہے، اپنے آپ پر ہنسنا ہے اور دیگر انسانوں کی کمزوریاں کو بے نقاب کرنا اس کا اہم مقصد ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''طنز تنقید ہے، صدائے احتجاج ہے، دُشنام یار ہے، اس کا مقصد اصلاح

ہے، پگڑی اچھالنا ہے، احساس برتری کا مظاہرہ کرنا ہے، بے ہودہ اشیا اور اشخاص کا مضحکہ اڑانا ہے۔ طنز مبالغہ ہے، مشغلہ ہے، مہتابی ہے، انار ہے، پھلجھڑی ہے، اپنے آپ پر ہنسنے کا نام ہے، چٹکلی لینا ہے، ہمدردانہ نقطہ نظر سے انسانی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کا فن ہے''۔ 11؎

انسائیکلوپیڈیا میں طنز کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے:

''ہجو یا ہجا، [طنزیات کے مفہوم میں] کا مقصد یہ ہے کہ کسی بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جذبۂ تفریح یا تفریحات کو تحریک ہو بشرطیکہ جو طنز میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو اگر ان حیثیتوں کا فقدان ہوا تو پھر یہ گالی گلوچ یا دہقانیوں کی طرح منہ چڑھانا ہوگا''۔ 12؎

ڈاکٹر مظہر احمد طنز کی تعریف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ طنز زندگی کو گھناؤنے روپ میں پیش کرتا ہے اور یہ ایک ایکسرے مشین کی طرح کام کرتا ہے، ایکسرے مشین انسانی جسم میں موجود تمام بیماریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے لئے علاج کا بھی بندوبست کرتا ہے جس طرح سے کوئی بھی چیز ایکسرے مشین سے چھپ نہیں سکتی ہے ٹھیک اسی طرح سے طنز بھی اپنا کام کرتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''طنز فرد و سماج کی ناہمواریوں، خامیوں، کمیوں اور لاقانونیت پر حملہ آور ہوتا ہے اور زندگی کو اس کے انتہائی گھناؤنے روپ میں پیش کرتا ہے، وہ اپنے پرائے دوست واحباب کو خاطر میں نہیں لاتا۔ طنز ایکسرے مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ وہ اندرون میں چھپی بیماریوں کو عیاں کرتا ہے۔ وہ محض زخم کا پتہ ہی نہیں لگاتا بلکہ اس کے لئے علاج کا بھی بندوبست کرتا ہے۔ وہ میزان حیات کا کام انجام دیتا ہے اور تطہیر کے فریضے تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ وہ بات بات میں علاج غم دل

کا موجب ہوتا ہے۔ وہ تعمیری مقصد لئے ہوتا ہے مگر ابتدا اس کی تخریب سے ہوتی ہے۔اس کی نظر عالم گیر ہوتی ہے، سارے جہاں کا درد اس میں سمایا ہوا ہوتا ہے،اس طرح طنز Universal Satire کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے''۔13؎

رشید احمد صدیقی کے نزدیک حقیقی طنز ہمیشہ ہی کڑوی اور بدمزیدار ہوتی ہے۔اس کے بیان کے لیے ایسے ہی الفاظ کا استعمال کرنا چاہئے جس سے سماج کو کم نقصان پہنچے مگر غیر شعوری طور پر اس شخص کی اصلاح ہوجائے جس کو نشانہء طنز بنایا جا رہا ہو۔لحاظہ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''طنز کا تلقین حقیقت ہوتا ہے حقیقت بلاشبہ ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔اس تلخی کو ایسے الفاظ میں بیان کرنا کہ اس شخص اور سماج کو کم نقصان پہنچے لیکن غیر شعوری طور پر اس کی اصلاح ہوجائے کہ جس پر وار کیا گیا۔یہی حقیقی طنز ہے''۔14؎

شوکت سبزواری کے خیال میں طنز ایک تیز اور بیدردانہ قسم کی تنقید۔کیوں کہ تنقید میں اچھے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ برے پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی جاتی ہے،طنز میں اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں۔انہوں نے طنز کو عمل جراحی کہا ہے، کیوں ک طنز ایک طرح سے سرجن کا کام کرتا ہے،جس طرح سرجن جسم کے زخموں کا علاج کرتا ہے ٹھیک اسی طرح طنز نگار برے پہلوؤں کو ڈھونڈ کر ان پر طنز کرتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''طنز ایک طرح کی تنقید ہے۔ایک قسم کا عملِ جراحی ہے، تنقید کئی طرح کی ہوتی ہیں۔طنز شدید، تیز اور بیدردانہ قسم کی تنقید میں ایک چیز کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے ہوتے ہیں۔ اور ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ جہاں برے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے وہاں اچھے پہلوؤں کو بھی اجاگر کرے۔تنقید ہمدردانہ ہوتی ہے، توازن اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔طنز میں چیز کے برے پہلو

نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں''۔15؎

طنز کا تعلق انسانی شعور اور احساس سے ہوتا ہے۔اس لئے اس میں صرف غم اور غصے کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔اور طنز کمزوریوں اور خرابیوں کی نشاندہی کر کے اس کے ذریعہ وقوع پذیر ہونے والے برے پہلوؤں کا احساس دلاتا ہے۔لہٰذا اس بات پر اکتفا کرتے ہوئے پروفیسر آفاق حسین صدیقی لکھتے ہیں:

''طنز ذکاوتِ احساس کی بناء پر پیدا ہونے والے ایک ایسے ردعمل کا اظہار ہوتا ہے جس میں غم وغصہ اور برہمی کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔اس میں کمزوریوں، خامیوں، خرابیوں، نقائص، بدنظمی، بدنمائی، بدسلیقگی، بے ڈھنگے پن اور تلخیوں وغیرہ کو استہزایہ انداز میں پیش کر کے ان کے مضر اور نقصان دہ پہلوؤں کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔بے ہنگم اور قبیح معاملات کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔سماجی اور تہذیبی زندگی میں سرایت کیے ہوئے امراض کی تشخیص کی جاتی ہے اور ناسوروں کو کریدا جاتا ہے۔طنز اصل میں برہمی کا اظہار ہے جو برائیوں خامیوں، خرابیوں اور ناانصافیوں وغیرہ سے شدید بیزاری نفرت اور حقارت سے پیدا ہوتی ہے''۔16؎

طنز جذبات کے اظہار کا نام ہے اور اس میں جذبات کے گہرائیوں کا پتہ لگتا ہے۔چنانچہ وقار عظیم فرماتے ہیں:

''طنز جذبات کے اظہار کا ایسا نام ہے جس میں انسان جذبات کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کی سطحی محرکات سے بچتا ہوا کسی ایسی بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسکی آواز میں پیمبرانہ شان پیدا ہوتی ہے''۔17؎

وزیر آغا نے طنز کو انسان کے درد بھرے دل کی پیداوار بتایا ہے۔ان کے مطابق اس میں ماحول میں پیش آنے والی ناہمواریوں کو اہمیت حاصل ہے۔لہٰذا وہ لکھتے ہیں:

''طنز جو بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حساس اور دردمند انسان کے ذہنی رد عمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختہ مشق بنالیا ہو''۔18؎

سید احتشام حسین کے مطابق طنز میں حقیقت کا بیان کیا جاتا ہے اور حقیقت کا بیان فنی لوازم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔اس میں تشبیہہ اور استعاروں سے مدد لی جاتی ہے۔

''طنز میں حقیقت پیچیدہ ہو کر اندازہ بیان کے لوازم کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔ اس میں تشبیہہ اور استعارے کے پیچ ہوتے ہیں۔تمثیلوں کی طرف اشارے ہوتے ہیں اور علامات وتلمیحات کے پردے،طنز میں وار کبھی سیدھا نہیں ہوتا۔اور اگر سیدھا ہوتو ہلکی سی خراش ڈال کر گزر جاتا ہے''۔19؎

طارق سعید کے نزدیک طنز انسان کو زندگی میں اچھے کام کرنے کے طرف راغب کرتا ہے اور اس کو دنیا کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہونے کی سیکھ دیتا ہے،لہٰذا وہ لکھتے ہیں:

''طنز انسانی زندگی میں بہت اہم کام انجام دیتا ہے، وہ توہم پرستی شخصیت پرستی،ظلم و جبر،تشدد بے ایمانی اور مختلف نوع کے تضادات حیات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔خودغرضیوں کو چیلنج کرتا ہے اور اسے پوری دنیا کی نظر میں قابل نفریں اور مضحکہ خیز بھی بنادیتا ہے۔ ادھر دوسری طرف تضادات حیات کے شکار عام لوگوں کی طنز ایک نوع سے اخلاقی قوت نیز سامان تسکین پہنچاتا ہے، عام آدمی محسوس کرتا ہے کہ کوئی ہے جو اس کی تکلیفوں اور کراہوں کو انگیز کر رہا ہے اور انہیں سمجھا رہا ہے کہ دیکھو! میں ظالم ومتکبر کو نشانہ طنز بنا رہا ہوں''۔20؎

بعض مغربی ناقدین نے طنز کی تعریفیں پیش کی ہیں۔سید نصیر الدین احمد نے مغربی ناقدین کے حوالے سے طنز کی تعریفیں پیش کی ہیں وہ رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر جانسن کے نزدیک طنز کی حماقت یا برائی کو ختم کرنے یا یاد کرنے کا نام

ہے سوئفٹ کے نزدیک ''طنز ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سوائے اپنے سب کی کمزوریاں دیکھی جاسکتی ہیں''۔ سوئفٹ نے ایک دوسری جگہ ''طنز کو ایک ایسی اخلاقی پولیس کہا ہے جو برائی کے سامنے بے بس ہے۔ لیکن اچھائی کی مددگار ہے'' رجسٹرئن کا کہنا ہے کہ ایک سور کو اس سے بھی زیادہ مکروہ شکل میں پیش کرتا جیسا کہ خود خدا نے اس کو بنایا ہے''۔ آرتھر کوسٹلر کے مطابق 'طنز جانی بوجھی چیزوں کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرنے کا نام ہے''۔ 21ے

آرتھر کوسٹلر Arthur Kosetler نے طنز کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''ہمارے اذہان زندگی کی بیزار کن یکسانیت اور بے رنگ تکرار سے اس قدر بے حس ہو چکے ہیں اور ہم زندگی کے ناسوروں کو دیکھ دیکھ کر ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک طنز نگار انہیں مبالغہ آمیز انداز سے پیش نہ کرے ہماری نگاہیں ان پر جمنے ہی نہیں پاتیں''۔ 22ے

ڈاکٹر محمد طاہر نے طنز کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے جو اصول بتائے ہیں ان میں طنز کے لئے انداز بیان میں ادبیت ہونا ضروری ہے اور طنز کے بیان کرنے میں تمثیل کا سہارا لینا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ وہ طنز نگار کے لیے ہمدردی کے جذبے کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ا۔ انداز بیان میں ادبیت اور اسلوب میں بداعت ہو۔ طنز اگر سپاٹ ہے تو وہ ادب سے خالی ہے۔

۲۔ بلند پایہ طنز کے لئے لازم ہے کہ کسی پردے یا تمثیل کے پیرائے میں ہو۔

۳۔ طنز نگار میں ہمدردی کا جذبہ ہونا چاہئے جس کے بغیر طنز مخالفت وعناد کے مترادف ہوگا۔

۴۔طنز میں زہرنا کی اور ظرافت دونوں کی گنجائش ہے''۔23؎

مندرجہ بالا تمام خصوصیات ایک کامیاب طنز نگار میں ہونا ضروری ہے۔اور خواجہ عبدالغفور نے طنز نگار کے بارے میں کہا ہیکہ طنز نگار ایک سرجن ہے کیوں کہ وہ سماج میں موجود زخموں کو ڈھونڈ کر ان کا علاج کرتا ہے اور طنز نگار ایک بے درد انسان ہوتا ہے۔اس لئے طنز کرتے وقت وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا انہوں نے رشید احمد صدیقی اور کرشن چند اور فکر تونسوی کو طنز نگار رکہا ہے چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

''طنز نگار ایک سرجن ہوتا ہے۔جراح ہوتا ہے،احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے، کچھ نہ کہہ کر سب کچھ کہنے کے فن میں ماہر ہوتا ہے۔بد دماغ ہوتا ہے، بے درد ہوتا ہے، بے لحاظ ہوتا ہے، رشید احمد صدیقی ہوتا ہے، کرشن چندر ہوتا ہے، فکر تونسوی ہوتا ہے''۔24؎

مندرجہ بالا ناقدین کے آراء کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ طنز عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی رمز کے ساتھ بات کرنے کے ہیں، طنز کو انگریزی میں Satire کہتے ہیں ۔ Satire لاطینی زبان کا لفظ ہے۔اس کو سب سے پہلے یونانیوں نے استعمال کیا ہے۔اصطلاحی معنوں میں طنز سے مراد معاشرے کی برائیوں کمزوریوں اور ناہموار صورت حال پر غم وغصہ کے اظہار کا نام طنز ہے، کیونکہ طنز نگار کا مقصد اصلاح ہے،اس لئے وہ زندگی کی ناہمواریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اور ان کو قاری تک پہنچاتا ہے۔دراصل طنز نگار جس شخص کا مذاق اڑاتا ہے۔اس کے پیچھے اس کا اصلاح کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔

مزاح عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے لغوی معنی خوش طبعی ہنسنا وغیرہ کے ہیں۔جامع فیروز الغات میں مزاح کے معنی یوں درج ہیں:

''خوش طبعی، مذاق،ہنسی،خوش طبعی کرنا''۔25؎

اعجاز الغات میں مزاح کے معنی ان الفاظ میں شامل ہیں:

''ظرافت، دلّگی''۔ 26ؔ

رابعہ اردو لغت میں مزاح کے معنی اس طرح سے پیش کئے گئے ہیں:

''ہنسی، ٹھٹھا، ظرافت، خوش طبعی، مذاق، چہل''۔ 27ؔ

علمی اردو لغت میں مزاح کے معنی اس طرح سے شامل ہیں:

''خوشی طبعی، مذاق، ہنسی''۔ 28ؔ

فرہنگ عامرہ میں مزاح کے معنی یوں بیان کئے گئے ہیں:

''خوش طبعی، زائل کیا ہوا، خوش طبعی کرنا'' 29ؔ

لغات کشوری میں مزاح کے معنی ان الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں:

''خوش طبعی کرنا، آپسی دلگی کرنا''۔ 30ؔ

مزاح کو انگریزی میں Humour کہتے ہیں اور اس کے معنی Fallon English Urdu ڈکشنری میں اس طرح سے رقمطراز ہیں:

''ناز برداری کرنا، خاطر کرنا'' 31ؔ

Humour کے معنی The Standard English Urdu ڈکشنری میں اس طرح سے درج ہیں:

''قلبی یا دماغی کیفیت، ظرافت، مذاق، خوش طبعی، ذوق، ظرافت، مضحک پہلو، مدح، رجحان''۔ 32ؔ

Standard 21st cnetury Urdu to English ڈکشنری میں مزاح کے معنی یہ ہیں:

"Humour" 33ؔ

ہندی زبان میں مزاح کو پری پاس کہتے ہیں۔ اور مزاح کے معنی اردو ہندی ڈکشنری میں اس

طرح سے درج ہیں:

''پری پاس، وینود، ہاسیہ، دل لگی'' 34

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے شائع کردہ ڈکشنری میں مزاح Humour کے لغوی معنی یوں لکھے ہیں۔

''خلط، قلمی یا دماغی کیفیت، موج لہر، کیل، رغبت، رجحان، ظرافت، مذاق، خوش طبعی، ذوق ظرافت، احساس ظرافت مضحک حالات، مضحک پہلو''۔

Urdu English Dictionary N.C.P.U.L.، ص:537

آکسفورڈ ڈکشنری میں ہیومر Humour کے معنی اس طرح سے درج ہیں:

''مزاح شگفتگی، (wit) کی نسبت عامیانہ سے زیادہ ہمدردانہ، ادب، تقریر وغیرہ میں ظرافت کا رنگ''۔ 35

مزاح کو انگریزی میں Humour کہتے ہیں۔ لفظ ہیومر ایک یوروپی زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کے معنی رطوبت کے ہیں۔ اس لفظ کے ماخذ کے تعلق سے لیں۔ جے صادق رقمطراز ہیں:

''لفظ Humour یورپی زبانوں سے لیا گیا ہے اور اس کا ماخذ انوکھا ہے۔ Word of peculiar Etyumlogy اس کا اصل یا (Origine) کے معنی رطوبت یا بھیگے پن، گیلے پن کے ہیں، علم طب کے ابتدائی زمانے میں (Hippua crates) (۴۰۰ ق۔م) نے فیصلہ دیا تھا کہ انسانی جسم میں چار خلط یا Humour جاری و ساری رہتے ہیں۔ جیسے بلغم، دُم، صفرا، سودا، Blacbile انسانی جسم میں چاروں خلطوں کی مقدار یکساں یا نارمل ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ شخص تندرست ہے، لیکن ان خلطوں میں فرق آتے ہی اس شخص کی صحت پر شک کیا جاسکتا ہے یعنی یہ بیماری کی علامت تھی۔ بعد میں چل کر علوم طبیہ کے زوال کے باعث اس خاص لفظ کو خراب حالت اور اچھی حالت کو

ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا''۔36؎

ان تمام لغات کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مزاح عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہنسی، خوش طبعی، دل لگی، ظرافت، ٹھٹھا وغیرہ کے ہیں۔ مزاح کو انگریزی زبان میں Humour کہتے ہیں۔ لفظ Humour لاطینی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی رطوبت کے ہیں، سید مصباح الحسن قیصر کا کہنا ہے کہ Humour کو شروع میں طب کے اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جس کے معنی انسان کے جسم میں بہنے والے ایک رقیق مادے کے تھے۔ جو خون، بلغم، سودا، صفرا، کی طرح تندرست انسان کے جسم کا ضروری جزو تھا۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ لفظ Humour طب کی اصطلاح سے دور ہوتا گیا اور اس کے بعد مزاح کے اصطلاح کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ انگریزی مصنف شیکسپیر کے یہاں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے بعد تھوڑی بہت تبدیلیوں سے اٹھارویں صدی میں یہ لفظ عجیب وغریب، اتفاقی اور مہمل بات یا چیز کے لئے استعمال میں لایا گیا۔ اور اب بھی یہی Humour کے لئے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

ایس۔ جے صادق کے مطابق ہیومر کا لفظ یوروپی زبانوں سے ماخوذ ہے اس کے برخلاف خواجہ عبدالغفور نے ہیومر کو لاطینی زبان کا ماخذ قرار دیا ہے۔ اسکی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ لاطینی زبان یورپ کی زبانوں سے ایک علیحدہ زبان ہے۔ لہٰذا وہ لکھتے ہیں:

> ''ہیومر ایک لاطینی لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی رطوبت، رطوبت اور حرارت عزیزی کی ہم آہنگی انسان کے مزاج کو شگفتگی بخشی ہے اور کبیدگی کو دور کرتی ہے''۔37؎

انگریزی لفظ Humour کے لیے اردو میں ظرافت کا لفظ موزوں مانا جاتا ہے۔ لیکن اردو میں یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ہجو، پھبتی، ہزل، پھکڑ پن، تمسخر، لطیفہ، فقرہ بازی، وغیرہ کے استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایسی کوئی بھی بات جس کے ذریعہ ہنسی پیدا ہو اس کو ظرافت

کے زمرے میں لایا جاتا ہے۔

عام طور پر مزاح اس بات کو کہتے ہیں جسے سن کر ہنسی آتی ہے۔ جیسا کہ کوئی لطیفہ سن کر ہنسی پیدا ہو جاتی ہے تو کسی شخص کے چال چلن اور وضع قطع سے بھی ہنسی آتی ہے، اس کی ایک اچھی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص چلتے چلتے گیلے فرش کی وجہ سے اچانک گر جاتا ہے تو اس شخص پر ہمدردی کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مختلف ناقدین نے مختلف انداز میں مزاح اور ہنسی کی تعریفیں پیش کی ہیں' ڈاکٹر وزیر آغا نے ہنسی آنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں اگر کوئی بھی اپنے عام زندگی سے ہٹ کر کوئی بھی کام کرتا ہے تو ہنسی آتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''دراصل ہنسی اس فرد کا مذاق اڑاتی ہے جو سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ذرا سا بھی بھٹکے اور اس غرض سے اڑاتی ہے کہ وہ پھر سے اس لکیر میں شامل ہو جائے چنانچہ یہ بات ہنسنے والوں کے لئے باعث انبساط ہوتی ہے، لیکن اس فرد کو رنج و ندامت سے ضرور ہم کنار کر دیتی ہے جس کے خلاف یہ عمل میں آئے''۔ 38

ڈاکٹر سنبل نگار نے ایک عربی مقولے کے حوالے سے بتایا ہے کہ انسان ایک ہنسنے والا جاندار ہے کیوں ہنسی انسان کو اللہ کی طرف سے عطا کی ہوئی سب سے بڑی نعمت ہے، یہ خوش قسمتی کسی اور مخلوق کو نصیب نہیں ہے، ہنسی اپنی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ دوسروں میں شامل کمزوریوں اور کوتاہیوں کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ایک عربی مقولے کے مطابق انسان ایک ہنسنے والا جاندار ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ہنسنے کی صلاحیت بھی ایسی ہی ایک نعمت ہے، ہنسی احساس برتری کا نتیجہ ہے، یہ دوسروں کی کمزوریوں یا اپنی پچھلی کوتاہیوں کے سبب وجود میں آتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ کمزوریاں یا کوتاہیاں درد انگیز نہ ہوں۔ مطلب یہ کہ اس خامی کا کوئی تکلیف دہ نتیجہ برآمد نہ ہوا ہو۔ مثلاً کوئی پھسل کر گر پڑے، ہم ہنس دیتے ہیں، لیکن کوئی پھسل کر گرے اور دم توڑ دے

تو ہنسی کی جگہ رنج لے لیتا ہے''۔39

کسی بھی بات پر ہنسنا اچھی بات نہیں کیوں کہ اگر کوئی ایسا کرتے ہیں تو انہیں پاگل کہتے ہیں، ہنسنے کے لئے انسان کے دماغ میں عقل کا ہونا ضروری ہے کیونکہ عقل کے ذریعے ہی سے انسان سمجھ سکتا ہے اور اپنے کام کو انجام دے سکتا ہے مگر یہ بات جانوروں میں نہیں، چنانچہ انور صدیقی نے انسان اور حیوانی فطرت کے اس پہلو کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہنسنے کے لئے عقل کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک آدمی کے لئے چھلکے سے پھسل کر گر پڑے تو دوسرے اس پر ہنستے ہیں۔ لیکن ایک بھینس کیلے کے چھلکے سے پھسل کر کیچڑ میں گر پڑے تو باقی بھینس اس پر کبھی نہیں ہنسیں گی کیونکہ بھینس کے پاس عقل نہیں ہوتی''۔40

حکیم الدین احمد کا شمار اردو کے اہم نقادوں میں شامل ہے۔ انہوں نے ہنسی کے بارے وضاحت کی کہ ہنسی کسی نامکمل اور ناموزوں چیزوں کے وجود سے پیدا ہوتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں پر ہر چیز مکمل، موزوں و متناسب ہو وہاں ہنسی کا گزر نہیں ہوسکتا۔ ہنسی تو عموماً عدم تکمیل، بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے جسے اس کا احساس نہیں ہے یعنی جسے ہنسی نہیں آتی، اسے ہم انسان میں نہیں شمار کریں گے''۔41

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کسی بھی عام بات پر ہنسی نہیں آتی ہے بلکہ نامکمل اور بے ڈھنگے پن سے کئے گئے کام پر ہنسی آتی ہے اور ہنسی آنا ایک فطری عمل ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر طیبہ خاتون نے بھی ہنسی کی تعریف میں یہی بات کہی ہے وہ لکھتی ہیں:

''ہنسی انسانی جبلت اور اس کی تحریک حیات و کائنات میں ناہموریوں کے احساس، بے ڈھنگے پن اور عدم تکمیل سے ہوتی ہے''۔42

ہنسی ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو دیگر مخلوقات سے الگ کرتی ہے۔ کیوں کہ ہنسنا اور رونا انسانی فطرت میں شامل ہے۔ انسان اپنی خوشی کا اظہار ہنسی کے ذریعے سے کرتا ہے جب کہ اپنے دکھ کو

روکر اظہار کرتا ہے مگر کچھ جانور جیسے کتے وغیرہ روتے ضرور ہیں، مگر ہنسی ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس طرح ہنسی انسان کی سب سے بڑی نعمت ہے جو اس کو تندرستی بھی عطا فرماتی ہے۔ انسان چاہے کسی بھی ملک میں رہے اور کسی بھی زبان میں بات کرے مگر ہنسی سب کے لئے ایک جیسی ہوتی ہے۔ اور انساں کے لئے ہنسی ایک دولت ہے اور یہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ ہے۔ اسی بات کا اظہار کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک حقیقت ہے کہ ہنسی ہی دنیا کے سارے انسانوں کی بنیادی مادری زبان ہے۔ انسان چاہے اردو بولے یا انگریزی، فرانسیسی بولے یا اطالوی مگر جب وہ ہنستا ہے تو متفقہ طور پر ایک ہی لہجہ اور ایک ہی انداز سے ہنستا ہے۔ البتہ ہنسنے کی مقدار، وجوہات، موضوعات اور ضروریات مختلف ہوسکتی ہیں۔ لیکن وہ ہنستا تو ایک ہی طرح ہے۔ ساری کائنات میں انسان ہی ایک ایسا سماجی جانور ہے جسے قدرت نے ہنسی کی دولت عطا کی ہے''۔43؎

ارسطو نے ہنسی کے وجود میں آنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ہنسی کسی فرد کی بدصورتی کو دیکھ کر آتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہنسی کسی کی کمی یا بدصورتی کو دیکھ کر معرض وجود میں آتی ہے، جو دردانگیز نہ ہو''۔44؎

ڈاکٹر وزیر آغا نے مزاح کے بارے میں کہا ہے کہ مزاح زندگی اور ماحول کے میل جول سے پیدا ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''مزاح زندگی اور ماحول سے انس اور مفاہمت کی پیداوار ہے''۔45؎

خواجہ عبدالغفور کے مطابق مزاح صرف کسی کی عیب جوئی پر ہی نہیں بلکہ حسیات کے وجہ سے بھی وجود میں آتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''مزاح صرف جملے کس دینے یا کسی کی عیب جوئی پر ہی منحصر نہیں بلکہ حسیات

اور شعور کے سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب کر موتی نکالنا، ہم آہنگی اور تضاد میں امتیاز کرنا، نامعقولیت کو رد کرنا اور اپنی منطق کو ایسے دل پذیر انداز میں پیش کرنا کہ سامعین قائل ہو جائیں، یہ سب مزاح کے اصناف ہیں''،46

اسٹیفن لیکاک نے مزاح کی تعریف یوں پیش کی ہے:

''مزاح کیا ہے یہ زندگی کی اس ناہمواری اور شعور کا نام ہے جن کا فن کارانہ اظہار ہو جائے''۔47

مزاح کی تعریف کرتے ہوئے میر جعفر علی خاں لکھتے ہیں کہ مزاح سے ہنسی کا آنا ضروری نہیں ہے مگر مزاح سے لبوں پر مسکراہٹ ضرور آنا چاہئے۔لہٰذا وہ فرماتے ہیں:

''زندہ دلی یا بذلہ سنجی کسی بات کے مضحک اور دلچسپ پہلو کو احساس اور اس انداز سے بیان کرنا ہے کہ ہنسنے والے کو بے اختیار ہنسی نہ آجائے تو ہونٹوں پر تبسم کی ایک لہر ضرور دوڑ جاتی ہے''۔48

مزاح ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے سے نہ صرف ماحول میں موجود افراتفری کو دور کر سکتے ہیں بلکہ انسان کی پریشانیوں مسائل کا حل بھی نکال سکتے ہیں چنانچہ ہالٹس لکھتے ہیں:

''مزاح ہمارے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار ہے جس کو ہم نہ صرف انسانی معاشرہ میں منتشر طاقتوں کے خلاف بلکہ فرد کے ذہن کے ان گوشوں کے خلاف بھی جو احساس شکست اور پریشانی حالی آماجگاہ ہوئے ہیں، آزما سکتے ہیں''۔49

مزاح کو ظرافت کی اصطلاح میں بھی استعمال کرتے ہیں سید عابد حسین نے ظرافت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ مذاق جو ہنسی کی طرف جھکنے کی جائے بلندی کی طرف ابھارتا ہے۔جس میں نفاست، ندرت، ستھرا پن پایا جاتا ہے، اسے ظرافت کہتے ہیں''۔50

ڈاکٹر سنبل نگار نے ظرافت سے متعلق کہتے ہیں کہ ہنسی زندگی کے لئے ضروری ہے مگر ہنسی نہ

ہوتو زندگی بے مزہ سی لگتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"غرض یہ کہ ہنسنا ہنسانا انسان کی فطرت ہے۔ ہنسی کے ذریعے خوشی پھیلتی ہے۔ اس لیے اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور ہنسانے کے نت نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ ادب کے ذریعے ہنسانے کا فن ظرافت کہلایا"۔51

قاضی انیس الحق نے مزاح کی تعریف پیش کرتے ہوئے یہی بتایا کہ مزاح اپنے اندر ایک الگ قسم کی کشش رکھتی ہے اور مزاح ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے ذریعے کسی بھی فرد میں موجود کمزوریوں کو مزاحیہ پیرائے میں بیان کر سکتے ہیں۔ اس طرح کرنے سے وہ شخص برا ماننے کی بجائے خود اپنی کمزوریوں کو پہچان سکتا ہے اور ان کو دور کرنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"مزاح میں ایک خاص قسم کی کشش ہوتی ہے جس سے آدمی لطف اندوز ہوتا ہے۔ اگر اس وقت کسی کو اس کی کمزوری کو ظاہر کرنا مقصود ہو تو وہ بے خوف وخطر مزاح کے پیرائے میں بیان کر سکتا ہے، جس سے سُننے والا برا ماننے کے بجائے اپنی کمزوریوں کی طرف نظر ڈالتا ہے اور دور کرنے کی کوشش کرتا ہے"۔52

مزاح کے بارے میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

"مزاح زندگی کے غیر متناسب اور بے جوڑ مظاہرے کو نمایاں کرنے سے پیدا ہوتا ہے"۔53

ایک اور جگہ پر مزاح کے وجود میں آنے والے وجوہات بیان کرتے ہوئے اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں کہ مزاح نہ صرف الفاظ کے الٹ پھیر اور بے ترتیبی کی وجہ سے وجود میں آتا ہے بلکہ خیالات کے تکرار اور ان کی تیر آہنگی سے بھی وجود میں آتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"بعض دفعہ مزاح صرف الفاظ کے ذریعہ پیدا کیا جاتا ہے، یعنی الفاظ کی ترتیب کچھ اس طور پر کی جاتی ہے کہ وہ ہمیں خواہ مخواہ ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس وہ مزاح ہے جو خیالات کے تضاد اور ان کی غیر آہنگی سے وجود

میں لایا جاتا ہے‘‘۔54

مزاح کا مقصد صرف کسی کی عیب جوئی کرنا یا نیچا دکھانا نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے سماج میں موجود خامیوں کی ہمدردانہ انداز سے اصلاح کرنا بھی ہے، لہٰذا ڈاکٹر وزیر آغا مزاح کے اسی مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’زندگی کی سنجیدگی سے انسان کو بچانے اور اسے شکست خواب سے پیدا ہونے والے ناقابل برداشت صدموں کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے کے علاوہ احساس مزاح کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا وجود سوسائٹی کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے‘‘۔55

کانٹ نے مزاح Humour کی تعریف یوں کی ہے:

An Aefection arising from the sudden’’ transformation of strained etpectation in to nothing’’. 56

ڈاکٹر محمد طاہر نے مزاح نگار کے کے لئے یہ ضروری خیال کیا کہ مزاح نگار کو زندگی کے ہر پہلو کو مثبت نظر سے دکھانا چاہیئے اور اس کا مقصد صرف قاری کو ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور کرنا نہیں بلکہ مزاح کے ذریعے قاری کو سوچنے پر مجبور کرنا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

’’مزاح نگار انگریزی کی درج ذیل کہاوت کو اپنا مسلک مانتے ہیں کہ Life is so funny laugh at it مزاح نگار اپنے قاری کو بحرِ انبساط میں غوطے لگواتا ہے تاکہ اسے افسردگی، اضمحلال اور انقباضی کیفیت سے نجات دلوا کر سرور، سرشاری اور فرحت کے احساس سے مغلوب کر سکے۔ مزاح نگار کے مسلک میں مایوسی اور قنوطیت کفر کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ زندگی کو مثبت نظریئے سے دیکھتا ہے اور مایوسی و محرومی کے احساس سے بے نیاز ہر حال میں خوش رہنے اور خوش رکھنے کو اپنا مقصد قرار دیتا ہے وہ زندگی کی صعوبتوں سے نہ تو گھبراتا ہے اور

نہ راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ وہ تمام مسائل و آرام کا خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہے کیونکہ مزاح نگار کا ایقان ہوتا ہے کہ حزن و ملال اور آہ و بکا سے نہ مسائل کم ہو سکتے ہیں اور نہ ان کا صد باب کیا جا سکتا ہے، وہ قسمت کے لکھے کا قائل ہوتا ہے۔ اسی لئے مقدرات سے ٹکرانے کے بجائے خلوص دل سے ان کا استقبال کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ جو کچھ قسمت کی لکیروں میں ہے ان کا ہونا از بس ضروری ہے تاہم وہ احساس بے بسی میں مبتلا نہیں ہوتا اور قدرت کے جبر و استبداد کے آگے خندہ پیشانی اور مسکراہٹ کی لہر لے کر نبرد آزما ہوتا ہے''۔57

ناقدین کی مندرجہ بالا تعریفوں سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے مزاح عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی خوش طبعی کے ہیں۔ اس کو انگریزی میں Humour کہتے ہیں۔ ہیومر ایک لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ ہیومر کے معنی رطوبت کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں مزاح سے مراد وہ صنف ہے جس میں کوئی ہنسی کی بات کی گئی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اصلاح کا جذبہ بھی اس میں موجود ہو اور اس میں زندگی کی حقیقتوں کا بیان دلکش انداز میں کیا جاتا ہو مزاح کے ذریعہ سے نہ صرف کسی کی عیب جوئی کی جاتی ہے بلکہ سماج میں موجود خامیوں کو ہمدردانہ انداز سے اصلاح بھی کی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مزاح نہ صرف ہنسنا سیکھاتا ہے بلکہ اس کے ذریعے معاشرہ کی اصلاح کی جاتی ہے۔

طنز و مزاح ایک مشکل فن ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے سماجی اصلاح کا کام کیا جاتا ہے اور اس فن کے برتنے میں مہارت ہونا ضروری ہے۔ طنز و مزاح دونوں ایک ساتھ لکھا اور بولا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں میں فرق موجود ہے۔ طنز اور مزاح میں جو فرق ہے وہ اس طرح ہے۔ طنز ایک عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی رمز کے ساتھ بات کرنا ہے۔ جبکہ مزاح بھی ایک عربی لفظ ہے۔ لیکن اس کے لغوی معنی خوش طبعی کے ہیں ۔ مزاح کو انگریزی میں Humour کہا جاتا ہے جبکہ طنز کو Satire کہا جاتا ہے۔

طنز ومزاح دو مختلف چیزیں ہیں، کیونکہ دونوں کا مقصد الگ ہے اور دونوں کے کام بھی مختلف ہیں۔طنز میں زہرنا کی اور نشتریت ہے جبکہ مزاح زخم پر مرہم لگانے کا کام کرتا ہے۔ایک خاص فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ مزاح سے ہنسی پیدا ہوتی ہے اور طنز رونے کے لئے اوکساتا ہے چنانچہ طنز ومزاح کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد انصاری لکھتے ہیں:

''طنز ومزاح دو مختلف چیزیں ہیں۔طنز میں زہرنا کی ہوتی ہے۔اس میں نشتریت کا عنصر غالب رہتا ہے۔جب کہ مزاح ملائمت کا احساس دلاتا ہے اور زخم پر فوراً مرہم لگا دیتا ہے۔طنز ومزاح آپس میں مل کر ایک خوشگوار اور معتدل فضا تیار کرتے ہیں جس میں بالواسطہ اصلاح کا کام بھی لیا جاتا ہے اور سماجی حالات بھی متاثر ہوتے ہیں۔طنز میں مزاح کے عناصر موجود ہوتے ہیں لیکن مزاح سے جدا رکھتے ہیں۔ان کے نزدیک طنز طنز ہے اور مزاح مزاح۔خالص طنز ہمیں رُلانے پر اُکساتا ہے اور خالص مزاح قہقہہ لگانے کی فضاء تیار کرتا ہے''۔58

طنز ومزاح کے درمیان میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے بڑی انوکھی مثال دی ہے لکھتے ہیں:

''یوں بنیادی طور پر طنز میں بھی مزاح کا عنصر شامل ہے۔لیکن ان دونوں میں ایک باریک سا فرق بھی ہے۔جو بقول رونالڈ کاکس''مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے۔لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے''۔59

معاشرے میں پیش آنے والے حالات سے بے اطمینانی کی صورت طنز وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس کے برخلاف مزاح خوش حال معاشرہ کی دین ہے چنانچہ طنز ومزاح کے اس فرق کے طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد طاہر لکھتے ہیں:

''طنز اپنے معاشرے اور ماحول سے بے اطمینانی کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔طنز نگار اپنی ناپسندیدہ اشیا کی تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔لیکن وہ اپنی نفرت

یا ناپسندیدگی کا اظہار براہ راست نہیں کرتا بلکہ اس کی زبان سے ایسے جملے ادا ہوتے ہیں جو تلخی کے باوجود لطافت کی چاشنی لئے ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے مزاح نگار اپنے گردوپیش کے ماحول سے مطمئن و سرور ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی خوش و خرم زندگی بسر کرنے کی تلقین و تبلیغ کرتا ہے۔ مزاح زیادہ خوش حال اور صحت مند معاشرے کا غماز ہوتا ہے''۔ 60؎

خواجہ عبدالغفور نے طنز و مزاح کے درمیانی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مزاح ایک ایسی چیز ہے جس میں کسی پر چوٹ نہیں کی جاتی ہے اس کے برخلاف طنز اپنے اندر چبھتے معنی رکھتا ہے۔ انھوں نے طنز کو تنقید کہا ہے ان کے مطابق اس میں تنقید کے مقابلے میں گہرائی زیادہ ہے لیکن اس کے اسلوب کا بیان ناقدانہ ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''بالعموم ظرافت اور طنز ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور دونوں میں امتیاز نہیں برتا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں ہی مختلف ہیں۔ ظرافت کھلا مزاح ہے، جس میں کسی پر چوٹ نہیں۔ طنز تیز چبھتے ہوئے اور چھپے ہوئے معنی رکھتا ہے۔ لیکن کثیف اور ثقیل نہیں ہوتا اور اس میں ہجو کی طرح زہر بھرا نہیں ہوتا، یہ تنقید سے کچھ زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں قدرے بے اعتدالی ہوتی ہے۔ اسلوب بیان ناقدانہ لیکن اندرونی طور پر ہلکا سا لعن طعن اور گفتگو فقرے بازی کی چبھن ہے۔ بھرپور ایک حد تک سرزنش اور سزا دینے کا پہلو بھی شریک رہتا ہے لیکن وہ بھی ڈھکا چھپا''۔ 61؎

طنز ایک طرح کا نازک فن ہے کیوں کہ اگر اس کے بیان میں تھوڑی سی تیزی ہو تو یہ سینے میں اتر جاتا ہے جب کہ تھوڑا سا کند ہو تو گالی بن جاتا ہے۔ مگر مزاح اس میں موجود حقیقت کو دریافت کر کے اس کو خوش ذائقہ اور صاف و شفاف بنا دیتا ہے، چنانچہ سید عابد حسین لکھتے ہیں:

''طنز ایک نہایت نازک تاثر ہے، جو اگر تیز ہوا تو سینے میں اتر جاتا ہے اور اگر

کند ہوا تو گالی بن جاتا ہے۔ مزاح اس کی تہہ بندی کر کے اسے گوارا اور لطیف
بناتا ہے۔ طنز و مزاح دونوں ندرت چاہتے ہیں جتنے نئے نئے زاویوں سے وار کیا
جائے اتنا ہی طنز میں تیکھا پن پیدا ہوتا ہے اور تخیل اس میں جتنی لطیف بوالعجبیاں
پیدا کرے اتنا ہی مزاح لطف انگیز ہوتا ہے۔'' 62

طنز و مزاح نگاری کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ ان دونوں کے مدارج الگ الگ ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں مزاح نگار کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ناہمواریوں سے محفوظ ہوتا ہے وہاں
طنز نگار ان ناہمواریوں سے نفرت کرتا ہے۔ اور انہیں خندہ استہزا میں اڑا دینے
کی طرف ہر دم مائل رہتا ہے۔ البتہ طنز کے کئی ایک مدارج ضرور ہیں، چنانچہ کبھی
تو یہ محض ایک فرد کو نشانہ تمسخر بناتی ہے اور کبھی ان ارتقائی منازل پر پہنچ جاتی ہے
جہاں یہ انسان اور سماج کی مستقل حماقتوں اور عالمگیر ناہمواریوں کو طشت از بام
کرتی اور انسان کو انسانیت سے قریب تر لانے میں مدد دیتی ہے''۔ 63

طنز و مزاح ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ مزاح میں موجود مٹھاس کی وجہ سے طنز کا تیکھا وار بھی میٹھا لگنے لگتا ہے اسی لئے سید نصیرالدین نے طنز و مزاح کے اس فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ بغیر مزاح کے طنز جس طرح گالی بن جاتا ہے اسی طرح بغیر طنز کے مزاح خالی بن جاتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''میرا اپنا خیال ہے کہ طنز دہ کونین ہے جو مزاح کی شکر میں لپیٹ کر دی جاتی
ہے، کھانے والا شکر کے شوق میں اور اس کی مٹھاس میں یعنی مزاح کے شوق میں
طنز کی کونین بڑے شوق سے نگل جاتا ہے۔ اس طرح سے طنز زیادہ کارگر بن جاتا
ہے۔ اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ بغیر مزاح کے طنز گالی بن جاتی ہے۔ اسی طرح
طنز کے بارے میں میرا خیال ہے کہ بغیر طنز کے مزاح ''خالی'' بن جاتا ہے۔ وہ

مزاح جو خالی ہے، ظاہر ہے کہ کھوکھلا ہے۔ بے اثر ہے بے کار ہے۔ اس لیے
اس مزاح کو مزاح نہیں صرف مسخرگی کہنا زیادہ بہتر ہے''۔64

طنز اور مزاح کے درمیان موجود فرق پر بہت سے دانشوروں نے روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سنبل نگار کے مطابق مزاح کسی کی خامی پر ہنسنے کا نام ہے اور طنز میں بڑی شدت ہوتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''مزاح کسی خامی، کسی بدصورتی، کسی بے تکے پن پر خوش دلی سے ہنسنے کا نام ہے، اس میں غم، غصہ، تلخی، کا گزر نہیں۔ حصول مسرت کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہیں۔ اس کے برعکس طنز با مقصد ہوتا ہے اور اصلاح اس کا مدعا ہوتا ہے۔ طنز نگار کسی بدی کو اور زیادہ برا بنا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ لوگ اس بدی سے نفرت کرنے لگیں اور اسے مٹانے کے درپے ہو جائیں۔ اس لیے یہاں بہت شدت ہوتی ہے''۔65

مزاح کا اہم مقصد ہنسی ہے، اس کے علاوہ وہ اپنے اندر ہمدردی کے جذبات بھی رکھتا ہے، لیکن طنز تنقید ہے، اس میں صرف تلخی اور بے دردی ہوتی ہے۔ چنانچہ قاضی انیس الحق نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مزاح کا تعلق ہنسی سے ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ہمدردی کے جذبات پنہاں رکھتا ہے، لیکن طنز ایک طرح کی تنقید ہے جو شدت، تلخی اور بے دردی پر مبنی ہے۔ اس میں صرف برے اور بھدے پہلوؤں کو اس درجہ نمایاں کیا جاتا ہے کہ ان کی برائی اور بھدا پن پڑھنے والے کو متاثر کرتے ہیں''۔66

ڈاکٹر خالد محمد طنز اور مزاح میں رویے اور مقصد کے فرق کو قصیدہ اور مرثیہ کے درمیان فرق کی طرح بتایا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

'' طنز و مزاح میں ذہنی رویے اور مقصد کا فرق اگرچہ قصیدہ اور مرثیہ کا سا ہی

فرق ہے، لیکن اس کے باوجود اردو میں جابجا دونوں کا اتحاد نظر آتا ہے اور خالص

طنز اور خالص مزاح کے نمونے کم ملتے ہیں۔ اردو میں طنز میں مزاح کی آمیزش

اور مزاح میں طنز کی ملاوٹ کا رواج عام ہے"۔67؎

اسلوب احمد انصاری طنز و مزاح کے فرق کے طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مزاح زندگی کے غیر متناسب مظاہر کو نمایاں کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور

طنز (IRONY) کی ہلکی ہلکی آمیزش اسے جاندار، تابناک اور دیر پا بنا دیتی

ہے"۔68؎

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں طنز کے تیکھے وار سے تلخی اور درد کا احساس ہوتا ہے وہیں مزاح کی مٹھاس اور پھلجڑیوں سے زندگی میں مسرت کا احساس ہوتا ہے اس لئے ڈاکٹر وزیر آغا نے طنز و مزاح کے درمیان فرق کی وضاحت کرتے ہوئے دونوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور انسان کے رستے ہوئے زخموں کی

طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتی ہے۔ لیکن دوسری

طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی، پھیکی اور بدمزہ زندگیوں کو سندر کرتا

ہے ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے۔ فی الواقع افادیت کے نقطۂ نظر سے دونوں

ہمارے رفیق اور غم گسار ہیں"۔69؎

خالص مزاح میں مٹھاس موجود ہے۔ اور طنز میں ایک ڈنک چھپا ہوتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ طنز میں مزاح کا ہونا ضروری ہے ایسا نہ ہو تو قاری کو کڑواہٹ کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس طرح طنز اور مزاح دونوں ایک بغیر دوسرے نامکمل ہیں چنانچہ ڈاکٹر سنبل نگار لکھتے ہیں:

"خالص مزاح بے ضرر ہوتا ہے، طنز میں کاٹ ہوتی ہے۔ اس میں ایک

ڈنک چھپا ہوتا ہے جو چبھتا ہے اور تکلیف دیتا ہے، لیکن یاد رکھنے کی بات ہے کہ

جس طرح ہلکی سی ترشی مٹھاس میں تیکھا پن اور لذت پیدا کر دیتی ہے اسی طرح

طنز کی آمیزش سے مزاح میں جان پڑ جاتی ہے۔اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ طنز میں مزاح موجود نہ ہوتو وہ بے مزہ دشنام بن کے رہ جاتا ہے۔مختصر یہ کہ مزاح کہ بغیر طنز کے اور طنز بغیر مزاح کے نامکمل ہے۔بغیر طنز کے خالص مزاح تو خوش گوار ہوسکتا ہے لیکن طنز میں مزاح نہ ہوتو قاری کوکڑواہٹ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا''۔70؎

طنز ومزاح دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ان دونوں کا ایک ساتھ ہونے سے ہی لطف آتا ہے۔اس لئے دونوں الگ الگ معنی رکھتے ہوئے بھی ایکدوسرے سے مربوط اور منسلک ہیں۔ چنانچہ طنز و مزاح کے اس تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

''طنز کی صنف مزاح کی صنف سے وابستہ اور مربوط ہے۔مزاح کا افادی پہلو براہِ راست اسی وقت کارگر ہوتا ہے جب کہ ہم ہنسی کی شادابی اور برجستگی میں تھوڑی سی کڑواہٹ اور ترشی بھی محسوس کریں۔ ہر وہ مزاح نگار جو محض تفنن طبع کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ جس کے شعور وادراک میں ذکاوت اور زودحسی بھی ہے۔ اپنے مزاح کو طنز کے چھینٹوں سے پاک نہیں رکھ سکتا''۔71؎

طنز ومزاح میں جس طرح فرق ہے اسی طرح مماثلت بھی ہے کیوں کہ زندگی میں خوشی اور غم دونوں کی اہمیت ہوتی ہے اسی طرح طنز ومزاح ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہوتے ہیں اس لئے اس کو المیہ اورطربیہ کی طرح مانا جاتا ہے۔جس طرح انسان کا سایہ اسے چھوڑ کر نہیں جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ چلتا ہے اسی طرح طنز ومزاح ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔چنانچہ قاضی انیس الحق ان دونوں کے درمیانی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:

''انسانی زندگی جتنی وسیع ہے۔اس میں رنگینی بھی اتنی ہی زیادہ ہے۔اس رنگینی کے لئے طنز ومزاح کا ہونا ضروری ہے۔اس رنگین محفل میں نہ صرف خوشی

کے نغموں کی اہمیت ہے بلکہ بقول غالب ان کی عدم موجودگی میں نوحہ وغم بھی مزہ دے جاتے ہیں۔ ان ہی دو رجحانات کی ہم آہنگی سے اردو طنز وظرافت کا استعمال ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ گو ان دونوں میں فرق ہے لیکن المیہ اور طربیہ دونوں کے تعلق کی وجہ سے اب طنز ومزاح کو الگ کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ طنز کے تخلیقی عمل ہی میں مزاحیہ عمل کی شگفتگی وتازگی نمایاں ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جس طرح انسان کا سایہ انسان کے ساتھ چلتا ہے۔ اسی طرح طنز وظرافت کا ساتھ ہے''۔ 71

طنز ومزاح میں فرق کے باوجود دونوں کے درمیان جو رشتہ ہے اسی کے پیش نظر ان دونوں کو ساتھ ساتھ رکھا جاتا ہے اور ایک صنف کے طور پر قبول کرلیا گیا ہے دونوں کے اسی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے سید نصیر الدین احمد لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ طنز کے لیے ظرافت اور ظرافت کے لئے طنز ضروری ہے۔ اعلیٰ درجہ کا طنز بغیر مزاح کے اعلیٰ مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا، اس طرح سے اعلیٰ درجہ کی ظرافت کے لیے طنز لازمی اور ناگزیر ہے''۔ 72

مندرجہ بالا تمام اقتباسات کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ طنز ومزاح دونوں مختلف ہیں کیوں کہ طنز ماحول سے بے اطمینانی کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے جب کہ مزاح خوشگوار ماحول کی پیداوار ہے، طنز کا مقصد رونے کے طرف اکسانا ہے جب کہ مزاح کا مقصد ہنسانا ہے۔ مزاح ہنسانے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتا ہے، طنز میں برائی پر طنز کیا جاتا ہے جب کہ مزاح میں برائی کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ طنز میں بدی کو اور برا بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور مزاح میں کسی کی بدصورتی پر ہنسا جاتا ہے۔ طنز ومزاح دونوں کے درمیان فرق کو قصیدہ اور مرثیہ جیسا مانا جاتا ہے۔ دونوں الگ الگ ہونے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزم ہیں کیوں کہ طنز کے بغیر مزاح بے مزہ بن کر رہ جاتا ہے جب مزاح کے بغیر طنز گالی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم

وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ وجاہت علی سندیلوی دونوں کے درمیان اس مضبوط رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طنز ومزاح میں شیر وشکر کا رشتہ ہے اور ایک طرح سے دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔طنز میں اگر مزاح کی آمیزش نہ ہوتو وہ بہت تلخ اور ترش ہوجاتا ہے۔اس طرح مزاح میں اگر طنز کی چاشنی نہ ہوتو وہ پھیکا اور بے مزہ محسوس ہوتا ہے''۔73

طنز ومزاح کے رشتہ کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''طنز وظرافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔اچھی ظرافت میں ایک پوشیدہ طنز ضرور ہوتا ہے''۔74

غرض ان تمام تعریفوں اور مباحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ طنز ومزاح گو کہ علٰحدہ مفہوم رکھتے ہیں۔لیکن دونوں کے درمیان جو رشتہ ہے وہ مربوط واٹوٹ ہے دونوں ایک دوسرے کے بغیر ناکام ہیں اسی لئے طنز ومزاح کو ایک صنف کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے کیوں کہ بغیر طنز کی کاٹ کے مزاح میں دلکشی پیدا نہیں ہوتی اور بغیر مزاح کے طنز کا نشتر بھی بے کار سا لگتا ہے اس لئے دانشوروں نے طنز ومزاح کو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم قرار دیا ہے کیوں کہ دونوں کے مقصد سماج میں پیدا شدہ ناہمواریوں برائیوں اور خامیوں کی اصطلاح ہے فرق صرف اتنا ہے کہ طنز نگار اپنے غصے کا شدت آمیز اور تلخ لہجے میں اظہار کرتا ہے تو مزاح نگار ہنسی مذاق کے پردے میں ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

☆☆☆

(ب) خاکے کا مفہوم اور فن

خاکہ نگاری کا شمار اردو کے ترقی یافتہ اصناف میں سے ہے۔ لفظ خاکہ انگریزی زبان کے لفظ Sketch کا ترجمہ ہے۔ اس کے معنی ابتدائی نقوش کے ہیں۔ خاکے کے معنی مختلف لغات کے ذریعہ سے جائزہ لینا ضروری ہے، فیروزالغات میں خاکے کے معنی یوں درج ہیں:

''خاکہ: وہ نقشہ جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے۔ ڈھانچہ، چربہ''۔75

اعجازالغات میں خاکہ کے معنی اس طرح سے شامل ہیں:

''چربہ، نقشہ، تصویر''۔76

نسیم الغات میں خاکے کے معنی اس طرح سے درج ہیں:

''ڈھانچہ، نقشہ، چربہ، پلان یا مسودہ جو ذہن میں بنایا جائے یا لفظوں میں نوٹ کر لیا جائے، خاکہ اُتارنا، مسودہ کرنا، کچھ نقشہ بنانا، خاکہ اُڑانا، نقل اُڑانا، نقشہ کھینچنا، ڈھنگ اڑانا، طور سیکھنا، خاکہ کھینچنا، نشان ڈالنا کسی کی تصویر لفظوں میں ادا کرنا''77

رابعہ اردو لغت میں خاکہ کے معنی اس طرح سے شامل ہیں:

''پنسل یا چاک سے بنایا ہوا نقشہ کا نشان، چربہ، نقشہ، ڈھانچہ''۔78

القاموس الجدید اردو عربی لغت میں خاکہ کے معنی اس طرح سے درج ہیں:

''تھیم، تصامیم، تشکیل''79

علمی اردو لغت میں خاکہ کے معنی یوں درج ہیں:

''وہ نقشہ جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے، کسی چیز کا ابتدائی نقشہ،

مرقع وہ مضمون جس میں کسی شخص کے جستہ جستہ حالات لکھے جائیں، ڈھانچہ،
چربہ، وہ مسودہ یا منصوبہ جو ذہن میں بنایا جائے'' ۔80

Standard 21st Centurey اردو انگلیش ڈکشنری میں خاکہ کے معنی یہ ہیں:

خاکہ:- "Out line, out line Map,Sketch, Rough
plan, Draft.

Standard 21 st century Dictionary Urdu ۔81

Wordinin Urdu Dictionary میں خاکہ کے معنی اس طرح سے درج ہیں:

خاکہ:

Preliminary drawing for later Elaboration
He made several studies before starting to
point. 82

Fallons English Urdu ڈکشنری میں خاکہ کے معنی یون درج ہیں:

''خاکہ،مسودہ، کچا نقشہ، حدود، وغیرہ کے خطوط کا نشان کرنا، نقشہ کھینچا، خاکہ
اتارنا،مسودہ کرنا، یا ایما یا اشارہ کرنا'' 83

The Standard English Urdu ڈکشنری میں Sketch کے معنی
اس طرح سے شامل ہیں:

''خاکہ،مختصر بیان'' 84

خاکے کے معنی Oxford Dctionary میں اس طرح سے درج ہیں:

A simple picture that is drawn quickly and
does not have details. The artist is makin
sketches for his next painting, She drew a

sketch map of the area to show us the way

85۔

ہندی ادب میں خاکے کو ریکھا چتر کہتے ہیں۔ اردو ہندی ڈکشنری میں خاکہ کے معنی ان الفاظ میں درج ہیں:

''ریکھا چتر، پری لیکھا، روپ ریکھا، ڈھانچہ۔'' 86۔

تلگو ادب میں خاکے کو چترمو کہتے ہیں۔ خاکہ کے معنی، تلگو اردو ڈکشنری میں یوں درج ہیں:

''چترمو، ریکھا کرتی، آکارمو، پٹمو'' 87۔

اردو انگلش، ہندی اردو تلگو لغات کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خاکہ انگریزی زبان کے لفظ Sketch کا مترادف ہے۔ اور اس کے معنی کچہ نقشہ، ڈھانچہ، ریکھا چتر، چربہ، پلان یا مسودہ جو ذہن میں بنایا جائے یا لفظوں میں نوٹ کر لیا جائے، تصویر اور حدود کی لکیریں وغیرہ کے ہیں۔ خاکہ کی اصطلاحی معنی سے مراد یہ ہے کہ جس میں کسی شخصیت کا بیان اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس طرح سے کریں کہ پوری شخصیت آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور ایسا محسوس ہو کہ قاری شخصیت کے متعلق پڑھ نہیں رہا ہے بلکہ شخصیت کو خود اپنے آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اردو ادب کے ادیبوں اور ناقدوں نے خاکہ نگاری کی تعریفیں مختلف انداز میں پیش کی ہیں۔ وہ ذیل میں پیش ہیں۔

ڈاکٹر صابرہ سعید نے اپنی کتاب اردو ادب میں خاکہ نگاری میں خاکہ نگاری کی تعریف پیش کرتے ہوئے خاکہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''خاکہ انگریزی اصطلاح Sketch کا متبادل ہے۔ لفظی مفہوم میں خاکہ کسی موضوع کے ابتدائی نقوش کو کہیں گے۔ جس کی بنیاد پر کسی شئے کی مکمل بُت گری ممکن ہو۔ لیکن ادب اور فن میں یہ اصطلاح مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ خاکے کی اصطلاح مصوری میں رائج ہے۔ مصور اگر کسی شخصیت کی مکمل اور بعینہ تصویر

پیش کرے تو اسے پوٹریٹ کہیں گے اس کے برخلاف مصور اگر چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے اس شخص کے خد و خال کی جھلک دکھا دے تو اسکیچ کہلائے گا''۔88ؔ

خاکہ انگریزی لفظ Sketch کا مترادف ہے۔ اس کے معنی کچھ نقشہ کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں خاکے سے مراد وہ صنف ہے جس میں کسی شخصیت کا بیان اشاروں میں اس طرح سے کیا جائے کہ شخصیت کے عادات و اطوار، اور خدوخال قاری کے سامنے آجائے۔ لہٰذا ڈاکٹر اشتیاق احمد ورک لکھتے ہیں:

''خاکہ انگریزی لفظ Sketch کا مترادف ہے، جس کے معنی کچھ نقشہ، ڈھانچہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں۔ لیکن ادبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات واطوار اور کردار کو سیدھے سادھے انداز اور روانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اس میں نہ جواب مضمون کی سی سنجیدگی درکار ہوتی ہے اور نہ ہی یہ سوانحی مضمون کی سی باقاعدگی اور ذمہ داری کا متحمل ہوسکتا ہے۔ بلکہ یہ تو کسی شخص یا شخصیت سے وابستہ عقیدت، احترام، محبت، دوستی، دلچسپی یا یادوں کی ایک ایسی لفظی تصویر ہوتی ہے جو کسی جگہ سے نہایت بے ساختہ انداز میں ختم ہو جاتی ہے''۔89ؔ

خاکے میں کسی شخصیت کے کردار اور افکار دونوں کی جھلک ہونا ضروری ہے اور خاکہ پڑھنے کے بعد قاری کو ایسا محسوس ہو کہ وہ اس شخصیت کو قریب سے جانتا ہو اور اس کی صورت، سیرت اور اس کے خیالات شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آجائے اور شخصیت کے بیان میں کسی کی طرح کی مبالغہ آرائی کا استعمال نہ ہو، کیونکہ مبالغہ کے ذریعہ اصلی شخصیت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر نثار احمد فاروقی اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے خاکے کی تعریف یون کرتے ہیں:

''اچھا خاکہ وہ ہے جس میں کسی انسان کے کردار اور افکار دونوں کی جھلک ہو، خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی صورت، سیرت، مزاج اس کے ذہن کی افتاد، اس کا زاویہ فکر، اس کی خوبیاں اور خامیاں سب نظروں کے سامنے آجائیں۔ شاعری میں مبالغہ ہوسکتا ہے۔ نثر میں عبارت آرائی کی تخیل کی آمیزش ہوسکتی ہے۔ لیکن خاکہ ایک ایسی صنف ہے جس میں رعایت ہو یا مبالغہ اور مدح سرائی ہوتو وہ پھر خاکہ نہیں رہتا''۔90

خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ اس کو نثر میں غزل کہا جاتا ہے کیوں کہ جس طرح غزل میں شاعر کم سے کم الفاظ کے ذریعہ اپنا مطلب بیان کرتا ہے ٹھیک اسی طرح ایک خاکہ نگار اپنے خاکے میں کم سے کم الفاظ کے ذریعے سے کسی شخصیت کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ اسکی مکمل شخصیت سے آگہی ہوجاتی ہے لہٰذا ڈاکٹر خلیق انجم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خاکہ کا فن بہت مشکل اور کٹھن فن ہے۔ اسے اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں طویل مطالب بیان کرنے میں مختصر الفاظ کو اپناتے ہیں، ٹھیک اسی طرح خاکے میں مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے''۔91

خاکے میں کسی شخصیت کی تمام خصوصیات کو اس طرح سے سامنے لائیں کہ جس کے ذریعہ سے قاری کو ایسا احساس ہو کہ وہ خاکہ پڑھ نہیں رہا ہے بلکہ خود اپنی آنکھوں کے سامنے اس شخص کو دیکھ رہا ہو، چنانچہ شمیم احمد کرہانی بھی اسی مفہوم کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خاکہ نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں شخصیتوں کی تصویریں اس طرح سے براہ راست کھینچی جاتی ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں قاری کے ذہن میں نقش ہوجاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے والے نہ صرف قلمی چہرہ ہی نہ دیکھا ہو بلکہ خود اس شخصیت کو دیکھا بھالا اور سمجھا بوجھا ہو''۔92

کسی بھی تصویر کے ابتدائی نقوش کو خاکہ کہا جاتا ہے۔ جس میں مصور اپنی تصویر کے لئے بنیادی خاکہ بناتا ہے اور بعد میں رنگوں اور جزئیات کے ذریعے سے اپنی تصویر میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ چنانچہ اس بات کے وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبد حسین لکھتے ہیں:

''اسکیچ دراصل فن تصویر کئی کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے نقوش کی وہ ابتدائی ترتیب مراد لی جاتی ہے جن سے مصور تصویر کا بنیادی خاکہ بناتا ہے اور جس میں رنگوں کے فرق اور ہلکے گہرے رنگوں کی ترتیب اور جزئیات کے اضافے کے ذریعے وہ اپنی تصویر کو مکمل کرتا ہے''۔93

خاکہ نگاری میں کسی شخصیت کو موضوع کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس خاکے میں موضوع کے طور پر شخصیت کی زندگی سے متعلق واقعات، سوانح، اور خارجی مشاہدات کے ساتھ ساتھ خاکہ نگار کو شخصیت سے متعلق اپنے تاثرات کا بھی بیان کرنا پڑتا ہے ان تمام خصوصیات کے بنا کر خاکہ ایک حقیقی انسان کی تصویر ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک اضافے کی دلکشی اور دلچسپی رکھتا ہے اس کی وجہ سے قاری اس خاکے کو بہ یک وقت واقعہ کے ساتھ ساتھ کہانی کے طور پر بھی پڑھ کر بھی لطف اٹھا سکتے ہیں، چنانچہ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''خاکہ نگاری تاریخ اور تخیل سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔ لکھنے والا جب کسی شخصیت کو موضوع بناتا ہے تو واقعات، سوانح، خارجی مشاہدات کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات اور خیالات سے بھی مدد لیتا ہے۔ اس لیے خاکہ ایک جیتی جاگتی حقیقی شخصیت کی تصویر ہوتے ہوئے بھی افسانے جیسی دلکشی اور دلچسپی کا سامان رکھتا ہے اور پڑھنے والا اسے گویا کہ بیک وقت واقعے کے طور پر بھی پڑھتا ہے اور کہانی کے طور پر بھی چنانچہ ایک کامیاب خاکہ جو اس صنف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو، ہماری فکر اور ہمارے احساسات دونوں سے رشتہ قائم کرتا ہے۔ اس صنف کے مطالبات فکری بھی ہوتے ہیں اور تخلیقی بھی''۔94

ڈاکٹر ہمایوں اشرف خاکہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی شخصیت کا خاکہ ایک تصویر کی طرح ہوتا ہے۔ مگر تصویر کو بنانے والا فوٹو گرافر نہیں بلکہ ایک ادیب ہے۔ اس کیلئے نہ تو کسی اوزاروں کی ضرورت ہوتی اور نہ ہی سنگ تراشوں کی اور نہ ہی کسی کیمرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سب کے باوجود بھی خاکہ فوٹو سے کہیں زیادہ دلکشی اور اثر انداز کرنے والا ہوتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"خاکہ دراصل کسی شخصیت کی قلمی تصویر ہوتی ہے جس کا خالق بت ساز یا مصور یا فوٹو گرافر نہیں بلکہ ایک ادیب ہوتا ہے جو اپنی ادیبانہ قوتوں سے کسی شخص کی عکس کشی یا مرقع نگاری کرتا ہے۔ اس کے بنانے میں نہ سنگ تراش کے اوزاروں کی حاجت، نہ رنگا رنگ پیالوں اور برش کی، نہ پنسل یا چارکول کی اور نہ کیمروں کی، یہ صورتیں محض الفاظ سے مرتب کی جاتی ہیں اور ان مجسموں، تصویروں، شبیہوں اور فوٹو سے زیادہ دلکشی اور اثر خیزی ہوتی ہے"۔ 95

خاکہ میں خاکہ نگار کسی شخصیت کے عادات واطوار اور خوبیاں اور خامیاں اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ شخص ہمارے سامنے چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور خاکے کی خاص خصوصیت یہ ہوتی ہے جو اس دلکشی پیدا کرتی ہے وہ یہ کہ خاکہ نگار جس کسی شخصیت کی خامیوں کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ قاری کو اس شخص میں سے نفرت کے بجائے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا پروفیسر نور الحسن نقوی کے خاکے کی اس خصوصیت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خاکے میں کسی شخصیت کے نقوش اس طرح ابھارے جاتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں اجاگر ہو جاتی ہیں اور ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے پیش نظر ہو جاتی ہے۔ ایک چیز ایسی ہے جو خاکے کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ یہ کہ جس کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے اس کی کمزوریاں قاری کے دل میں اس کے لئے نفرت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا کریں اور خاکہ پڑھ کر وہ بے ساختہ کہے کاش اس شخص میں یہ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں"۔ 96

ڈکینس نے اپنی تصنیف Sketches by Boz میں خاکے کی وضاحت اس طرح سے کی ہے:

"A brief story play of essay not as fully devoloped as the typical examples of these scherous.Among the commonest types are the charecter sketch.A shart discription of an interesting personality,and the sketch composd for a rovue a simple play let satirizing some topical trend or event. A group of short pieces by dickers are called under the little." 97

The new Encyclopedia of Britanica میں خاکہ کی تعریف ان الفاظ میں درج ہے:

"Short prose narrative, often an entertaing account of some aspect of a culture written by some one within that culture for recaders out side of it eg. anecdates of a traveler in indian published in an english majazine Relaved and informal in style, the sketch is less dramatic but more analytic and descriptive than the tale and the start. Story , A writer of

a sketch maintains a chatty and familiar tone, understanding his major points and suggesting rather than starting." 98

ڈکشنری لیٹریری ٹرمس میں ہیری شوکا نے خاکہ نگاری کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"A short discriptive essay , a shart play of brief ramatic performance, any simply Constructed composition that present a single charecter, single scence of sngle incident. A sketch may also be a rough design plan or first draft of aliterary work or a brief hasty."99

خاکے کی صنف کو اشاروں کا آرٹ کہا جاتا ہے اور خاکے میں اتنی وسعت ہے کہ خاکہ نگار کسی شخصیت کی زندگی سے متعلق چند واقعات کو اکٹھا کر کے ان کے پیش نظر پوری شخصیت کی تصویر بناتا ہے ۔اس طرح سے کہہ سکتے ہیں خاکہ نگار دریا کو کوزے میں بند کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صابرہ سعید نے خاکے کی اسی خوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''بعض اصناف فنی اعتبار سے بہ ظاہر تو بہت سادہ نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں بہت پیچیدہ ہوتی ہیں۔ خاکہ بھی ایسی ہی صنف ہے۔ اس کو اشاروں کا آرٹ کہا جاتا ہے۔اس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ ایک پھول کے مضمون میں تمام گلشن کی روح بند کی جاسکتی ہے''۔100

خاکہ دراصل غزل کی طرح ایک مشکل فن ہے کیوں کہ غزل کہتے وقت اگر شاعر تھوڑی سی بے احتیاطی برتے تو غزل اس کو مرثیہ بنا دیتی ہے ٹھیک اسی طرح خاکہ نگار خاکہ تحریر کرتے وقت کوئی غلطی کی تو اس پر سوانحی مضمون نگار کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اشرف رفیع خاکہ نگار کی اسی غلطی کی

نشاندہی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''غزل گوئی کی طرح خاکہ نگاری بھی ایک مشکل فن ہے، غزل کو کہنے کی کوشش میں ذرا سی بے احتیاطی اچھے خاصے شاعر کو مرثیہ گو بنا دیتی ہے۔ اور ذرا سی لغزش ایک خاکہ نگار کو صحافی یا سوانحی مضمون نگار کا لیبل لگا دیتی ہے''۔ 101

محمد حسین نے خاکے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس میں کسی خاص شخص کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ اور اس میں شخص کا چہرہ، اور شخصیت کے چند دلکش پہلو نمایاں ہوتے ہیں لیکن یہ خاکہ نگار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ ہمیں وہ شخص اجنبی نہیں لگتا بلکہ جانا پہچانا لگتا ہے، لہٰذا محمد حسین لکھتے ہیں:

''ہماری نظریں یہاں کسی خاص فرد سے ہمکنار ہوتی ہیں اس شخص کا چہرہ چہرے کے نقوش اور اس کی شخصیت کے چند دل کش جلوے، ادیب کی اس قلمی تصویر سے ہمارے پیش نگاہ آجاتے ہیں۔ اس صنف ادب میں ایک عجیب و پر فریب ہستی مقید ہوتی ہے، جسے دیکھنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے ہم اسے جانتے ہیں''۔ 102

خاکہ میں شخصیت سے متعلق تمام حالات زندگی کا بیان نہیں کیا جاتا ہے بلکہ شخصیت کے خاص پہلوؤں کا انتخاب کیا جاتا ہے اور ان پہلوؤں کا بیان اشاروں کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ خاکے میں شخصیت کا بیان مختصر ہونے کے باوجود قاری کو شخصیت کے ہر پہلو کے بارے میں جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ آمنہ صدیقی نے خاکہ نگاری کو سوانح نگاری کی ایک شکل کہا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں ان ہی میں سے ایک ''شخصی خاکہ'' ہے۔ یہ دراصل مضمون نگاری کی ایک قسم ہے جس میں کسی شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ جن کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ شخص

خاکہ کسی فرد کی مکمل داستان حیات نہیں ہوتا۔ بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے۔اس میں تفصیل سے زیادہ اجمال اور توضیع سے زیادہ ابہام ہوتا ہے۔اور ایسے اشارے کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہوجاتا ہے"۔103؎

ڈاکٹر محمد اشرف نے خاکے کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اس میں شخصیت کے عادات واطوار اور سیرت وکردار کا بیان کیا جاتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"خاکہ میں مصنف کسی خاص شخص کی سیرت وصورت گفتار وکردار، عادات، واطوار کو دل کش انداز میں بیان کرتا ہے"۔104؎

خاکہ کی ان تمام تعریوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔یہ صنف انگریزی ادب کے ذریعے سے اردو میں آئی ہے۔ انگریزی میں خاکے کو sketch کہتے ہیں۔اس کے لغوی معنی کچہ نقشہ، ڈھانچہ، چربہ اور حدود وغیرہ کے ہیں۔اصطلاح میں خاکے سے مراد کسی خاص شخصیت کی لفظی تصویر کے ہیں جس میں نہ صرف شخصیت کی شکل وصورت کا بیان کیا جاتا ہے بلکہ اس کے حلیہ، عادات واطوار، رہن سہن اور گفتگو وغیرہ کا بیان اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ پوری شخصیت ظاہری اور باطنی دونوں خصوصیات کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔خاکہ نگار کو شخصیت کے بیان میں غیر جانبداری برتنی چاہیئے کیوں کہ اگر خاکہ لکھتے وقت شخصیت کی صرف خوبیوں ہی کا بیان کیا جائے تو وہ خاکہ کہلانے کے بجائے قصیدہ کہلائے گا۔اس لئے خاکہ نگار کو چاہیئے کہ وہ شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے۔ان خصوصیات کے بیان کرنے میں خاکہ نگار کے لئے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا بھی ضروری ہے۔تاکہ وہ اپنے خاکے کے ساتھ انصاف کر سکے۔

خاکہ نگاری کے ابتدائی، نقوش، داستانوں اور تذکروں میں ملتے ہیں۔مگر خاکہ نگاری کا

باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصنیف ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' سے ہوا۔ تمام اصناف ادب کی طرح خاکہ نگاری کے بھی اپنے کچھ فنی لوازم ہیں۔ ان فنی لوازم تو خاکہ نگار اپنے خاکوں میں ملحوظ رکھتا ہے یہاں چند خصوصیات کا مختصراً جائزہ لیا جا رہا ہے۔

اختصار

خاکے کا سب سے اہم جز اختصار ہے اختصار ایک ایسی خصوصیت ہے جو خاکے کو سوانح عمری اور دیگر اصناف سے الگ رکھتی ہے۔ اختصار نہ صرف خاکے کے لئے ضروری ہے بلکہ افسانے کے لئے بھی اختصار ایک اہم جزو ہے۔ خاکے میں اختصار سے مراد کم الفاظ کے استعمال سے شخصیت کا بیان کرنا نہیں ہے بلکہ شخصیت سے متعلق چند ایسے واقعات کا انتخاب کیا جائے جن کی وجہ سے پوری شخصیت پر روشنی پڑے۔ بلکہ اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک خاکہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

خاکے کو نثری ادب کی ایک دلکش صنف مانا جاتا ہے اور خاکے کا فن غزل اور افسانے سے ملتا جلتا ہے کیونکہ غزل کا اہم جز اختصار ہے کیونکہ غزل میں شاعر اپنی پوری بات کو کم سے کم الفاظ کے ذریعہ سے شعر میں سموتا ہے ٹھیک اسی طرح افسانے میں کسی بھی شخص کی پوری زندگی سے چند خاص پہلو لے کر اس کے ذریعے سے پوری زندگی کو قاری کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ غزل اور افسانے کی طرح خاکے میں بھی خاکہ نگار شخصیت کے صرف چند گنے چنے واقعات کو انتخاب کر کے ان کے ذریعے سے پوری شخصیت کو اجاگر کرتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر نورالحسن نقوی خاکہ میں اختصار کی اسی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خاکہ نثری ادب کی ایک دلکش صنف ہے اس کا آرٹ غزل اور افسانے کے آرٹ سے مشابہت رکھتا ہے۔ مراد یہ کہ افسانہ وغزل کی طرح یہاں بھی اشارے کنائے سے کام لیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اختصار اس کی بنیادی شرط

ہے''۔105

مگر ڈاکٹر صابرہ سعید کا کہنا ہے کہ ایک اچھے خاکے کے لئے طویل یا مختصر ہونا ضروری نہیں ہے کیوں کہ اردو خاکہ نگاری میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کئی صفحات پر مشتمل ہے جب کہ مولوی عبدالحق نے صرف ڈیڑھ صفحے پر مشتمل حکیم امتیاز الدین کا خاکہ لکھا ہے۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کوئی بھی خاکہ طویل یا مختصر ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ شخصیت سے خاکہ نگار کے مراسم اور تعلقات کی بنا پر اس پر مرتب ہونے والے اثرات کی وجہ سے وجود میں آتا ہے اور خاکہ نگار جس قدر متاثر ہوگا وہ اپنے تاثرات کو اختصار کے ساتھ جامع انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے طوالت اور اختصار اہم بات نہیں ہے۔۔نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی کے علاوہ بھی اردو ادب میں طویل خاکے لکھے گئے ہیں مثلاً وہ دوزخی، گنجینہ گوہر وغیرہ۔

وحدت تاثر

فسانے کے علاوہ خاکہ نگاری کے فنی لوازم میں بھی وحدت تاثر شامل ہے۔اس کے بغیر خاکہ روکھا پھیکا لگتا ہے۔خاکہ اور افسانے کے وحدت تاثر میں فرق ہے۔وہ یہ کہ افسانے میں کسی بھی کہانی یا کردار کو پلاٹ کی مدد سے ترتیب وار بیان کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وحدت تاثر پیدا ہوتا ہے جب کہ خاکے میں شخصیت سے متعلق واقعات کا بیان پلاٹ کے بغیر ہی کیا جاتا ہے لیکن خاکہ نگار شخصیت کے انفرادی رنگ کو ایک خاص داخلی ترتیب و تنظیم کے سہارے شروع سے آخر تک دکھاتا ہے اس لئے اس میں وحدت تاثر شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> ''افسانے میں مصنف کوئی واقعہ یا کسی کردار کا نقش پلاٹ کی مدد سے ایک خاص ترتیب و توازن کے ساتھ اس طرح ابھارتا ہے کہ ایک مخصوص وحدت تاثر پیدا ہو سکے۔ جب کہ خاکے میں یہ تاثر کسی پلاٹ کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔

خاکے کا پلاٹ کردار کے تابع ہوتا ہے۔ چوں کہ خاکے کا مقصد ہی کسی شخصیت
کے متعلق تاثر کو پیش کرنا ہے۔اس لیے خاکہ نگار بجائے پلاٹ کے ایک خاص
داخلی ترتیب و تنظیم کے سہارے مخصوص شخصیت کے انفرادی رنگ کے تاثر کی
جھلک خاکے کے ابتدائی حصے ہی سے دکھانا شروع کرتا ہے جیسے جیسے شخصیت کے
نقوش واضح ہوتے جاتے ہیں ابتدائی تاثر یا اثر انگیزی تیز تر ہوتی جاتی
ہے''۔106؎

کردار نگاری:

خاکہ نگاری کے فنی لوازم میں کردار نگاری کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔کیونکہ خاکہ میں موضوع شخصیت اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے اس کی شخصیت کے اس خاص پہلو کو اجاگر کرنا ہی خاکہ نگار کا مقصد ہوتا ہے۔خاکے میں کردار کی خاص اہمیت ہوتی ہے اور بغیر کردار کے خاکے کا تصور ہی ممکن نہیں اسی لئے اسکی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے صابرہ سعید لکھتی ہیں:

'' خاکے کے جملہ عناصر ترکیبی میں کردار نگاری کو بھی خاص اہمیت حاصل
ہے۔خاکے کا موضوع کوئی شخصیت ہوتی ہے۔ یہ شخصیت اپنی انفرادی
خصوصیات رکھتی ہیں۔ان خصوصیات کو اجاگر کرنا ہی دراصل خاکہ نگار کا اہم
منصب ہوتا ہے۔اس اعتبار سے کردار، خاکے کا ایسا بنیادی جزو ہوتا ہے جس
کے بغیر خاکے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا''۔107؎

خاکہ میں کسی شخصیت کی تصویر اس طرح سے بیان کیا جا تا ہے کہ اس شخصیت کے ظاہر وہ باطن دونوں قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔اس تعریف سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہر انسان میں دو شخصیات موجود ہوتی ہیں ایک وہ کرار جسے ہم سب دیکھ سکتے ہیں اور ایک وہ جو اندرون میں موجود ہو تی ہے جسے کوئی بھی دیکھ نہیں سکتے۔اس کے لئے اس شخصیت سے دیرپا ملاقات اور جذباتی لگاؤ ضروری ہے۔ایک اچھا خاکہ نگار کردار کی دونوں شخصیتوں سے واقف ہوتا ہے۔اور وہ قاری تک پہنچانے میں

کامیاب ہوتا ہے۔

واقعہ نگاری

خاکے کے فنی لوازم میں واقعہ نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔خاکے میں کسی شخصیت کے خوبیوں اور خامیوں کو بیان کیا جاتا ہے اس کے لئے خاکہ نگار کو شخصیت کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے مدد لینی پڑتی ہے کیوں کہ ان ہی واقعات کے ذریعہ شخصیت کو پوری طرح سے بے نقاب کر سکتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعہ نگاری خاکے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

واقعہ نگاری سے مراد یہ نہیں ہے کہ خاکہ نگار شخصیت سے متعلق کسی بھی واقعہ کو لے کر خاکہ لکھے بلکہ خاکہ نگار کو چاہئے کہ وہ شخصیت سے متعلق اہم واقعات کا انتخاب کریں جس کے ذریعے سے شخصیت کی مکمل عکاسی ہو۔خاکہ نگار کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ کسی بھی سنے سنائے واقعات کو ترجیح نہ دیں بلکہ شخصیت سے قربت کے بعد جن واقعات کے ذریعہ شخصیت کی خوبیوں اور خامیاں کا پتہ چلے ان واقعات کا انتخاب کرے جو شخصیت کی عکاسی میں مدد دے۔

منظر کشی

منظر کشی دراصل واقعہ نگاری ہی سے متعلق ایک جز ہے۔منظر کشی سے مراد یہ ہے کہ کسی حالت یا جگہ یا کیفیت کا بیان اس طرح سے کریں کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جائے ،منظر نگاری خاکہ کا ایسا جز ہے جس کے ذریعے سے زمان ومکاں کا تعین ہوتا ہے۔ایک خاکہ نگار کے لئے منظر کشی میں ماہر ہونا ضروری ہے کیوں کہ خاکے میں کسی شخص کی تصویر لفظوں میں بیاں کی جاتی ہے۔اسی لئے شخصیت کے ساتھ ساتھ ماحول اور مناظر کی عکاسی میں بھی قدرت حاصل ہونی لازمی ہے۔

ان تمام اقتباسات کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خاکہ نگاری اگر چہ مشکل فن ہے۔لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے کسی بھی شخصیت کے عادات واطوار، حلیہ، رہن سہن،

سیرت و کردار اور پسند ناپسند وغیرہ سے متعلق اہم باتوں کا علم ہوتا ہے مگر شخصیت کا بیان غیر جانبداری کے ساتھ اس طرح سے کیا جائے کہ شخصیت اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے گھوم جائے تب ہی ایک کامیاب خاکہ وجود میں آتا ہے۔

☆☆☆

حواشی

1. جامع فیروز الغات،ص:880
2. اعجاز الغات،ص:505
3. رابعہ اردو لغت،ص: 748
4. علمی اردو لغت،ص:995
5. لغات کشوری،ص:308
6. Standard 21st cneturey اردو انگلش ڈکشرنی،ص:425
7. The Oxford English Urdu ڈکشرنی،ص:1507
8. The Standard Engish Urdu ڈکشنری،ص:1060
9. طنزیات و مضحکات،رشید احمد صدیقی،ص:23
10. اردو ادب میں طنز و مزاح،ڈاکٹر وزیر آغا،ص:58
11. طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ،خواجہ عبدالغفور،ص:79
12. بحوالہ طنزیات و مضحکات،رشید احمد صدیقی،ص:26
13. آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح،ڈاکٹر مظہر احمد،ص:16
14. بحوالہ طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ،ص:85
15. مشمولہ، اردو شاعری میں طنز و مزاح،طنز و مزاح کا تاریخ و تنقید،شوکت سبزواری،ص:98
16. اردو طنز و مزاح فن اور روایت،ص:31
17. مطبوعہ،ساقی طنز و ظرافت نمبر،وقار عظیم،اپریل،1946،ص:14
18. ڈاکٹر وزیر آغا اردو ادب میں طنز و مزاح،ص:57

19۔ بحوالہ، سید عابد حسین کے مضامین میں طنز ومزاح، فانی انیس الحق، ص:33

20۔ اردو طنز ومضحکات کے نمائندہ اسالیب، طارق سعید، ص:50

21۔ بحوالہ فکر تونسوی شخصیت اور فن، سید نصیر الدین احمد، ص:16

22۔ بحوالہ، اردو ادب میں طنز ومزاح، ص:59

23۔ مشاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد طاہر، ص:45

24۔ طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ، خواجہ عبدالغفور، ص:79

25۔ جامع فیروز الغات، ص:1237

26۔ اعجاز الغات، ص:658

27۔ رابعہ اردو لغت، ص:1053

28۔ علمی اردو لغت، ص:1380

29۔ فرہنگ عامرہ، ص:572

30۔ لغات کشوری، ص:486

31۔ Fallons english Urdu ڈکشنری، ص:489

32۔ The Standard English Urdu Dictionary

33۔ Standard 21st cneturey Urdu to English ڈکشنری، ص:583

34۔ Urdu Hindi Dictionary، ص:549

35۔ The Oxford English Urdu Dictionary، ص:771

36۔ کنہا لال کپور: حیات اور کارنامے، ایس جے صادق، ص55)

37۔ طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ، خواجہ عبدالغفور، ص:28

38۔ اردو ادب میں طنز ومزاح، ڈاکٹر وزیر آغا، ص:31

39۔ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سنبل نگار، ص:234

40۔ انور صدیقی، پطرس بخاری ایک تجزیہ، ص:۲

41 بحوالہ سید عابد حسین کے مضامین میں طنز و مزاح، قاضی انیس الحق، ص:10
42 ڈاکٹر طیبہ خاتون اردو میں ادبی نثر کی تاریخ، ص: 327
43 مجتبیٰ حسین ماہنامہ شگوفہ، طنز کیا ہے مزاح کیا ہے، ص:72
44 بحوالہ اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، ص:33
45 اردو ادب میں طنز و مزاح، ڈاکٹر وزیر آغا، ص:41
46 خواجہ عبدالغفور طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ، ر، ص:27
47 بحوالہ فکر تونسوی شخصیت اور فن، سید نصیر الدین احمد، ص:25
48 بحوالہ سید عابد حسین کے مضامین میں طنز و مزاح، قاضی انیس الحق، ص:21
49 بحوالہ طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب، ص:62
50 بحوالہ طنز ویات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب سید عابد حسین، ص:75
51 ڈاکٹر سنبل نگار، اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ص:234
52 قاضی انیس الحق سید عابد حسین کے مضامین میں طنز و مزاح، ص:24
53 اسلوب احمد انصاری ،ادب اور تنقید، ص: ۲۳۳
54 ادب اور تنقید، اسلوب احمد انصاری، ص:237
55 ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ص:30
56 بحوالہ اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب، ص:72
57 مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات، ص:46
58 ڈاکٹر انور احمد انصاری، پنجاب کا طنزیہ و مزاحیہ نثری ادب، مطبوعہ پرواز ادب، طنز و مزاح نمبر، ، ص:23
59 مشمولہ، طنز و مزاح کا تاریخ و تنقید، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص:7
60 ڈاکٹر محمد طاہر، مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات، ص:43
61 طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ، خواجہ عبدالغفور، ص:19

62۔نثر اور انداز نثر، ڈاکٹر سید عابد حسین، ص:93

63۔ ماہنامہ ادب لطیف، ایک مزاح نگار، ڈاکٹر وزیر آغا، ص:31

64۔ فکر تونسوی شخصیت اور فن، سید نصیرالدین، ص:30

65۔ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سنبل نگار، ص:235

66۔ قاضی انیس الحق، سید عابد حسین کے مضامین میں طنز و مزاح، ص:26

67۔ ڈاکٹر خالد محمد، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، ص:63

68۔ ادب اور تنقید، اسلوب احمد انصاری، ص:233

69۔ اردو ادب میں طنز و مزاح، ڈاکٹر وزیر آغا، ص:50

70۔اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سنبل نگار، ص:236

71۔ادب اور تنقید، اسلب احمد انصانی، ص:242

71۔ سید عابد حسین کے مضامین میں طنز و مزاح، قاضی انیس الحق، ص:43

72۔ فکر تونسوی شخصیت اور فن، سید نصیرالدین احمد، ص:31

73۔ماہنامہ شگوفہ، وجاہت علی سندیلوی سے ایک انٹرویو، شمارہ 12/دسمبر 2007ء، ص:36

74۔بحوالہ سید عابد حسین کے مضامین میں طنز و مزاح، قاضی انیس الحق، ص:44

75۔جامع فیروز الغات، الحاج مولوی فیرزالدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص :582

76۔اعجاز الغات، زیر اہتمام تصنیف، تخفیف آفسٹ پرنٹرس، دہلی، ص:340

77۔ نسیم الغات، ص:427

78۔رابعہ اردو لغت، ص:501

79۔ القاموس الجدید اردو عربی لغت، ص:409

80۔ علمی اردو لغت، وارث سرہندی، لاہور، ص:663

81. to english, Delhi, Page No:281.

82. (Urdu wordinin.com/ sketch)

83. Fallons english urdu dictionary, central urdu board, lahore 1976, Pg. No. 910

84. The Standard english urdu dictionary Abdulhq pg no 1146

85. (Oxford Dictionary. Pg. No. 1430

86. اردو ہندی ڈکشنری، اختر زماں، ثمر آفسٹ پرنٹرس، دہلی، 2003ء، ص:200

87. تلگواردوڈکشنری، ص:114

88. ڈاکٹر صابرہ سعید، اردوادب میں خاکہ نگاری، 1978، ص:59

89. ڈاکٹر اشتیاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز و مزاح، 2004ء، ص:392

90. بحوالہ مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری، نثار احمد فاروقی، ص:112

91. بحوالہ کلیات منٹو (منٹو کے خاکے) ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص:35

92. چند تصویریں بتاں، شمیم احمد کربانی، ص: 9

93. نثر اور انداز نثر، ڈاکٹر سید عابد حسین، نسیم بک ڈپو، 1984ء، ص:54

94. آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ نگاری، شمیم حنفی، ص:10

95. کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص:35

96. تاریخ ادب اردو پروفیسر نورالحسن نقوی، 2006ء، ص:383

97. بحوالہ، اردوادب میں خاکہ نگاری، ص:62

98. The new Encyclopiedia Britanica. Vol. 7 page :398

99. Dictionary of litterary terms by Harry show {Pg. No. 347

100. اردوادب میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید، ص:9

101. ڈاکٹر اشرف رفیع، شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر، جلد۔20، 1987ء، ص:99

102۔بحوالہ،عصمت چغتائی کی غیرافسانوی نگارشات،ڈاکٹر محمد اشرف،ص:43
103۔بحوالہ،اردو ادب میں خاکہ نگاری،آمنہ صدیقی،ص:62
104۔عصمت چغتائی کی غیرافسانوی نگارشات،ڈاکٹر محمد اشرف،ص:43
105۔ تاریخ ادب اردو،پروفیسر نورالحسن نقوی،ص:383
106۔ڈاکٹر صابرہ سعید،اردو ادب میں خاکہ نگاری،ص:43
107۔اردو ادب میں خاکہ نگاری،ڈاکٹر صابرہ سعید،ص:44

☆☆☆

باب دوم

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت

خاکہ ایک غیر افسانوی صنفِ نثر ہے۔اس کو 1857ء کے بعد عروج حاصل ہوا۔خاکہ کو انگریزی میں Sketch کہتے ہیں۔اس کے لغوی معنی کچا نقشہ، ڈھانچہ، چربہ اور نقشہ جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے، وغیرہ کے ہیں۔اصطلاح میں خاکے سے مراد وہ صنف ہے جس میں کسی شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کو اشاروں میں اس طرح سے بیان کریں کہ جس سے شخصیت کے عادات واطوار اور رہن سہن، طور طریقے اور اخلاق و کردار مکمل طور پر ہماری نظروں کے سامنے آجائے۔ خاکہ کی تعریف ڈاکٹر اشتیاق احمد ورک نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''خاکہ انگریزی لفظ Sketch کا مترادف ہے۔جس کے معنی کچا نقشہ یا ڈھانچہ یا لکیروں کی حدود سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا خاکہ نقشہ، عادات واطوار اور کردار کو سیدھے سادے انداز اور روانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے''۔[1]

خاکہ ایک ترقی یافتہ صنف ہے۔اس کا آغاز یونان میں ہوا تھا۔یونانی ادب کے تحت ہی خاکہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا اور انگریزی ادب میں خاکہ نگاری کے اولین نمونے چاسر کی تصنیف "Canterbury Tales" میں ملتے ہیں۔مگر اردو ادب میں خاکہ نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا، لیکن اس کو عروج بیسویں صدی میں حاصل ہوا۔اردو کی بہت سی اصناف ادب کی طرح خاکہ نگاری بھی انگریزی ادب ہی کے زیر اثر اردو میں داخل ہوئی۔ یہ اردو میں خود ہی پروان

چڑھی۔۔ڈاکٹر صابرہ سعید نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اردو ادب میں خاکہ نگاری کا باضابطہ آغاز اگرچہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہو چکا تھا، لیکن صحیح معنوں میں اس کی نشو ونما بیسویں صدی میں ہوئی۔ اس اعتبار سے نثر کی دیگر اصناف اصناف کے مقابلے میں یہ ایک نوخیز صنف ہے۔ ناول کی طرح یہ بھی اردو کی ایک خودرو صنف ہے، جو اپنے آپ پیدا ہوئی اور بڑھی۔ یا یوں کہیے کہ اس کی اختراع کا سہرا اردو کے ادیبوں کے سر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آگے چل کر انگریزی ادب کے اثرات بھی اس نے قبول کئے''۔2

خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز 1927ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاتھوں ہوا ہے لیکن اگر ہم تحقیقی نظر سے دیکھیں تو خاکہ نگاری کے اولین نقوش اردو شاعروں کے تذکروں میں شامل ہیں۔ جیسا کہ انشاء اللہ خاں انشاؔ کے ''دریائے لطافت'' میں شامل کردار میر غضر غینی اور بی نورن کے مکالمے خاکے کی تعریف میں آسکتے ہیں مگر ان کرداروں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ کردار اصلی نہیں بلکہ فرضی ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر تذکروں مثلاً ''نکات الشعرا، تذکرہ ہندی، گلشن بے خار اور مجموعہ نغز'' وغیرہ تذکروں میں بھی خاکے کی جھلکیاں ملتی ہیں چنانچہ نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

''اردو میں باقاعدہ خاکہ نگاری کا آغاز تو حال میں ہوا لیکن شعرائے اردو کے تذکروں میں اس کی جھلکیاں ضرور مل جاتی ہیں۔ میرؔ کے ''نکات الشعراء'' مصحفی کے ''تذکرہ ہندی'' شیفتہ کے ''گلشن بے خار'' قدرت اللہ قاسم کے ''مجموعہ نغز'' سعادت یار خان کے ''خوش معرکہ زیبا'' کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے''۔3

ان تمام تذکروں میں جو نقوش شامل ہیں ان میں صرف خاکہ نگاری کی ایک یا دو جھلک ملتی ہیں۔ مگر تذکروں کی ترقی یافتہ شکل میں ''آب حیات'' ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس میں خاکہ نگاری کے کچھ واضح جھلکیاں موجود ہیں۔ ''آب حیات'' میں جہاں جہاں شعراء کے تعلق سے لکھا گیا ہے ان کو

خاکہ نگاری کے ضمن میں پیش کر سکتے ہیں لٰہذا احسن چشتی لکھتے ہیں:

''آب حیات تک آتے آتے یہ نقوش ذرا اور بھی تیکھے ہو گئے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے بعض شعراء مثلاً میر تقی میرؔ، امام بخش ناسخؔ وغیرہ کے حالات لکھتے ہوئے کچھ ایسی تصویر کشی کی ہے جس پر ہم خاکہ نگاری کی اصطلاح کا اطلاق کر سکتے ہیں''۔ 4

آب حیات 1880ء میں شائع کیا گیا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آزاد نے جس طرح سے ہر شاعر کی عادات واطوار، رہن سہن، طور طریقے، خوبیاں، خامیاں اور حلیے وغیرہ کا بیان کیا ہے اس کی وجہ سے شعراء کے شخصیت کی بڑی عمدہ عکاسی ہوتی ہے۔ ان خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے آزاد کو پہلے تذکرہ نگار کہہ سکتے ہیں جن کی تصنیف میں خاکہ نگاری کی واضح جھلکیاں ملتی ہیں چنانچہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''آب حیات میں کئی تصویریں ایسی ہیں جن میں شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری کا کمال دیکھا جا سکتا ہے، میرؔ، سوداؔ، آتشؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، غالبؔ، انشاؔء کی تصویروں کو آزادؔ کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان تصویروں میں ایک واضح انسانی سوز کا اظہار ہوا ہے۔ ہم اس انسانی عنصر کو آزادؔ کے شعور کا شناس نامہ کہہ سکتے ہیں''۔ 5

محمد حسین آزادؔ کی تصنیف '' آب حیات'' نہ صرف خاکہ نگاری کے لئے مشہور ہے بلکہ اس میں اور بھی خصوصیات موجود ہیں مثلاً اردو تذکرے، اردو تنقید، اور اردو میں ادبی تاریخ نویسی کی نمایاں خصوصیات اس کتاب میں نظر آتی ہیں۔ اس طرح آب حیات کی اہمیت خاکہ نگاری کے سلسلہ میں بھی ہے۔

آب حیات کے علاوہ محمد حسین آزادؔ کی تصنیف '' دربار اکبری'' میں بھی خاکہ نگاری کے ہلکے

جھلکے نقوش ملتے ہیں۔ اس میں حلیہ نگاری، عادات و اطوار، اور کردار نگاری کے نمونے موجود ہیں۔ چنانچہ صابرہ سعید لکھتی ہیں:

''محمد حسین آزاد کی تصنیف ''دربار اکبری'' میں بھی خاکہ نگاری کی کچھ جھلکیاں مل جاتی ہیں اس میں ہمیں خصائل و عادات، حلیہ نگاری اور کردار نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں''۔ 6

اس طرح محمد حسین آزاد کی دونوں تصانیف میں خاکہ نگاری کے جھلکیاں شامل ہیں۔ اس طرح ان تصانیف کو خاکہ نگاری کے اولین نقوش کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔

''آب حیات'' کے بعد خاکہ نگاری کے نقوش عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں شامل ہیں۔ انہوں نے آزاد کے نقش قدم پر چل کر خاکہ نگاری کے میدان کو وسیع بنادیا ہے لہٰذا اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید وصی اللہ بختیاری لکھتے ہیں:

''اردو ادب کی جدید نثری اصناف میں قلمی تصویر کشی اور مرقع نگاری کو ایک صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ زمانہ قدیم ہی سے سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کے ہاں اس کے نقوش ملتے ہیں جیسے ''آب حیات'' (محمد حسین آزاد)، ''سیر رجال ونسواں'' (عبدالحلیم شرر)، ''یاد ایام'' (عبد الرزاق کانپوری)، وضعداران لکھنؤ'' (مرزا ہادی رسوا) وغیرہ''۔ 7

اس طرح سے محمد حسین آزاد کے بعد ان لوگوں نے خاکہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان دونوں کے علاوہ خواجہ حسن نظامی نے دلی کی بڑی شخصیتوں کے خاکے تصنیف کئے ہیں۔ ان کے خاکوں میں خاکہ نگاری کی اہم خصوصیات ملتی ہیں چنانچہ صابرہ سید لکھتی ہیں:

''ان کے ہاں ہم کو خاکے کے اہم لوازم یعنی حلیہ نگاری، سیرت کی عکاسی، منظر نگاری، واقعہ نگاری سبھی کچھ ملتے ہیں۔ اس کے باوجود انھیں مکمل خاکہ کہنا اس لئے ممکن نہیں کہ ان شخصیتوں کا جامع خاکہ پیش کرنا حسن نظامی کا بنیادی

نصب العین نہیں تھا۔ البتہ خاکے کے ابتدائی نقوش میں حسن نظامی کی اس تصنیف کو ہمیشہ اہمیت حال رہے گی''۔ 8

ان تمام تصانیف میں صرف خاکہ نگاری کے ہلکے پھلکے نقوش ہی ملتے ہیں۔مگر خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوتا ہے۔انہوں نے'' نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کچھ میری زبانی'' لکھ کر اس کی بنیاد ڈالی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے'' نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' کو 1927ء میں شائع کیا۔ اس تصنیف کو باقاعدہ طور پر اردو کا پہلا خاکہ اور مرزا صاحب کو پہلے خاکہ نگار تسلیم کیا جاچکا ہے۔ یہ اردو کا پہلا مکمل اور طویل خاکہ مانا جاتا ہے۔خلیق انجم نذیر احمد کی کہانی کے متعلق کہتے ہیں کہ'' نذیر احمد کی کہانی اردو کا پہلا طویل اور مکمل خاکہ ہے اور یہ سینکڑوں صفحات پر مشتمل سوانح سے زیادہ بھاری ہے۔''

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس خاکہ کو مولوی عبد الحق کی ہمت افزائی پر لکھا تھا کیونکہ جب انہوں نے مولوی صاحب کا خاکہ لکھنا شروع کیا تو ان کے دوست واحباب اور رشتہ داروں نے ان پر اعتراضات کئے تھے۔جس کی وجہ سے انہوں نے جو کچھ لکھا تھا اس کو پھاڑ دیا تھا اور بعد میں مولوی عبدالحق کی ہمت افزائی پر پھر سے لکھنا شروع کیا تھا۔لہٰذا رشید حسن خان نے اس بات کی وضاحت یوں کی ہے:

'' مولوی نذیر احمد کا یہ خاکہ دراصل لکھا ہی گیا تھا، مولوی عبدالحق کی فرمائش اور اصرار پر۔ غالباً یہ پہلا مضمون ہے جو فرحت اللہ بیگ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ عموماً'' مرزا الم نشرح'' کے نام سے لکھا کرتے تھے''۔9

اس اقتباس سے یہ وضاحت بھی ہوجاتی ہے کہ مرزا صاحب کا یہ پہلا مضمون تھا جو مرزا

فرحت اللہ بیگ کے نام سے شائع ہوا تھا، کیونکہ اس سے پہلے وہ ''مرزا الم نشرح'' کے نام سے ہی مضامین لکھا کرتے تھے۔

نذیر احمد کی کہانی میں مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے استاد محترم ڈپٹی نذیر احمد ہی کو موضوع بنایا انہوں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ ان کی ہر عادت کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ ان سے متعلق ان کے تمام تاثرات کو اس تصنیف میں سمو دیا تھا۔ اس تصنیف کی ایک اہم خصوصیت ان کی غیر جانبداری ہے کیونکہ اس میں انہوں نے کسی بھی چیز کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کیا بلکہ وہ خود کہتے ہیں کہ ''جو کچھ کانوں سے سُنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا۔ خواہ کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی نذیر احمد مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا، وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا''، اس طرح انہوں نے مولوی نذیر احمد کی تمام خوبیوں کے ساتھ ان کی خامیوں پر بھی لکھا ہے۔ ان کی غیر جانبداری کی وضاحت کرتے ہوئے عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''میرا خیال ہے کہ اردو میں خاکہ نگاری کی بہترین مثال مرزا فرحت اللہ بیگ کی رقم کی ہوئی ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' ہے۔ حالاں کہ ایک شاگرد نے ایک استاد کا خاکہ مرتب کیا ہے، مگر اس میں کوئی قصیدہ خوانی نہیں ہے، نہ ہجو نگاری ہے، بلکہ نزیر احمد خلوت وجلوت میں اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ حقیقی زندگی میں جیسے تھے بالکل ویسے ہی نظر آتے ہیں''۔10

مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''دلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' ہے۔ یہ کتاب 1928ء میں شائع ہوئی۔ اس خاکے کو انھوں نے اورنگ آباد کالج ڈے کے لئے لکھا تھا۔ اس تصنیف کو انھوں نے محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' اور کریم الدین کی تصنیف ''طبقات الشعراء'' سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

فرحت اللہ بیگ کے خاکوں کا تیسرا مجموعہ ''ایک وصیت کی تعمیل میں'' ہے۔ اس تصنیف

کو رسالہ اردو کے ذریعہ 1929ء میں شائع کیا گیا تھا۔اس خاکے میں مولوی وحیدالدین سلیم کو موضوع بنایا گیا ہے۔اسے انہوں نے خود موضوع خاکہ کی فرمائش پر لکھا تھا۔یہ خاکہ اتنا کامیاب نہیں ہوا تھا جتنا کہ نذیراحمد کا خاکہ ہوا تھا۔اس کی ایک وجہ تو یہ مانی جاتی ہے کہ وحیدالدین سلیم سے ان کی ملاقات ان کی آخری عمر میں ہوئی تھی۔ان سے اتنا لگاؤ بھی نہیں تھا اور انہیں جتنا مواد ملا اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے یہ خاکہ تصنیف کیا تھا۔چنانچہ رشید حسن خاں اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''ایک وصیت کی تعمیل'' میں خاکہ نگاری اور مضمون نگاری دونوں کے عناصر یک جا ہوگئے ہیں، یوں وہ اس پہلے خاکے کے برابر نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ مولوی وحیدالدین سلیم کو انہوں نے دور سے دیکھا تھا اور مولوی نذیر احمد کو قریب سے دیکھا تھا اور بہت قریب سے''۔11؎

یہی وجہ ہے کہ مولوی وحیدالدین سلیم کا یہ خاکہ اتنا جاندار نہیں جتنا کہ نذیراحمد کا ہے۔انھیں ان سے زیادہ قربت بھی نہیں تھی اور زیادہ ملاقات بھی نہیں رہیں۔یہی وجہ رہی کہ اس خاکے کو اتنی شہرت حاصل نہیں ہوئی جتنا کہ نذیراحمد کے خاکے کو حاصل ہوئی تھی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے ان تینوں خاکوں کے علاوہ اور بھی ایسے مضامین شامل ہیں جنہیں خاکوں کی فہرست میں رکھ سکتے ہیں ان میں لالہ سری رام، یادایام، عشرت فانی، العظمۃ اللہ، خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان مرحوم، حکیم آغا خاں اور نواب عبدالرحمٰن خان احسان وغیرہ مضامین شامل ہیں۔ان مضامین میں خاکے کے نقوش شامل ہیں۔ان مضامین کے علاوہ بیسویں صدی میں طنز ومزاح کے مصنف نامی انصاری نے ان کے ایک اور خاکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ایک خاکہ ''ایک وصیت کی تعمیل'' جو مولوی وحیدالدین سلیم پر ہے۔مرزا فرحت کی ذہانت، بذلہ سنجی اور خوش مذاجی پر دال ہے۔''آزاد نگارستان اور دادا جان'' بھی ایک قسم کا خاکہ ہی ہے جس میں ان کے تخیل کی پرواز اپنی پوری بلندی

پر نظر آتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ مضمون مرزا فرحت نے آزادی سے کئی سال قبل لکھا
تھا اور یہ محض تخیلی داستان ہے''۔12؎

'' آزاد نگارستان اور دادا جان'' ان کا مضمون ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے خاکوں میں دہلی کی ٹکسالی زبان کا استعمال کیا ہے اس کے علاوہ روز مرہ اور محاوروں کا بھی حسن اس میں نظر آتا ہے۔

آغا حیدر حسن کی مقبولیت اردو ادب میں ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ لیکن انہوں نے خاکہ نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''پس پردہ'' ہے اس میں آغا حیدر حسن نے کچھ شخصیات کی تصویر اس طرح سے کھینچی ہے کہ جنہیں خاکوں کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

آغا حیدر حسن کے مضامین کا یہ مجموعہ 1926ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل مضامین مثلاً مسز نائیڈو، سید حسن اور مسٹر حیات اللہ انصاری کے مضامین میں خاکے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان تمام مضامین میں بیگم نائیڈو کے خاکے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں انہوں نے حلیہ نگاری ہو کہ سیرت نگاری ایک ایک پہلو کا بیان اس عمدگی سے کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا ہے۔ اور اسی مضمون کی وجہ سے انہیں شہرت بھی حاصل ہوئی۔ ان کے خاکوں میں عورتوں کی جذبات، خیالات واحساسات کو منفرد اسلوب کے ذریعہ دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ حسن چشتی لکھتے ہیں:

''پس پردہ (آغا حیدر حسن دہلوی) اپنے انداز واسلوب کے اعتبار سے
بالکل منفرد کتاب ہے۔ اس میں بیگماتی زبان کی شیرینی و دلآویزی ہے جو آغا
حیدر حسن دہلوی کا خاص امتیاز تھا۔ انہوں نے سروجنی نائیڈو کا خاکہ بہت دلچسپ
انداز میں لکھا ہے''۔13؎

ان کے بعض خاکے ان کی کتاب ''ندرت زبان'' میں بھی شامل ہے۔مثلاً دادا حسنی، قادر خان مرحوم، نواب شمس اللہ، سرنجن وفریز راور مومن خان مومن ان کے اہم خاکے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد جنہوں نے اس صنف پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے وہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہیں۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' ہے۔یہ خاکہ 1937ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے نام ہی سے انداز ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مجموعے میں اپنے ہم عصروں کے خاکے قلم بند کئے ہیں۔انہوں نے اپنے خاکوں کے لئے بڑی شخصیات کو بھی انتخاب کیا اور اپنے باغ کے مالی کو بھی کو بھی خاکہ کا موضوع بنایا ہے۔اس مجموعے میں سرسید اور مالی کے علاوہ خابیدہ ادیب خانم اور حسرت موہانی جیسے شعر و ادب سے تعلق رکھنے والی شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ان کے علاوہ دو ایسی شخصیتیں ہیں جن کو صرف مولوی عبدالحق کے وجہ سے یاد کیا جا سکتا ہے۔چنانچہ اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

> ''مولوی عبدالحق کی کتاب ''چند ہم عصر'' اپنا الگ امتیاز رکھتی ہے۔جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، اس کتاب میں مولوی صاحب نے اپنے ان معاصرین کی سیرت کو نمایاں کیا ہے، جن سے زندگی کی کسی منزل پر بھی انھیں قربت رہی ہے۔ ان میں سرسید اور حالی جیسے بزرگوں سے لے کر خالدہ ادیب خانم اور حسرت موہانی تک وہ تمام مشاہیر شامل ہیں جنہوں نے علم وفضل، سیاست اور مذہب اور شعر وادب کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور ان کے علاوہ ایک بزرگ میرن صاحب جو غالب سے منسلک ہونے کی وجہ سے معروف ہیں۔، اور دو ایسے گمنام افراد بھی شامل ہیں جنہیں صرف مولوی صاحب کے قلم نے تحریر کے صفحات پر زندگی بخش دی ہے''۔[۱۴]

مولوی عبدالحق کے خاکوں کی اہم خصوصیت اسلوب ہے۔جو نہایت سادہ ہونے کے علاوہ

دلنشین بھی ہے۔ان کے اسلوب کی اہم خصوصیت تفصیل لفظی ہے۔قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔اورانہوں نے عبارت میں ترتیب وتنظیم کا بھی خاص خیال رکھا ہے، چنانچہ ڈاکٹر صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> ''مولوی صاحب کے مرقعوں میں جو چیز سب سے زیادہ قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے وہ تفصیل الفاظ کا جوہر ہیں ان کے یہاں مفہوم کی اکائیوں اورالفاظ کی اکائیوں کے درمیان جو مطابقت پائی جاتی ہے۔عبارت میں جھول نہیں، جملوں کی دردوبست اور تنظیم میں اختصاراور جامعیت سے کام لیا ہے''۔15ے

مولوی عبدالحق کے بعدرشید احمد صدیقی ایک اہم خاکہ نگار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔رشید احمد صدیقی ایک مزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن وہ ایک اہم خاکہ نگار بھی ہیں۔ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''گنج ہائے گراں مایہ'' ہے یہ مجموعہ 1937ء میں شائع ہوا ہے۔اس میں جملہ تیرہ خاکے شامل ہیں۔اس مجموعے میں شامل خاکے اردوادب سے وابستہ شخصیات کے ہیں جیسے کہ اصغر، جگراوراقبال وغیرہ کے خاکے شامل ہیں۔ان کے علاوہ اس مجموعے میں ایک ایسے شخص کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جنھیں رشید احمد صدیقی کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

''ہم نفسان رفتہ'' رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے اس میں دس خاکے شامل ہیں۔اس مجموعے میں انہوں نے مشہور ومقبول شخصیتوں کے علاوہ معمولی حیثیت رکھنے والی شخص کو بھی موضوع بنایا ہے۔وہ ''کندن'' ہے جو ان کے کالج کا چپراسی ہے چنانچہ نامی انصاری لکھتے ہیں:

> ''گنج ہائے گراں مایہ میں ناقدین نے سب سے زیادہ اہمیت محمد ایوب عباسی کے مرقعے کو دی ہے۔اس کی متعدد وجوہات میں یہ وجہ بھی خاص اہم ہے کہ اس کتاب میں صرف ایوب عباسی ہی ایک ایسا مرقع یا مضمون ہے جو رشید احمد

صدیقی کے قلم سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں نکلا ہے جس کا شمار اکابرین و عمائدین میں نہیں تھا۔ اس قسم کا دوسرا مرقع کندن مالی ہے۔ جس کو مصنف نے شفیق الرحمٰن قدوائی، مولانا سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالحق، نواب اسماعیل خان اور مولانا ابوالکلام آزاد (ہم نفسانِ رفتہ) کے پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے''۔16؎

خاکوں کے دو مجموعوں کے علاوہ ایک طویل خاکہ ہے۔ جو ذاکر حسین کی شخصیت پر ہے۔ جو ان کا لکھا ہوا طویل خاکہ ہے۔ ان دونوں میں اچھے مراسم رہے ہیں اور دونوں نے ایک ساتھ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی اور اس خاکے کو رشید احمد صدیقی نے جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی کے موقع پر شائع کیا تھا۔ تاکہ وہ اس خاکے کو ذاکر حسین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ اور اس وقت ذاکر حسین جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے لیکن رشید احمد صدیقی کے لیے وہ صرف ایک اچھے دوست تھے۔ یہ خاکہ ان کی شخصیت پر ذاکر حسین کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے متعارف کرواتا ہے۔ چنانچہ سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''میں یہاں سب سے پہلے رشید صدیقی کے مرقعے ذاکر صاحب کا ذکر کروں گا جو نہ صرف رشید صدیقی بلکہ ذاکر صاحب کی شخصیت پر بھی لکھا جانے والا طویل ترین مرقع ہے۔ رشید صدیقی اور ذاکر صاحب کا ساتھ 1915ء سے ہے۔ جب کہ رشید صدیقی ایم اے او کالج کے پہلے سال میں داخل ہوئے۔ ذاکر صاحب اس وقت صرف ذاکر حسین خان تھے۔ نہ ڈاکٹر نہ وائس چانسلر جامعہ ملیہ، نہ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، نہ گورنر بہار، نہ نائب صدر اور نہ صدر جمہوریہ ہند۔ رشید سدیقی نے ڈاکٹر صاحب کا یہ مرقع 1946ء میں جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ذاکر صاحب کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے شائع کیا۔ جب کہ ذاکر حسین ڈاکٹر بھی تھے۔ وائس چانسلر جامعہ ملیہ بھی''۔17؎

رشید احمد صدیقی کے مضامین کا مجموعہ خنداں ہے۔ جو ریڈیو پر پڑھنے کی غرض سے لکھے گئے تھے۔ اس میں شامل ان کے استاد کے مضمون کو خاکے کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ رشید احمد کی ابتدائی تصانیف میں شیخ نیازی بھی اہم ہے لیکن اسے محققین انشائیہ اور مزاحیہ خاکہ کے درمیان کی چیز کا درجہ دیتے ہیں۔ شیخ نیازی رشید احمد صدیقی کے چھوٹے بیٹے تھے۔ اس مجموعہ میں انھوں نے اپنے بیٹے کے شرارتوں کا بیان سادگی اور جذباتی وابستگی کے ساتھ کیا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کی گھریلو زندگی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد یسین ان کی اس تصنیف پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شیخ نیازی'' رشید صاحب کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔ مگر اس میں وہ تمام ادبی خصوصیات موجود ہیں جنھیں ہم ان سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دراصل لطیف انشائیے اور مزاحیہ خاکہ کے درمیان کی چیز ہے لیکن چوں کہ موضوع سخن خود ان کے خاندان کا ایک نونہال ہے لہٰذا بیان کا رنگ نکھر گیا ہے۔ شیخ نیازی کو پڑھنے سے ہماری نظروں کے سامنے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ایک اوسط درجہ کے فارغ البال خاندان کی گھریلو زندگی کا نقشہ پھر جاتا ہے''۔18؎

رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں کے لیے نہ صرف مشہور و معروف شخصیتوں ہی کو منتخب کیا ہے بلکہ غیر معروف شخصیتوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے خاکوں میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر کا خاکہ بھی ہے اور دوسری طرف اپنے کالج کے چپراسی کندن کا خاکہ بھی شامل ہے۔ اس خاکے کو اپنے تمام خاکوں کے برابر کا درجہ دیا ہے۔ اس سے ان کی غیر جانبداری کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اردو کی معروف شخصیات کے علاوہ بعض غیر معروف شخصیات پر بھی عمدہ خاکے لکھ کر ان کی شخصیات کو اردو ادب میں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے جتنے بھی اہم اور مسروف شخصیتوں کے خاکے قلم بلند کئے ہیں وہ صرف

ان کے دیر پا ملاقات اور جذباتی وابستگی کے بناء پر لکھے ہیں۔ ان کے خاکوں کی ایک اہم وجہ ان کا اسلوب ہے مثال کے طور پر انہوں نے اقبال کا جو خاکہ تصنیف کیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبال کوق کا تلفظ ادا کرنا نہیں آتا ہے۔ اور انہوں نے رشید احمد صدیقی سے جب بات کی تو انہیں حیرانی ہوئی کہ انہوں نے صدیقی کو صدیکی کہہ کر پکارا تھا اور اس بات کو بھی انہیں نے اس خاکے میں بیان کر دیئے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں بہت سے خوبیوں کے علاوہ دوایک خامیاں بھی موجود ہیں۔ ان کی سب سے اہم خامی ان کا علی گڑھ من ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے زیادہ تر خاکے بھی علی گڑھ سے رابتہ شخصیات کے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تمام تحریروں میں پر بھی علی گڑھ چھایا ہوا ہے۔ اس طرح سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں تھوڑی بہت کوتاہیوں کے باوجود تمام اوصاف دیکھنے کو ملتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے بعد خواجہ شفیع محمد دہلوی کے مضامین میں خاکے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ شفیع محمد دہلوی دہلی کے باشندے تھے ان کے مضامین کی تین تصانیف ہیں۔ مثلاً ''ہم اور وہ''، ''دلی کا سنبھالا'' اور'' دلی کی آوازیں'' ، ''ہم اور وہ'' میں غدر سے پہلے اور غدر کے بعد جو حالات تھے۔ ان حالات کو اس میں موضوع بنایا گیا ہے۔ اس غدر میں پہلے اور بعد کے حالات کا تقابلی جائزہ لیا گیا۔ جس کی وجہ سے اس مضمون میں اس وقت کی زندگی کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کی عمدہ عکاسی ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس تصنیف کی ایک اہم خصوصیت ان کی منظر نگاری ہے۔ اس میں منظر نگاری کے کچھ دلکش نمونے مل جاتے ہیں۔

شفیع دہلوی کی تصنیف ''دلی کا سنبھالا'' ہے جو 1938ء میں شائع ہوئی۔ اس کے لئے انہوں نے پرانی دلی کو موضوع ہے۔ جس کے ذریعے سے پرانی دلی کے حالات سے متعلق جانکاری حاصل

ہوتی ہے۔

اس تصنیف میں ان کی پہلی تصنیف ''ہم اور وہ'' کے مقابلے میں خاکے کی جھلکیاں کچھ زیادہ موجود ہیں۔اس مضمون میں انہوں نے ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والی سرسید، حالی، نذیر احمد، شاہ رفیع الدین وغیرہ کی شخصیات کی عمدہ عکاسی کی ہے تو دوسری طرف صاحبہ جیسی خاتون جو معمولی حیثیت رکھنے کے علاوہ غیر معمولی کردار کی حامل شخصیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔اس کتاب کے لکھنے میں ان کا ایک اہم مقصد پرانی دلی کا جیتا جاگتا نقشہ لوگوں کے سامنے پیش کردیں اور ساتھ ہی انہیں اپنی زبان کا دانی کا جوہر دکھانا بھی تھا۔ان دونوں مقاصد میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

''دلی کے سنبھالا'' میں افسانوی انداز نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ زندگی کا مختصر سا تذکرہ بھی موجود ہے مگر اشتیاق احمد ورک کا کہنا ہے کہ ان کو خاکوں کے زمروں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''محمد شفیع دہلوی کے ''دلی کا سنبھالا'' میں بھی افسانوی انداز میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔جن کو کھینچ تان کے بھی خاکے نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ یادیں یا تاثرات کہلائے سکتے ہیں''۔20

اشرف صبوحی نے خاکہ نگاری کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ ''دلی کی چند عجیب ہستیاں'' ہے اس مجموعے کو 1943ء میں شائع کیا گیا ہے۔اس میں انہوں نے ایسی شخصیات کو موضوع کے طور پر انتخاب کیا ہے کہ جن کی وجہ سے دلی کی تہذیب وتمدن کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔اس مجموعے میں کل چودہ (14) خاکے شامل ہیں۔اس مجموعے کے علاوہ اشرف صبوحی کے دو ایک خاکے رسائل میں بھی شائع ہو چکے ہیں مگر ان کی کتابی صورت منظر عام پر نہیں آئی ہے۔چنانچہ ڈاکٹر صابرہ سید لکھتی ہیں:

> ''خاکوں کی حد تک صرف ایک کتاب منظر عام پر آئی جو چودہ خاکوں پر مشتمل

ہے یہ '' دلی کی چند عجیب ہستیاں '' ہے۔اس کے علاوہ مزید چند خاکے متفرق رسائل میں منفرد حالت میں ملتے ہیں۔انہیں کتابی صورت میں اکٹھا نہیں کیا گیا ہے۔ وہ ہستیاں جن کے نقوش انہوں نے اجاگر کئے ہیں 1857ء کی مظلوم تحریک آزادی کے بعد کے زمانے کے کچھ لوگ ہیں۔ جو یادگار ماضی کے طور پر رہ گئے تھے وہ انہیں ان کی خصوصیات کے سبب پسندیدہ نظر سے دیکھتے تھے''۔21؎

عبدالماجد دریابادی نے بھی خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کیا ہے۔خاکہ نگاری کے میدان میں ان کا اہم کارنامہ ان کی تصنیف ''محمد علی'' ہے جو 1956ء میں شائع کیا گیا ہے۔اس کو بعض ناقدین نے ایک طویل خاکہ قرار دیا ہے۔اس مجموعے میں ،مہدی افادی، اکبرالہ آبادی ، اورشبلی نعمانی جیسی شخصیات کے خاکے پیش کئے گئے ہیں۔

شوکت تھانوی ایک اہم مزاح نگار ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ناول ، افسانہ، شاعری، خاکے، ڈرامے، اورمضامین میں بھی ایک خاص مقام حاصل کیا ہے۔ان کی 70 سے قریب تصانیف ہیں۔ان تصانیف میں تمام اصناف سے تعلق رکھنے والے تصانیف شامل ہیں۔

شوکت تھانوی کو مزاح نگاری کے علاوہ خاکہ نگاری میں بھی شہرت حاصل ہے۔ ان کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''شیش محل'' اور دوسرا '' قاعدہ بے قاعدہ'' ہے۔ان کے مضامین کا مجموعہ '' سرپنچ البم'' کے عنوان کے تحت ہے جس میں چند خاکے شامل ہیں۔اس کے علاوہ نورتن میں بھی تعارفی خاکے شامل ہیں۔اس میں صرف ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں ہی کے خاکے ہیں۔

شوکت تھانوی کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''شیش محل'' کو 1944ء میں شائع کیا گیا ہے۔اس مجموعے میں کل 112 شاعروں اورادیبوں کے خاکے شامل ہیں۔ جو ان کے ہم عمر اور ہم عصر ہیں۔ان

تمام سے ان کے تعلقات صرف مشاعروں کی حدتک محدود رہی ہیں جس کی وجہ سے ان شخصیات کے تمام پہلو سامنے نہیں آسکے۔اس کے لئے ان کے پاس مواد کی بھی کمی تھی۔ چنانچہ نامی انصاری اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شوکت تھانوی کی کتاب ''شیش محل'' میں 112 شاعروں اور ادیبوں کے خاکے شامل ہیں۔ ان میں سے بعض خاکے بہت مختصر ہیں اس لئے زیرنظر شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتے اور ان میں تنگی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ شخصیتوں کے بارے میں ان کا مشاہدہ صرف مشاعرے کی ملاقاتوں تک محدود ہے اس لیے ان کے خاکوں میں اچٹتے سے فقروں کے علاوہ شخصیت کے مطالعے کی سخت کمی محسوس ہوتی ہے۔تاہم میراجی پر ان کا خاکہ قدر اول کی چیز ہے جو میراجی کی وفات کے بعد نقوش لاہور میں 1935ء میں چھپا تھا''۔۲۲

شیش محل میں انہوں نے اپنے دوست واحباب اور ہم عصروں کو موضوع بنایا ہے۔ یہ خاکے دلچسپ ہونے کے علاوہ پرلطف بھی ہیں مگر ان خاکوں میں شخصیت کے تمام پہلوؤں کی عکاس وہ اپنی ظرافت نگاری کی وجہ سے وہ لوگوں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے شخصیت کی عکاسی پر توجہ نہیں دیتے۔اس خصوصیت کی بنا پر شیش محل کے خاکے شخصیتوں کی بھرپور عکاسی نہیں کر پاتے۔ چنانچہ شیش محل کی اس خصوصیت کے بارے میں سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

> ''شیش محل میں شوکت تھانوی نے اپنے بعض ہم عمروں اور دوست واحباب کے جو خاکے پیش کئے ہیں، وہ دلچسپ اور پرلطف ضرور ہیں۔لیکن ان میں سیرت کے مختلف رخوں کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کا فقدان نظر آتا ہے۔ ظرافت کی بہتات اور قہقہے لگانے کی عادت نے انہیں سنجیدہ غور وخوص سے بڑی حدتک بے نیاز کردیا ہے۔اس لیے ''شیش محل'' کے خاکے شخصیت کی حقیقی

تصویریں نہیں، کارٹون ہیں''۔۲۳؎

شوکت تھانوی کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ'' قاعدہ بے قاعدہ'' ہے۔ یہ 1956ء میں ادارہ فروغ اردو کے تحت شائع ہوا۔ اس مجموعے کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل خاکے نے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس مجموعے کے لئے انہوں نے مشہور ومعروف شعراء اور ادباء کو موضوع کے طور پر انتخاب کیا ہے۔ اس میں امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، صوفی تبسم، میراجی، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، منٹو، ضیا جالندھری، مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خان، غلام عباس ،فراق گورکھپوری کرشن چندر، مجنوں گورکھپوری، ن ۔م۔ راشد، وقار عظیم اور یاس یگانہ چنگیزی جیسی شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس مجموعہ میں خود شوکت تھانوی کا بھی خاکہ شامل ہے۔ مگر اس مجموعے کو وہ اتنی توجہ سے نہیں لکھ پائے جتنا کہ شیش محل یہی وجہ رہی ہوگی کہ اس مجموعے کو شیش محل کے مقابلے زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہو پائی۔ نورالحسن نقوی نے ''شیش محل کی مقبولیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' قاعدہ بے قاعدہ'' کے مقابلے میں شیش محل کے خاکے زیادہ مقبول ہوئے۔ دراصل یہ زیادہ توجہ سے لکھے گئے ہیں۔ اس لئے زیادہ جاندار اور دلچسپ ہیں''۔۲۴؎

رئیس احمد جعفری ایک ناول نگار اور صحافی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انہوں نے شخصیتوں کے دلچسپ خاکے بھی تصنیف کئے ہیں۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ'' دیدوشنید'' ہے۔ اس مجموعے کے لئے انہوں نے مذہبی رہنماؤں کو موضوع بنایا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ رئیس احمد جعفری نے ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کئے ہیں۔ سنے ویدوشنید کے بارے میں صابرہ سعید کا کہنا ہے کہ'' دیدوشنید'' کے خاکے، خاکے کے مقصد اور اصول پر پورے نہیں اترتے ان پر ناول نویسی کا انداز غالب صابرہ سعید کی اسی بات پر اکتفا کرتے ہوئے ڈاکٹر اشتیاق احمد درک نے اسی بات کو دہرایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''تقسیم سے قبل خاکہ نگاری کے میدان میں رئیس احمد جعفری کی '' دیدوشنید''
کواولیت حاصل ہے۔جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق لوگوں کے
بارے میں تاثراتی مضامین ہیں جس میں سوائے چندایک تحریروں کوکھینچ تان کر
خاکہ کی حدود میں لایا جاسکتا ہے''۔۲۵

فکرتونسوی بنیادی طور پرایک شاعر ہیں۔وہ آزادی سے پہلے تک نظم نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھےمگرآزادی کے بعدانہوں نے خاکہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔خاکہ نگاری کے میدان میں ان کاایک مجموعہ ''خدوخال'' کےعنوان سے 1955ءمیں شائع کیا گیا ہے۔

فکرتونسوی نے اپنی خاکہ نگاری کی ابتداء اشترا کی ادیب باری کے خاکے سے کیا ہے۔جو 1945ءمیں لکھا گیا تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے چنداور خاکےبھی تصنیف کئے ہیں مگر خاکہ نگاری کے میدان میں ان کوصرف '' خدوخال'' کے مصنف کے حیثیت سے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔'' خدوخال''میں مکمل نو خاکے شامل ہیں۔اس کے لئے انہوں نے اپنے دوست واحباب کو موضوع بنایاہے،انہوں نے اپنے خاکوں میں خوبیوں اور خامیوں دونوں کابڑی عمدگی سے کیا ہے۔

''خدوخال''میں احمد ندیم قاسمی، کنھیالال کپور، بلونت سنگھ،مخمور جالندھری،ساحرلدھیانوی اورعبدالمتین عارف جیسی شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔اس کے علاوہ اس مجموعے میں فکرتونسوی کا خاکہ بھی موجود ہے۔

فکرتونسوی جس زمانے میں''خدوخال'' تصنیف کررہے تھے۔اس وقت ترقی پسندتحریک اپنے عروج پرتھی انہوں نے اس تحریک سے وابستہ ادیبوں کے خاکےبھی تصنیف کئے ہیں۔یہی نہیں بلکہ وہ خودبھی ترقی پسندتحریک سے وابستہ رہے ہیں۔چنانچہ پروفیسرنورالحسینقوی لکھتے ہیں:

''فکرتونسوی نے'خدوخال' کے نام سے 1950ءمیں چودہ خاکوں کا
مجموعہ پیش کیا۔فکرتونسوی خودبھی ترقی پسندتحریک سے منسلک تھے ہیں اور

جن شخصیتوں کے خاکے انہوں نے لکھے ان میں سے بیشتر کا ترقی پسند
تحریک سے تعلق رہا ہے''۔۲۶

سعادت حسن منٹو کو مشہور افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو دنیا جانی جاتی ہے۔ مگر انہوں نے افسانہ اور ڈرامہ کے علاوہ خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے خاکوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''گنجے فرشتے'' ہے۔ جو 1952ء میں شائع ہوا، ان کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ 'لاؤڈ اسپیکر' ہے۔ جو 1955ء میں اور تیسرا مجموعہ 'قلمی شخصیتیں' 1956ء میں شائع ہوا۔

''گنجے فرشتے'' سعادت حسن منٹو کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کل بارہ خاکے ہیں۔ اس میں آغا حشر کاشمیری، اختر شیرانی، میراں جی، عصمت چغتائی، منٹو کے دوست شیام کا خاکہ، نسیم بانو، نرگس اور اشوک کمار وغیرہ کے خاکے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فلمی دنیا کا ایک مزاحیہ کردار 'کشت زعفران' کا خاکہ بھی تصنیف کیا ہے اس مجموعے میں خود منٹو کا خاکہ بھی شاملہے جو بہت دلچسپ بھی ہے۔

منٹو کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ 'لاؤڈ اسپیکر' ہے یہ دس خاکوں پر مشتمل ہے اس کا پہلا خاکہ دہلی سے نکلنے والا اخبار ریاست کے ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتون کا ہے۔ اس مجموعے میں نور جہاں، نواب کاشمیری، مولانا چراغ حسن حسرت اور رفیض غزنوی وغیرہ کے خاکے شامل ہیں۔ چنانچہ منٹو کی خاکہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ہمایوں اشرف لکھتے ہیں:

''منٹو اردو کا منفرد اور بے مثال خاکہ نگار ہے جس کی تحریریں جب تک اردو
ادب میں باقی رہیں گی، خاکہ اردو ادب کی ایک مقبول صنف بنا رہے گا۔ اس
کے خاکوں کے دو مجموعے 'گنجے فرشتے' اور 'لاؤڈ اسپیکر' کے نام سے شائع
ہو چکے ہیں۔ منٹو کے خاکے بھی اس کی دوسری تخلیقات کی طرح اس کی کتاب

زندگی کے وہ بکھرے پنّے ہیں جس میں اس کی ذات سب سے نمایاں اور غالب ہے''۔۲۷

عصمت چغتائی کا نام بھی خاکہ نگاروں میں لیا جاتا ہے۔ ان کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انکے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''دوزخی'' ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت اور ان کی عادات واطوار پر روشنی ڈالی گئی ہے، عصمت چغتائی ہی کا نہیں بلکہ اردو ادب کا شاہکار رہے خاکہ تسلیم کیا جاتا ہے ۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس خاکے کو اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربات کی روشنی میں لکھا ہے۔ انہوں نے اپنے بھائی پر جس طرح کا تبصرہ کیا ہے کہ اس کی وجہ سے بعض لوگوں کو بے رحم معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ اردو میں اس رنگ کی پہلی کامیاب کوشش ہے۔ دوزخی کے بارے میں نامی انصاری لکھتے ہیں:

''دوزخی عصمت چغتائی کے اپنے سگے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ ہے۔ جوان کے ءوفات کے بعد لکھا گیا۔ اس خاکے میں طنز کی نشتریت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ مگر اس میں انسانی ہمدردی کی اسی توان زیریں لہر برابر موجود رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ خاکہ اپنے بے پناہ نشتریت کے باوجود غیر متوازن نہیں ہونے پاتا اور اسی سے مصنفہ کا کمال فن ظاہر ہوتا ہے''۔۲۸

دوزخی میں عصمت چغتائی نے اپنے بھائی کے بعض چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں عظیم بیگ چغتائی کی پوری زندگی اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ خامیوں کے بیان میں انہوں نے ایسا انداز کو اختیار کیا ہے کہ جس سے قاری کو نفرت کے بجائے ایک ہمدردی سی ہو جاتی ہے۔ اس میں نہایت سادہ اور عام فہم زبان استعمال ہوئیہے ۔

عصمت چغتائی نے ''دوزخی'' کے علاوہ اور بھی خاکے تحریر کئے ہیں ان میں مجاز کے علاوہ منٹو لکھا ہے، خواجہ عباس پر بھی خاکہ لکھا ہے، انہوں نے تقریباً 8 خاکے ہیں جن خاکوں میں سے ایک

خاکہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔ سات خاکے شائع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ محمد اشرف لکھتے ہیں:

''عصمت نے خاکے بھی تحریر کئے ہیں جو خاکہ نگاری کے میدان میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور عوام وخواص میں بے حد مقبول ہیں۔ ''دوزخی'' جو عصمت کا پہلا خاکہ ہے جس کا شمار اردو کے شاہکار خاکوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مجاز سے متعلق کئی خاکے بھی لکھے ہیں۔ ''اسرارالحق''، ''عشق مجازی''، ''اور وہ'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں علاوہ ازیں ''منٹو میرا دوست میرا دشمن''، ''خواجہ احمد عباس''، ''چراغ روشن ہیں''، ''خوابوں کا شہزادہ'' اور کچھ میری یادیں'' قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک خاکہ مصروف شاعر ونغمہ نگار، جاں نثار اختر'' پر بھی قلم بند کیا تھا لیکن راقم السطور کو یہ خاکہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ اس طرح عصمت نے کل آٹھ خاکے لکھے ہیں جن میں سے سات خاکے دستیاب ہوئے ہیں''۔ ۲۹

عصمت کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''آہنگ'' ہے۔ اس مجموعے میں مجاز کے تین خاکے شامل ہیں۔ وہ اسرارالحق، عشق مجازی، ''اور وہ'' وغیرہ ہیں۔ ان خاکوں میں مجاز کی شاعری کے علاوہ ان کی محبت کی ناکامی کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور مجاز کے ساتھ عصمت چغتائی کی تین ملاقاتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

عصمت چغتائی نے منٹو پر بھی خاکہ 'منٹو میرا دوست میرا دشمن'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ جو ایک عمدہ خاکہ ہے۔ اس میں ان کے نجی حالات کے ساتھ ساتھ ان کی شادی بیاہ، بیماری، محبت اور زندگی سے متعلق ان کے نظریات ومعلومات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس خاکے میں منٹو کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہوجاتی ہے۔

حکمت نے ''خواجہ احمد عباس'' پر بھی خاکہ لکھا ہے جو کی شخصیت سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ ان کو خواجہ احمد عباس کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کا یہ خاکہ حقیقت سے قریب

دکھائی دیتا ہے۔اس میں ان کی حلیہ نگاری کے علاوہ اس خاکے میں زندگی کی واضح جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

''چراغ روشن''اور کرشن چندر پر لکھا ہوا خاکہ ہے۔اس میں ان سے پہلی ملاقات کے ساتھ ان کی گھریلو زندگی،ان کی پہلی اور،دوسری بیوی کے بارے میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

''خوابوں کا شہزادہ''سجاد ظہیر پر لکھا ہوا خاکہ ہے۔اس میں ان سے پہلی ملاقات کے علاوہ سے لےکر ان کی عادات واطوار،سیرت وکردار وغیرہ کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

''کچھ میری یادیں''پروفیسر احمد شاہ بخاری کا خاکہ ہے۔اس خاکے کو زیادہ تر ادیبوں نے پطرس بخاری اور عصمت چغتائی کا ملاقاتی مضمون کہا ہے مگر عصمت نے اس ملاقاتی مضمون کو خاکہ قرار دیا ہے۔

محمد طفیل کو بھی خاکہ نگاری میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ان کے خاکوں کے سات مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ان خاکوں میں اردو ادب کے مشہور ومعروف ادیبوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان خاکوں کے تعلق سے چند سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں مثلاً وہ خاکے ہیں یا بیانے ہیں،یا تذکرے ہیں،یا یادداشتیں ہیں۔ان سوالات کا جواب وہ اس طرح دیتے ہیں کہ''یہ صرف تمام شعراء و ادباء سے ان کے تعلقات وملاقاتوں کی داستانیں ہیں''۔کیونکہ محمد طفیل اردو کے مشہور مجلّے 'نقوش' کے مدیر تھے اور انہیں تقریباً تمام ادیبوں سے رابطہ رہا ہے۔اس طرح ان ملاقاتوں کو انہوں نے خاکوں کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔

محمد طفیل کے خاکوں کا پہلا مجموعہ''صاحب''ہے اس کو 1955ء میں ادارہ فروغ اردو لاہور نے شائع کیا تھا۔اس مجموعے میں منٹو،ندیم،شوکت تھانوی،جگر مرادآبادی،عابد علی عابد اور احسان دانش وغیرہ جیسی شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔

محمد طفل کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''جناب'' ہے۔ جو 1956ء میں شائع ہوا۔اس میں 22 خاکے شامل ہیں۔ اس میں شامل تمام خاکے ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے ہیں۔ اپنی اس کتاب کے تعلق سے وہ خود رقم طراز ہیں کہ ''یہ کوئی غیر فانی اور زندہ رہنے والی کتاب نہیں مگر اس میں کچھ غیر فانی شخصیتوں کے بارے میں میرے تاثرات ہیں میری یہ کوشش ادنی طرز نگارش یا شخصی مطالعہ کے بجائے ان شخصیتوں کی وجہ سے زندہ رہے گی جن پر میں نے قلم اٹھایا''۔ان کے اس بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مجموعہ صرف اس میں موجود شخصیات ہی کہ بدولت اردو ادب میں زندہ رہ جائے گی۔ اس تصنیف کے بارے میں کرشن چندر نے کہا کہ ''یہ کتاب لکڑیوں کے گٹھے کے مانند ہے اور اس میں ہر طرح کی لکڑی شامل ہیں''۔

محمد طفیل کے خاکوں کا مجموعہ آپ ہے۔ جو 1967ء میں شائع ہوا۔اس میں کل پانچ خاکے شامل ہیں اس کے علاوہ ''مکرم'' ان کے خاکوں کا آخری مجموعہ ہے۔

دیوان سکھ مفتوں نے بھی خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی ایک تصنیف ''نا قابل فراموش'' کے عنوان سے ہے۔ یہ ان کے خاکوں کا مجموعہ نہیں ہے۔مگر اس میں چند خاکے بھی ملتے ہیں جو خاکے کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔صابرہ سعید اس سلسلے میں لکھتی ہیں:

> ''دیوان سنگھ مفتوں نے اپنی کتاب'' نا قابل فراموش'' خاکہ نگاری کے مقصد سے نہیں لکھی تھی لیکن اس میں جگہ جگہ مختلف شخصیتوں کے خاکے ملتے ہیں۔ یہ خاکے اتنے دلچسپ اور بھرپور ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔انہوں نے ہر شخصیت کو جیسا دیکھا اور پایا ویسے ہی پیش کر دیا ہے''۔30

اعجاز حسین نے بھی خاکے تصنیف کئے ہیں۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ '' ملک ادب کے شہزادے'' ہے۔اس کو 1954ء میں شائع کیا گیا ہے۔اس مجموعے میں جملہ 44 شاعروں کے خاکے شامل ہیں۔

ان خاکوں میں خاکہ نگاری کے تمام فنی لوازم موجود ہیں ۔اس مجموعے میں انہوں نے شخصیت کے نفسیاتی عوامل کو بھی پیش کیا ہے۔اس میں مصنف نے نفسیات سے ناواقفیت کے باوجود ان پر نظر رکھی ہے۔یہی چیز ان خاکوں میں کمی کے طرز پر نظر آتی ہے۔

چراغ حسن حسرت کے خاکوں کا مجموعہ ’’مردم دیدہ‘‘ ہے۔اس مجموعے میں مولانا آزاد کے خاکے کو اہم مقام حاصل ہے ۔نمکین کاظمی نے بھی چند خاکے تصنیف کئے ہیں۔انہوں نے حیدرآباد کے علمی وادبی شخصیتوں کے خاکے تصنفی کئے ہیں۔’’نقوش‘‘ کے شخصیات نمبر میں بھی ان کے خاکے شامل ہیں۔

مالک رام غالبیات میں ماہر ہونے کے علاوہ مشہور محقق بھی ہیں۔اورانہوں نے خاکہ نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے اچھے 6 خاکے ملتے ہیں۔ان کے خاکے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ خاکہ نگاری کے میدان میں ان کی دو تصانیف منظرعام پر آچکی ہیں۔وہ ’’تذکرہ معاصرین‘‘ اور ’’وہ صورتیں۔۔۔الہٰی‘‘۔ ہیں۔

’’تذکرہ معاصرین‘‘ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔اس میں کئی ادیبوں کے خاکے شامل ہیں۔ ان میں ادیبوں کے حالات زندگی کے علاوہ ان کے کلام کے کچھ نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ان کی دوسری تصنیف ’’وہ صورتیں۔۔۔الہٰی‘‘ یہ خاکوں کی شکل میں لکھے ہوئے مضامین ہیں۔

عبدالمجید سالک کو بھی خاکہ نگاری میں اہم مقام حاصل ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ’’یارانِ کہن‘‘ ہے۔اس کی اشاعت 1955ء میں عمل میں آئی،اس مجموعے کو انہوں نے آغا شورش کاشمیری کی فرمائش پر لکھا ہے۔اس مجموعے میں بیس خاکے شامل ہیں۔اس میں شامل تمام شخصیات کو انہوں نے اپنی دیرپا ملاقات کے بناء پر تصنیف کیا ہے۔کیونکہ انہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔اس تحریک کے تحت ان کی سیاسی ،ادبی اور صحافتی دنیا سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں سے ملاقات رہی ہے۔

انہیں ملاقات کے ذریعے ان شخصیات کو نزدیک سے پرکھنے کا انھیں موقع ملا تھا۔ انہیں یادوں کو انھوں نے اس مجموعے میں پیش کر دیا ہے۔

''بارانِ کہن'' کی خاص خصوصیت اس کا اسلوب ہے۔ اس اسلوب کے ذریعے انہوں نے شخصیتوں کے نئے گوشوں کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا احمد سعید وغیرہ اہم ہیں۔ خاکوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں ان کے معاصرانہ چشمت کا بھی ذکر بھی موجود ہے۔ چنانچہ اشتیاق احمد ورک لکھتے ہیں:

> ''چند شخصیات کے حوالے سے کچھ اضافے بھی ہیں، مثال کے طور پر سر شہاب الدین، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا احمد سید وغیرہ کی شخصیات۔ ان تذکروں میں رکھ رکھاؤ اور شخصیات کا احترام موجود ہے۔ صرف اپنے بعض ہم عصر صحافیوں اور ادیبوں کے تذکرے میں کہیں کہیں عصرانہ چشمک کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جس کی ایک وجہ سالک صاحب کی تتلی بھی ہو سکتی ہے۔ جس کا وہ اپنی تحریروں میں گاہے بہ گاہے استعمال کرتے رہتے ہیں''۔31

اخلاق احمد دہلوی نے بھی خاکہ نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ ''جو قبل ازیں'' اور ''پھر بیان اپنا'' ہیں۔ ''پھر بیان اپنا'' پہلی بار 1957ء میں شائع کیا گیا۔ اس مجموعے میں شامل بعض خاکوں میں کچھ تبدیلیاں پیش کر کے 1979ء میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کا نام ''پھر بیان اپنا'' ''پھر وہی بیان اپنا'' کے نام سے تبدیل کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں میراجی کے تین خاکے شامل ہیں۔

1960ء کے بعد ٹملناڈو میں دانش فرازی نے خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے دوسروں سے بھی خاکے لکھوائے ہیں۔ ان میں ریاض نیلوری نے رشید احمد صدیقی کا خاکہ تصنیف

کئے اور پروفیسر سید عبدالوہاب بخاری نے پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری کی شخصیت پر خاکہ لکھا ہے۔ اور یہ خاکے 1965ء میں بنگلور کے سالار کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوئے ہیں ان کے علاوہ آذر بیانی نے بھی خاکے تصنیف کئے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سید سجاد حسین لکھتے ہیں:

> 1960ء کے بعد ٹملناڈو میں اس صنف کی طرف دانش فرازی نے یہاں کے اہل قلم کو توجہ دلائی۔ اسی ترغیب کے نتیجے میں ریاض نیلوری نے رشید احمد صدیقی، پروفیسر سید عبدالوہاب بخاری اور پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری کی شخصیت پر تفصیلی خاکے لکھے اور یہ خاکے 1965ء میں سالار بنگلور کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوئے۔ اسی طرح آذر بیانی سے جو خاکے دانش فرازی نے لکھوائے تھے ان کا تعلق اساتذہ اردو پروفیسر حیدر علی خاں اور رحیم احمد فاروقی سے تھا۔ 1967ء میں ان خاکوں کو دانش فرازی نے اپنے ہفت روزہ ''ہم سفر'' کی زینت بنایا''۔ 32

اس سے پتہ چلتا ہے کہ دانش فرازی نے خود بھی خاکہ نگاری کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دوسروں سے خاکے لکھوانے میں بھی کامیاب ہوئے ان کے علاوہ ڈاکٹر عابد صفی نے بھی خاکے تصنیف کیئے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں اور ان کے خاکوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کا ادبی معیار بھی بلند ہے۔ اس لئے ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان کے خاکوں میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق، پروفیسر حیدر علی خان، پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی، رفعت ملک، مسرت سہروردی، انور ربانی، ایس۔ ایم حیات، اعلیٰ حضرت ویلور اور یعقوب اسلم عمری وغیرہ کے خاکے شامل ہیں۔

ضیاء الدین احمد برنی کو بھی خاکہ نگاری کے میدان میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''عظمت رفتہ'' ہے۔ اس مجموعے کو 1961ء میں کراچی سے شائع کیا گیا۔ اس مجموعے کے

میں انہوں نے اپنے زمانے کی مشہور و معروف شخصیات جیسے ادیب، شاعر، صحافی، گورنر، ڈاکٹر، مقرر، ہم عصر، مترجم، تاجر، مجسٹریٹ، واعظ اور استاد وغیرہ شخصیتوں کو موضوع بنایا ہے اس مجموعے کی خصوصیت کے تعلق سے ڈاکٹر صابرہ سعید کا کہنا ہے کہ ''اس میں صرف خوبیوں ہی سے سروکار رکھا گیا ہے، تاکہ موجودہ اور آنے والی نسلیں اثر پذیر ہوں''۔

''عظمت رفتہ'' میں شامل خاکوں سے انہیں برسوں تک تعلقات رہے ہیں اس کے برخلاف کچھ ایسی شخصیات ہیں جن سے صرف دو ایک ملاقات ہوئی ہے۔ جن لوگوں سے ان کی بات چیت نہیں ہوئی ہے ان کا ذکر ضیاء الدین احمد برنی نے اس مجموعے میں نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صابرہ سید لکھتی ہیں:

> ''یہ صرف یادیں ہیں۔ ان میں بہت سی شخصیتوں سے برنی صاحب کے برسوں تک تعلقات رہے۔ بعض سے صرف ایک دفعہ ہی ملاقات ہوئی۔ بعض سے صرف چند ملاقاتیں لیکن ان تمام شخصیتوں میں سے دو شخصیتیں ایسی ہیں جن سے ایک دفعہ بھی بات چیت نہیں ہوئی۔ یہ کون ہیں۔ کیا ہیں۔ اس کا تذکرہ انہوں نے نہیں کیا۔ یہ سب یادیں ان کی زندگی کی ''متاع عزیز'' ہیں۔ جن کو عظمت رفتہ کے نام سے پیش کردیا ہے۔ ان شخصیتوں پر قلم اٹھاتے وقت برنی صاحب نے کسی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کے میں نے زیادہ تر اپنے موڈ پر اعتماد کیا ہے۔ مجھے اس بے ترتیبی میں بھی ترتیبی کی ایک شان نظر آتی ہے''۔33

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مجموعے میں انہوں نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے ان میں کچھ لوگوں سے دیرینہ تعلقات رہے ہیں اور کچھ لوگوں سے بہت کم ملاقاتیں ہوئی ہیں اور لکھتے وقت انہوں نے کسی بھی طرح کی ترتیب کو نہیں برتا ہے بلکہ جیسا ان کا موڈ تھا ایسا ہی لکھتے چلے گئے۔ اس

مجموعے میں جن شخصیتوں پر صرف سرسری طور پر لکھا ہے ان میں شبلؔی، حالؔی، نذیر احمد، ذکاءاللہ، اقبالؔ، محمد علی، اور سید سلیمان ندوی وغیرہ شامل ہیں۔ اس تصنیف کے ذریعے ان لوگوں کی مدد ہوگی جو اردو کی تاریخ مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان خاکوں میں خاکہ نگاری کی تمام خصوصیات جیسے حلیہ، عادات واطوار، لباس، منظر نگاری، سیرت کی جھلکیاں وغیرہ موجود ہیں جس کی وجہ سے ان خاکوں میں جان پڑ گئی ہے۔

شاہد احمد دہلوی خود ایک ادیب ہونے کے علاوہ وہ ایک ادیب کے بیٹے اور ایک ادیب کے پوتے بھی ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں ''ادیب ابنِ ادیب ابنِ ادیب'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے والد بشیر احمد دہلوی اور دادا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی ہیں۔ دادا اور پوتے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اردو کا پہلا خاکہ ڈاکٹر نذیر احمد پر لکھا گیا ہے اور خود شاہد احمد دہلوی بھی ایک خاکہ نگار ہیں۔ اس طرح سے ان دونوں کا نام خاکہ نگاری کے سلسلے میں اہم ہے۔ چنانچہ پر پروفیسر نور الحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''شاہد احمد دہلوی خود ایک ادیب تھے، ادیب کے بیٹے اور ادیب ہی کے پوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ''ادیب ابن ادیب ابن ادیب'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے والد بشیر احمد دہلوی اور دادا معروف ادیب ڈپٹی نذیر احمد دہلوی تھے۔ ماہنامہ ''ساقی'' اور خاکہ نگاری ان کی وجہ شہرت ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ دادا پوتا دونوں اردو خاکے کے استحکام اور نیک نامی کا سبب بنے۔ دادا کے اوپر اردو کا سب سے پہلا خاکہ لکھا گیا اور پوتے نے خود لوگوں کے خاکے لکھے''۔ 34

شاہد احمد دہلوی کا پہلا خاکہ ''اجڑا دیار'' ہے۔ جس میں شہجانی دیگ کی کرچن کے خاکے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ان کے اسلوب کا خاص عکس ملتا ہے۔ ان کے خاکوں کے مجموعے بھی منظر عام پر

آ چکے ہیں۔

ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''گنجینہ گوہر'' ہے۔ یہ 1962ء میں شائع ہوا۔اس میں جملہ سترہ خاکے شامل ہیں۔اس مجموعے میں سولہ خاکے ادیب و دوست واجباب کے ہیں ایک خاکہ خود شاہد احمد دہلوی کا بھی ہے۔اس میں انہوں نے اپنے آباءواجداد کے دوخاکے پیش کئے ہیں۔اس کے علاوہ خواجہ حسن نظامی، بےخود دہلوی مولوی عنایت اللہ اور خواجہ ناصر جیسے بزرگوں کے خاکے بھی شامل ہیں۔ان کے ساتھ ساتھ عظیم بیگ چغتائی ،جگر مرادآبادی ۔ایم اسلم کیف دہلوی ،مرزا محمد سعید، میراجی ،منٹو، جوش، اور جمیل جالبی جیسے ہم عصروں کے خاکے بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ایک موسیقار ہندوخان کا خاکہ بھی موجود ہے۔اس مجموعے کی خاص صفت اس کا اسلوب ہے۔اس مجموعے میں انہوں نے دلی کی ٹکسالی زبان کا استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ دِلی کی تہذیب کو بھی اس تصنیف میں شامل کردیا گیا ہے۔

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا آخری مجموعہ ''بزم خوش نفساں'' ہیں۔اس مجموعے کو شاہد احمد دہلوی کے انتقال کے بعد ڈاکٹر جمیل نظامی نے مرتب کرکے 1985ء میں شائع کیا ہے۔ یہ تصنیف چھبیس خاکوں پر مشتمل ہے۔ان کے خاکوں میں حلیہ نگاری کے ساتھ ساتھ واقعہ نگاری بھی موجود ہے۔ وہ معمولی سے واقعہ کو بھی پراثر انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس مخصوص فرد کی زندگی اور شخصیت ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

علی جواد زیدی ایک شاعر اور نقاد کی حیثیت سے مشہور ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''آپ سے ملیے ہے'' اور یہ مجموعہ 1968ء میں شائع ہوا۔اس میں جملہ چودہ تعارفی خاکے موجود ہیں۔اس میں شاعر،نقاد،محقق،افسانہ نگار،صحافی ،مزاح نگار اور طنز نگار ہے۔ادبی شخصیتوں کے خاکے موجود ہیں۔ان خاکوں کے لکھنے کا ایک خاص

مقصد ادبی شخصیتوں کا دنیا کو متعارف کروانا تھا۔ اس مجموعے میں اردو ادب کے علاوہ ہندی ادب کے مشہور ادیب بھگوتی ادا چرن واما کے خاکے بھی موجود ہیں۔ ہندی ادیب کے خاکے پہلے ہندی میں لکھے گئے بعد میں ان کو اردو میں لکھا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> ''پہلا خاکہ بھگوتی چرن وام پر ہے۔ جو ہندی کے مشہور شاعر، ناول نویس اور ماضی ہیں۔ یہ خاکہ سب سے پہلے ہندی میں لکھا گیا تھا۔ بعد میں اردو داں طبقے کو بھگوتی چرن ورما سے متعارف کرانے کے لئے اردو میں بھی لکھا گیا۔ اردو میں یہ خاکہ پسند کیا گیا۔ اس کی مقبولیت اور فرحت اللہ انصاری صاحب کے اصرار نے زیدی صاحب سے اور بھی اس قسم کے خاکے لکھوائے جو ''نیا دور'' میں شائع ہوتے رہے، مدیر معارف مولانا معین الدین ندوی صاحب اثر لکھنوی اور علامہ نیاز فتح پوری وغیرہ کی فرمائش پر بھی کچھ خاکے وجود میں آئے۔ ان تمام خاکوں میں مشاہیر سے ملاقات کے بعد زید صاحب نے جو تاثر قبول کیا ہے اسے صفحہ قرطاس پر پیش کر دیا''۔35

اس مجموعے میں انہوں نے شخصیات کی صحافتی، سیاسی، علمی اور قومی زندگی ہی نہیں بلکہ ان کی خانگی زندگی سے متعلق واقعات کو بھی پیش کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر خاکے میں ادیب کے کلام کو بھی سرسری طور پر پیش کیا گیا ہے۔

عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی ایک مزاج نگاری کی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے خاکہ نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''پوسٹ مارٹم'' ہے اس میں کل ۱۲ طنزیہ و مزاحیہ خاکے شامل ہیں۔

معین الدین درانی نے بھی خاکے تصنیف کئے ہیں۔ ان کے خاکوں کا مختصر سا مجموعہ ہے جس کا نام ''جلوسے'' ہے۔ اس کو ادارہ فروغ اردو نے شائع کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں شخصیت کی

خوبیوں اور خامیوں کو بیان کرنے کے بجائے شخصیتوں کی نکتہ چینی کی ہے۔

الطاف حسین قریشی نے بھی خاکے تصنیف کئے ہیں۔ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔جس کا نام ''ملاقاتیں'' ہے اس کو 1963ء میں شائع کیا گیا ہے۔اس مجموعے میں مکمل سولہ شخصیتوں کے خاکے شامل ہیں۔ان خاکوں کو مصنف نے اپنے ملاقاتوں کو مدنظر رکھ کر تصنیف کیا ہے۔اس کے علاوہ اس مجموعے میں شخصیتوں کی زندگی کے نشیب وفراز کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> ''الطاف حسین قریشی کی کتاب ملاقاتیں ''1963ء'' میں شائع ہوئی جس میں ملک کے عظیم سولہ شخصیتوں سے ملاقاتوں کی روداد ہے جس میں زندگی کے نشیب وفراز بھی ہیں اور مسائل کے پیچ وخم بھی۔ جسے پڑھ کر فکر اور خیال میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب خاکے شخصیتوں کے تجربات و احساسات کا مجموعہ ہیں''۔36

ان کے خاکوں میں انہوں نے ادیب صحافی، شاعر، فلسفی، معلم، حکیم، وکیل، سیاست دان، قانون ساز، ماہرین اقتصادیات، عدلیہ وانتظامیہ کے اعلیٰ ارکان اور سفیر کو موضوع بنایا ہے۔اس تصنیف کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ ان خاکوں کے ذریعے زندگی کے اہم مسائل سے متعلق ان شخصیتوں کے نقطہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

یوسف ناظم کی پہچان عام طور پر ایک مضمون نگار کی ہے۔مگر ان کی تصانیف میں دو خاکوں کے مجموعے بھی شامل ہیں۔ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''سائے ہمسائے'' ہے۔ جو 1993ء میں شائع ہوا تھا۔اوران کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''ذکر خیر'' ہے۔ یہ تصنیف 1981ء میں منظر پر آئی۔ان خاکوں کو مصنف نے شگفتہ انداز میں لکھا ہے۔

''ذکر خیر'' میں شامل خاکوں میں ناقدین نے ظ۔انصاری کے خاکے کو سب سے اچھا خاکہ

قرار دیا ہے کیونکہ شخصیت کے بیان میں انہوں نے غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں شخصیات کی صفات کے علاوہ ان کے خدوخال پر زیادہ توجہ دیا ہے۔ ان خاکوں کو پڑھنے سے قاری کو شخصیت کی تصویر کو محسوس کر سکتے ہیں لہٰذا پروفیسر جامیک انصاری لکھتے ہیں:

''یوسف ناظم نے بھی کچھ دلچسپ مزاحیہ خاکے لکھے ہیں جو ان کی کتاب ''ذکر خیر'' مطبوعہ 1982ء میں شامل ہیں۔ یوسف ناظم عموماً زیر تبصرہ شخصیت کے سامنے کے ''خدوخال'' پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ نفسیاتی درون بینی سے ان کو کچھ زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ البتہ ان کے خاکے پڑھ کر قاری کے ذہن میں ممدوح کی ایک واضح تصویر ضرور بن جاتی ہے''۔ 37

رحیم گل بھی خاکہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی خاکہ نگاری کی شروعات ''عم عمارہ'' کے خاکے سے ہوا۔ اس خاکے کو خود انہیں کی فرمائیش پر لکھا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ ''پورٹریٹ'' اور ''خدوخال'' ہیں۔

رحیم گل کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''' پورٹریٹ'' ہے۔ یہ 1980ء میں شائع ہوا۔ اس میں مجموعے میں وہ اپنے دوستوں کو بھی موضوع بناتے ہیں۔

رحیم گل کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''خدوخال'' ہے۔ اس میں اکیس خاکے شامل ہیں۔ جس میں ادیبوں کے علاوہ ٹی ہاؤس کا بھی خاکہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کا اپنا خود کا خاکہ بھی موجود ہے۔ جس کے لئے انہوں نے اپنے بچپن کے دلچسپ واقعات کا انتخاب کیا ہے۔ چنانچہ اشتیاق احمد ورک لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں اکیس شعراء وادباء کے ساتھ ساتھ رحیم گل نے ٹی ہاؤس کا بھی بڑا خوب صورت خاکہ بھی لکھا ہے اس میں ایک ان کا اپنا خاکہ بھی ہے جو اصل میں بچپن کے چند دلچسپ واقعات پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے تقریباً تمام

خاکے بہت اچھے ہیں۔ خاص طور پر ٹی ہاؤس، کرنل غلام سرور، عبداللہ قریشی، انتظار حسین، حبیب جالب، اطہر جاوید، احمد سعید، اور گلزار و وفا چوہدری کے خاکے نہایت جاندار ہیں''۔38؎

مجتبیٰ حسین ایک اہم مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کالم نگاری سے کیا ہے۔

انہوں نے روزنامہ سیاست میں کالم نگاری ''کوہ پیما'' کے فرضی سے لکھا کرتے تھے اوران کی مضمون نگاری کا آغاز 1967ء میں ہوا۔ کچھ عرصے ہی میں انہوں نے اردو طنز و مزاح میں اپنا ایک الگ مقام بنالیا۔

مجتبیٰ حسین نے مزاح نگاری کے علاوہ خاکہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی۔ انہوں نے اپنی خاکہ نگاری کی شروعات حکیم یوسف خان کے خاکے سے کی تھی۔ یہ خاکہ 1969ء میں حکیم یوسف خان کی تصنیف ''خواب زلیخہ'' کی اشاعت کے وقت پرخود انہیں کے فرمائش پر لکھا تھا۔ مجتبیٰ حسین کے خاکہ کی ابتدا کے تعلق سے وہ ''خودآدمی نامہ'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے پہلا خاکہ 1969ء میں اپنے بزرگ دوست کلیم یوسف حسین خان کا لکھا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ خدا انہیں کروٹ جنت نصیب کرے۔ مرحوم کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ کئی خوبیوں کی ایک خوبی ان میں یہ تھی کہ اپنے میں کم اور دوسروں میں زیادہ خوبیاں تلاش کرتے تھے۔ جب ان کی کتاب، خواب زلیخا کی تقریب رونمائی کا مرحلہ آیا تو نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ مجھ سے اپنا خاکہ لکھنے کی فرمائش کر بیٹھے۔ اس وقت تک میں نے مزاحیہ مضامین ہی لکھے تھے۔ کسی کا خاکہ نہیں لکھا تھا۔ بہت عذر پیش کئے۔ پہلے تو اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا حوالہ دیا۔ یہ عذر قابل قبول نہ ہوا تو عمر کے اس فرق کا حوالہ دیا۔ جو میرے اوران کے بیچ حائل تھا۔ اس پر بھی وہ مصر رہے کہ مجھے خاکہ لکھنا

ہی ہوگا۔ یہ پہلا خاکہ تھا جسے سامعین اور صاحب خاکہ دونوں نے پسند فرمایا تھا۔
اب بھی ایک لحاظ سے یہ پہلا خاکہ ہی ہے''۔39ؔ

مجتبیٰ حسین کے اس پہلے خاکے کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ یہ ان کا پہلا خاکہ تھا جس کو سامعین کے ساتھ ساتھ صاحب خاکہ نے بھی پسند کیا تھا۔ اس کے بعد ان کے دوسرے خاکوں کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہو پائی۔ یہ خاکہ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''قطع کلام'' میں موجود ہے۔

خاکہ نگاری کے میدان میں ان کے پانچ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''آدمی نامہ'' ہے میں کو 1981ء میں شائع کیا گیا ہے دوسرا مجموعہ ''سو ہے وہ بھی آدمی'' ہے۔ جو 1987ء میں شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ ''چہرہ در چہرہ'' اشاعت 1993ء میں عمل میں آئی۔ اور پانچواں مجموعہ 'ہوئے ہم دوست جس کے'' 1999ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے علاوہ مزاحیہ مضامین میں بھی ان کے چند خاکے شامل ہیں۔ چنانچہ ان کے خاکوں کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئےلکھتے ہیں:

''ان کے ذریعے تحریر کردہ کئی خاکے مضامین کے مجموعے ''تکلف برطرف''، ''ن بہر حال''، ''قصہ مختصر''، ''قطع کلام'' میں بھی شامل ہیں اور ہمیں اس بات کا احساس دلانے میں کامیاب ہیں کہ وہ نہ صرف اپنے پیش رووں کی روایت کو آگے بڑھانے میں پیش پیش ہیں بلکہ اس میں نئے گوشوں کا اضافہ بھی کرنے میں کامیاب ہیں۔ جس سے قاری کی تسکین کا سامان بہم ہو سکے''۔40ؔ

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''آدمی نامہ'' ہے۔ اس کی اشاعت 1981ء میں ہوئی۔ مجتبیٰ حسین نے اس کا نام نظیر اکبرآبادی کے نظم ''آدمی نامہ'' سے مستعار لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نظیر اکبرآبادی کی اس نظم میں جس طرح سے سوا سو برس پہلے آدمیوں کی صفارت بیان کی گئی۔ اس طرح کے آدمی آج بھی زندہ ہیں چنانچہ خود مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' کے پیش لفظ میں اس بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے اس مجموعے کا نام نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم '' آدمی نامہ'' سے مستعار لیا ہے ۔ میں اس نظم کو دنیا کی چند بہترین نظموں میں شمار کرتا ہوں ۔ نظیر اکبر آبادی نے آج سے سوا سو برس پہلے جس قسم کے آدمی اپنی نظم میں پیش کئے تھے ۔اسی قماش کے آدمی آج بھی پیدا ہوتے ہیں ۔انسانیت ابھی تک نظیر اکبر آبادی کی اس نظم سے اونچی نہیں اٹھ سکی ہے ۔آدمی پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے ۔

''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا''

میں نے اس مجموعے میں کچھ آدمیوں کو الفاظ کے پنجرے میں قید کرنے کی کوشش کی ہے ۔میں نے اتنا ہی کام انجام دیا ہے'' ۔[41]

آدمی نامہ میں ادیبوں کے کل پندرہ خاکے موجود ہیں اور اس مجموعہ کا سب سے پہلا خاکہ کنہیا لعل کپور کا ہے ۔ یہ خاکہ اس مجموعے کا بہترین خاکہ ہے اس خاکے کے نام ''لمبا آدمی'' رکھا ہے ۔ کنہیالعلکپور کا قد لمبا تھا اسی لیے ان کی شخصیت کے مطابق اس خاکے کا نام ''لمبا آدمی'' رکھا ہے ۔لہٰذا اشتیاق احمد ورک لکھتے ہیں :

''اس کتاب میں شاعروں ادیبوں کے کل پندرہ خاکے شامل ہیں ۔جنہیں مجتبیٰ حسین نے نہایت محبت اور سلیقے سے لکھا ہے ۔کتاب کا سب سے پہلا خاکہ کنہیالعل کپور کا ہے جو اس کتاب کا خوبصورت ترین خاکہ ہے ۔اس خاکے کا عنوان ہی انہوں نے ''لمبا آدمی'' رکھا ہے'' ۔[42]

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ '' سو ہے وہ بھی آدمی'' ہے ۔اس میں 14 خاکے شامل ہیں ۔اس کی اشاعت کے بعد مجتبیٰ حسین کا یہ حال ہوا کہ ان کے دوست واحباب ان سے خاکہ لکھوانے کی غرض سے ہی ملتے تھے ۔اور دو ایک ایسے صاحب بھی تھے جنہوں نے جب تک ان کا خاکہ نہیں لکھا اس وقت تک ان کا اصرار کرتے رہے ۔

وہاب عندلیب بھی ایک اہم خاکہ نگاری ہیں۔ ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''قامت و قیمت'' ہے۔اس کو 1981ء میں شائع کیا گیا۔اس مجموعہ میں چودہ خاکے شامل ہیں۔اس کے لئے انہوں نے اپنے ہم عصر اور قریبی دوستوں کو انتخاب کیا ہے۔اس مجموعے کے لئے انہیں آندھرا پردیش۔کرناٹک اور بہار کی اردو اکیڈیمیوں نے ایوارڈز سے نوازا گیا۔اس مجموعے کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موجود تمام خاکے گلبرگہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے متعلق ہیں۔کیونکہ انہیں گلبرگہ سے بہت لگاؤ تھا۔گلبرگہ اور عندلیب صاحب میں ایسا ہی تھا جیسا کہ علی گڑھ اور رشید احمد صدیقی کے درمیان تعلق تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر رفعت انساء بیگم لکھتی ہیں:

> ''قامت و قیمت'' چودہ خاکوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔اس مجموعے پر وہاب عندلیب کو عمر، آندھرا پردیش اور بہار اردو اکیڈیمیوں نے ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔''قامت و قیمت'' میں انہوں نے جن شخصیات پر بھی قلم اٹھایا ہے وہ سب کی سب تقریباً گلبرگہ سے تعلق رکھتی ہیں۔وہاب عندلیب کو گلبرگہ سے وہی لگاؤ ہے جو رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ سے تھا''۔۴۳؎

''قامت و قیمت'' میں شامل شخصیتوں سے وہاب عندلیب کی نہ صرف ذہنی دلچسپی تھی بلکہ ان سے وہ جذباتی وابستگی بھی رکھتے تھے۔وہ اپنے خاکوں کے ذریعہ سے افراد کی اعلیٰ انسانی قدروں کو پیش کیا ہے۔ان کی خاکہ نگاری کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں اس شخص کے خدوخال اور عادات واطوار کا بیان دلچسپ انداز میں کیا ہے۔وہ کرداروں کا تعارف جس طرح سے نپے تلے الفاظ سے کرواتے ہیں اس سے زبان و بیان پر ان کی بھرپور قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہاب عندلیب نے اپنے خاکوں کے لئے سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ان کی تحریروں میں طنز مزاح کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔وہ اپنی بات میں جاذبیت اور اثر پیدا کرنے کے لیے موقع محل کے لحاظ سے استعاروں کا بھی صحیح استعمال کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے

خاکوں کا مجموعہ ''قامت و قیمت'' شائع کر کے خاکہ نگاری کی تاریخ میں کرناٹک کی نمائندگی کی ہے۔

عطاالحق قاسمی ایک اہم مزاح نگار اور صحافیکی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔اورانہوں نے خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔''عطائیے'' ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جسے 1982ء میں شائع کیا گیا۔اس تصنیف کے نام سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا نام مصنف کے نام کی مناسبت سے لکھا گیا۔

عطاالحق قاسمی کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''مزید گنجے فرشتے'' ہے۔ یہ مجموعہ 1997ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں کل اڑتیس خاکے شامل ہیں۔ان خاکوں میں تین خاکے خواتین کے ہیں۔اس تصنیف کو مکمل کرنے میں ان کو پچیس سال لگ گئے ہیں۔جس کی وجہ سے کچھ ادیبوں کے دو دو خاکے بھی اس میں شامل ہیں۔

1980ء کے بعد ٹملناڈو میں خاکہ نگاری کے فن پر کم لوگوں نے توجہ کی۔ان میں راہی فدائی اور یعقوب اسلم کو اہمیت حاصل ہے۔راہی فدائی کو ایک شاعر کی حیثیت سے بہت مقبولیت حاصل ہے مگر انہوں نے نثر میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔اس کا پتہ ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین سے ہوتا ہے۔ 1980ء میں ''باقیات ایک نہاں'' کے نام سے ان کی ایک کتاب منظر عام پر آئی۔اس کتاب میں چند قلمی تصویریں بھی شامل ہیں۔وہ ''پیکر اخلاص'' چشم و چراغ باقیات''، ''آب سے ملیے'' اور آدب شیدائی کے عنوان کے تحت ہیں۔ان کے خاکوں میں سیرت کی ترجمانی زیادہ اور ''قد و خال'' کا بیان کم دکھائی دیتا ہے۔

مرزا ادیب 1914ء میں پیدا ہوئے وہ خاکہ نگاری کے میدان میں رشید احمد صدیقی اور مولوی عبدالحق کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے خاکوں کا مجموعہ ''ناخن قرض'' ہے۔اس کی اشاعت 1981ء میں عمل میں آئی۔اس مجموعے میں گیارہ خاکے شامل ہیں۔مرزا

ادیب بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے خاکوں کے کردار افسانوں فضاء میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اختر شیرانی، ابن انشاء، سعادت حسن منٹو، سیتارتھی، مصطفٰی زیدی، اور کمال احمد رضوی کے خاکے بڑے دلچسپ ہو گئے ہیں۔

اسے حمید 1928ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''سنگِ دوست'' ہے اس مجموعے کو 1984ء میں شائع کیا گیا۔ اس میں ادیبوں اور شاعروں کے تیس خاکے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے خاکوں کے دو اور مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ ''چاند چہرے'' اور ''چاند چہرے'' کے عنوانات سے شائع ہوئے ہیں۔ ان خاکوں کے پہلے حصے میں ہندوستانی اداکاروں کے خاکے شامل ہیں اور دوسرے حصے میں پاکستانی اداکاروں کے خاکے شامل ہیں۔

اعجاز رضوی کا نام بھی خاکہ نگاروں میں شامل ہے۔ وہ 1959ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''گلوزاپ'' ہے۔ اس کو 1989ء میں شائع کیا ہے۔ یہ مجموعے اکیس خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس میں مرزا غالبؔ کے خاکے کے علاوہ دیگر خاکے موجودہ دور کے شعرا اور ان کے اساتذہ اور دوستوں کے ہیں۔ اس میں زیادہ تر خاکے ایم۔ اے۔ او، کالج شعبہ اردو سے تعلق رکھنے والوں کے شامل ہیں۔ ان کے خاکے لکھنے کا انداز بہت الگ ہے۔ وہ شخصیت سے متعلق خود اپنی اور دوسروں کی آراء کے ذریعہ سے شخصیت بیان کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان سادہ اور سلیس ہے۔

منظر علی خاں منظر بھی خاکہ نگار ہیں۔ ان کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''مکرر کہے بغیر'' ہے۔ یہ مجموعہ 1984ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں خاکوں کے علاوہ انشائے اور مضامین بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے میں پانچ خاکے موجود ہیں۔ ان پانچ خاکوں میں چار خاکے الگ الگ واقعات پر لکھے گئے ہیں۔ تو ایک خاکہ عابد حسین عابد کا ہے۔

منظر علی کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''خاکہ نما'' ہے۔ اس کی اشاعت 1991ء میں عمل میں

آئی۔ اس مجموعے میں اکیس خاکے شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سفر نامے اور مضامین بھی شامل ہیں۔ ان کے خاکہ لکھنے کا ایک الگ انداز ہے۔ وہ شخصیات کی عکاسی کے علاوہ ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔

احمد عقیل ادبی کا اصل میدان فکشن اور خصوصاً ڈرامہ ہے۔ انہوں نے خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''کھرے کھوٹے'' 1995ء میں شائع کیا گیا۔ احمد عقیل روبی کے بارے میں سجاد باقر رضوی نے کہا کہ روبی تم آدھے علمی ہو اور آدھے قلمی'' اور ان کا یہ جملہ ان کے اس مجموعے پر کھرا اترتا ہے۔ کھرے کھوٹے کے بارے میں ڈاکٹر مشتاق احمد ورک لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب بتیس مردانہ خاکوں پر مشتمل ہے۔ جو 1955ء کے آغاز میں منظر عام پر آئی۔ احمد عقیل روبی صاحب کے بارے میں سجاد باقر رضوی نے کہا تھا کہ ''روبی تم آدھے علمی ہو آدھے قلمی''۔ یہ کتاب اس جملے کا عملی ثبوت ہے جس کی آدھی شخصیات علمی ہیں اور آدھی قلمی''۔ 44

احمد عقیل روبی نے کھرے کھوٹے کے علاوہ تین تفصیلی خاکے بھی لکھے ہیں، مثلاً باقر صاحب کا خاکہ (1992ء) ''مجھے تو حیران کر گیا'' (1994ء)، ''علی پور کا متی'' (1995ء) ہیں۔ اور یہ الگ الگ کتابوں کی حیثیت سے چھپ چکے ہیں۔

لطف اللہ خاں کا شمار بھی خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''تماشائے اہل قلم'' ہے۔ جو 1996ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں کل دس خاکے شامل ہیں۔ اس میں شاعروں اور ادیبوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

احمد بیڑ نے بھی خاکہ نگاری کی ہے۔ انہوں نے صرف چار خاکوں ہی کے ذریعے سے اہم مرتبہ حاصل کیا ہے جو منٹو، میراجی، احسان دانش، اور ظہیر کاشمیری کے خاکے ہیں۔ ان کے خاکوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ خاکے معروف خاکہ نگاروں کے خاکوں سے زیادہ جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''احمد بیٹر بطور خاکہ نگار صرف چار خاکوں کے ذریعے ہی اعتبار کے مرتبے تک جا پہنچے۔ یہ خاکے منٹو، میراجی، احسان دانش اور ظہیر کاشمیری کے ہیں۔ مگر ایک دلچسپ حقیقت اس ضمن میں یہ ہے کہ خاکہ نگار کی حیثیت سے غیر معروف ادیبوں نے بعض ایسے خاکے لکھے ہیں جو معروف خاکہ نگاروں کی بہت سی لفظی تصویروں سے زیادہ جاندار اور متحرک ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں خواجہ احمد فاروقی، خلیق انجم اور اسلم پرویز، اور پاکستان میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید ضمیر جعفری، اور قدرت اللہ شہاب کے بعض خاکے''۔۶۳

احمد پیٹر کے خاکوں کا مجموعہ ''جو ملے تھے راستے میں'' ہے جو 1996ء میں منظر عام پر آیا۔ جسے یونس جاوید نے مرتب کیا اور ''جوگی'' کے نام سے احمد بیٹر کا خاکہ بھی لکھا ہے۔ اور ممتاز مفتی کا لکھا ہوا احمد بیٹر کا خاکہ بھی اس میں موجود ہے۔

یعقوب اسلم نے اپنے استاد محترم جناب منڈی عبدالغنی کی شخصیت پر ایک طویل خاکہ تصنیف کیا ہے۔ اس کا عنوان ''ایک مفکر، مدرس اور رہنما'' ہے اس کی اشاعت 1993ء میں عمل میں آئی۔ انہوں نے عکس در عکس کے نام سے بھی خاکے تصنیف کئے ہیں جسے 1995ء میں شائع کیا گیا۔ اس میں علیم صبا نویدی کے سوانحی حالات اور شخصیت کو موضوع بنائے ہیں۔ اس خاکے کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سید سجاد حسین لکھتے ہیں:

''یعقوب اسلم کے اس خاکے میں ہم علیم صبا نویدی کو ایک جیتے جاگتے گھریلو کردار کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں۔ جو کبھی ملازمت کی مصروفیات میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ امر لائق ستائش ہے اور علیم صبا نویدی کی حیات و شخصیت کی مکمل ترجمانی کرتا ہے''۔64

قرۃ العین حیدر اردو کی مشہور ناول نگار ہیں۔ مگر انھوں نے خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''پکچر گیلری'' ہے۔ یہ مجموعہ 1983ء میں شائع ہوا۔ اس میں چھ خاکے

شامل ہیں۔اس مجموعے میں خاکوں کے علاوہ اردو افسانہ نگاری پر ایک مضمون اور ایک رپورتاژ بھی موجود ہیں۔اس مجموعہ کا فوٹ نوٹ ابن سید نے لکھا ہے۔جو قرۃ العین حیدر کے بارے میں ہے۔اس فٹ نوٹ کو قرۃ العین حیدر کا خاکہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

پکچر گیلری کا پہلا خاکہ ان کے والد سید سجاد حیدر یلدم کا ہے۔اپنے والد کا خاکہ ہونے کے باوجود انھوں نے اس میں کوئی بھی بات بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کی ہے بلکہ شخصیت کی عکاسی ہو بہو کر دی ہے۔چنانچہ ڈاکٹر مجیب احمد خان لکھتے ہیں:

> ''پکچر گیلری کا پہلا خاکہ سید سجاد حیدر یلدرم کا ہے۔قرۃ العین حیدر نے اس خاکہ میں بھی خاکہ نگاری کا حق ادا کیا ہے اور خاکہ کی فنی جزئیات کو بحسن خوبی نبھایا ہے۔اپنے ابا حضور کے خاکے میں بھی وہ متاثر یا مرعوب نہیں ہوتی ہیں۔وہ اصل بات کو بڑی سادگی سے بیان کرتی ہیں اور واقعہ کو اس معصومیت سے پیش کرتی ہیں کہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے''۔[۴۷]

پکچر گیلری میں شامل دوسرا خاکہ داستان طراز محمد علی ردولوی کا ہے۔اس کے علاوہ مولانا مہر محمد خان،شہاب مالیرکوٹلوی،تیسرا خاکہ ہے اور چوتھا خاکہ مشاہد احمد دہلوی ہے۔اس مجموعے میں شامل تمام شخصیات سے متاثر ہونے کے علاوہ ان سے ان کی مکمل واقفیت اور قربت بھی رہی ہے۔انھوں نے شخصیت کے بیان میں غیر جانبداری کو ملحوظ رکھا ہے۔ان کے تمام خاکوں میں خاکہ نگاری فنی محاسن موجود ہیں۔

پکچر گیلری کے علاوہ ان کے دو خاکے ملتے ہیں۔ان میں جیتندر ناتھ کا ایک خاکہ ہے اور دوسر خاکہ ''چاندنگر کا جوگی'' ہے یہ خاکہ ابن انشاء پر لکھا ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نے خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''بیادِ محبتِ نازک خیالان' ہے۔یہ مجموعہ 1997ء میں شائع کیا گیا ہے۔اس میں مکمل پندرہ خاکے اور دو مضامین

شامل ہیں۔اس میں مصنف نے اپنی یادوں کوموضوع بنایا ہے کیوں کہ انھوں نے ملٹری اکاؤنٹس میں کام کیا ہےاس کےعلاوہ وہ دوسرے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔اپنی زندگی میں انھوں نے جن ادیبوں اورشاعروں سے ملاقات کی تھی۔ان سب کے خاکے لکھے ہیں۔

عبدالرزاق کانپوری بھی خاکہ نگاری کے میدان میں شامل ہیں۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''یادایام'' ہے۔اس مجموعہ میں شامل خاکے ہفتہ وار اخبار پیام میں شائع ہوتے تھے۔اس کے بعد ان تمام خاکوں کواکٹھا کر کے کتابی صورت دی گئی ہے۔اس مجموعہ میں علامہ شبلی،اکبرحسین الہ آبادی،نواب محسن الملک، وسیع ذکا اللہ،مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیراحمد،مولانا حالی،مولانا عبدالحلیم شرر،مولانا وحیدالدین سلیم،امداداللہ،نواب مرزااحسان خان شادعظیم آبادی وغیرہ پرخاکے پیش کئے گئے ہیں۔ اس میں زیادہ تر خاکے سیداحمد خان کے ہم عصروں پر لکھے گئے ہیں۔چنانچہ ڈاکٹر صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> ''یادایام سرسید گروپ کے ایسے اکابر کے ذکر پر مشتمل ہے جس سے مصنف کوخود ذاتی ملاقات کا موقع ملا اور جوایک ایک کر کے ان کی زندگی ہی میں ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور یہ اتنی عجیب سی بات ہے کہ مرحوم معاصرین کے تذکرے شائع ہوتے ہی خودعبدالرزاق صاحب ان ہی لوگوں میں جا ملے۔عبدالرزاق صاحب کےقول کے مطابق ان کے فرصت کے گھنٹوں کا بہترین مشغلہ تھا۔یہ ان کے جملہ اٹھہتر سالہ عمر کا بدلہ ہے۔جس کا انھوں نے طلبائے ہندوستان کی خدمت میں پیش کردیا۔'' 48

اردوادب میں خاکہ نگاری کی اس مضبوط روایت کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اردو خاکہ نگاروں کے میدان میں اتنے عمدہ اور دلچسپ خاکے لکھ کر اردوادب میں خاکہ نگاری کی صنف کی آبیاری کی اوراسے فروغ دینے میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپوراستعمال کیا۔

☆☆☆

حواشی

1۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد درک، اردو نثر میں طنز مزاج، انتخاب جدید پریس لاہور، 2004ء، ص:392
2۔ ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری، یم۔ کے آفسٹ پرنٹرس، دہلی، 2009ء، ص:7
3۔ پروفیسر نورالحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ 2006ء، ص:384
4۔ حسن چشتی، مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی 2009، ص:11
5۔ پروفیسر شمیم حنفی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، اردو اکادمی، دہلی۔ 1993ء، ص:13
6۔ صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری کے اولین، نقوش، ماہنامہ سب رس، جولائی 1976ء، ص:5
7۔ سید وصی اللہ بختیاری، مولانا ثنا اللہ عمریؔ کی مرقع نگاری، جنوبی ہند میں اردو مرقع نگاری، S.V یونیورسٹی، تروپتی، 2009، ص:104
8۔ صابرہ سید، اردو ادب میں خاکہ نگاری، ایم کے آفسٹ پرنٹرس، دہلی، 2009، ص:151
9۔ مرتب رشید حسن خان، نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، 1992ء ص:19
10۔ عبدالمغنی، مشمولہ، خاکہ نگاری کیا ہے، ماہنامہ کتاب نما، جنوری 1985ء، ص:11
11۔ رشید حسن خاں، مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، ثمر آفسٹ پرنٹرز، دہلی، 1992ء ص:18
12۔ نامی انصاری، بیسویں صدی میں طنز و مزاح، ص:26
13۔ حسن چشتی، مجتبیٰ حسین کی بہتری تحریریں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2009ء، ص:13
14۔ اسلوب احمد انصاری، ادب اور تنقید، سنگم پبلشرز، آلہ آباد، 1968، ص:339
15۔ صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری، ص:196
16۔ نامی انصاری، رشید احمد صدیقی ایک مطالعہ، ماہنامہ آج کل فروری 1996 شمارہ 7، جلد 54، ص:23

17 رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن ، سلیمان اطہر جاوید، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد، 1976ء، ص238)

18 ڈاکٹر محمد یٰسین، شیخ نیازی، رشید احمد صدیقی، آثار واقدار، ص362)

19 نامی انصاری، آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز ومزاح دہلی، 2003ء، ص:83

20 ڈاکٹر اشتیاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز ومزاح، انتخاب جدید پریس، لاہور، 2000، ص:396

21 ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری۔ 2009ء ایم کے آفسٹ پرنٹرس، دہلی، ص:278

22 نامی انصاری، مزاحیہ خاکہ نگاری، آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز ومزاح، دہلی، 2003ء ص 181

23 سیدہ جعفر، رشید احمد صدیقی، کردار وافکار گفتار، ص:181

24 پروفیسر نور الحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2006ء، ص:389

25 ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری، 2009ء، دہلی، ص:278

26 پروفیسر نور الحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2006ء، ص:388

27 ڈاکٹر ہمایوں اشرف، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ 2007ء373۔

28 نامی انصاری، مزاحیہ خاکہ، آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز ومزاح، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 2003ء ص:180

29 ڈاکٹر محمد اشرف، عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 2009ء، ص:11

30 ڈاکٹر صابرہ سید، اردو ادب میں خاکہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2009ء ص: 161

31 ڈاکٹر اشتیاق احمد درک، اردو نثر میں طنز ومزاح، انتخاب جدید پریس، لاہور، 2004ء ص:409

32 ڈاکٹر سید سجاد حسین عمری، ٹملناڈو میں اردو خاکہ نگاری، سینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی، ص:44

33 ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری 2009ء دہلی۔ ص:250

34 پروفیسر نور الحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2006ء ص:420

35۔ ڈاکٹر صابرہ سید، اردو ادب میں خاکہ نگاری۔ 2009ء، دہلی۔ص:267

36۔ ڈاکٹر صابرہ سید، اردو ادب خاکہ نگاری، ایم کے آفسیٹ پریس، دہلی، 2009،ص:168

37۔ نامی انصاری، مشمولہ آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔2003ء ص:187

38۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد درک، اردو نثر میں طنز و مزاح، انتخاب جدید پریس، لاہور، 2004ءص:431

39۔ مجتبیٰ حسین، آدمی نامہ، ایم۔آر پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2010ء،ص:5

40۔ حسن چشتی، مشمولہ مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری، 2003ء،ص:116

41۔ مجتبیٰ حسین، آدمی نامہ، ایم، آر، پبلی کیشنز 2010ء،ص:7

42۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز و مزاح، انتخاب جدید پریس، لاہور، 2004ء،ص:427

43۔ ڈاکٹر رفعت النساء بیگم، وہاب عندلیب بہ حیثیت خاکہ نگار، جنوبی ہند میں اردو مرقع نگاری، سری وینکٹیشو قرا یونیورسٹی، تروپتی، 2009ء،ص:71

44۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد درک، اردو نثر لیں طنز و مزاح، انتخاب جدید پریس، لاہور، 2004ءص:438

45۔ پروفیسر شمیم حنفی، آزادی کے بعد، دہلی میں اردو خاکہ، اردو اکادمی، دہلی، 1993ء،ص:17

46۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین، ٹاملناڈو میں اردو خاکہ نگاری، جنوبی ہند میں اردو مرقع نگاری، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی 2009ء،ص48)

47۔ ڈاکٹر مجیب احمد خان، ادبی تاثرات، کاک آفسٹ پرنٹرس، نئی دہلی، 2002ء،ص47

48۔ ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری، دہلی 2009ءص205

☆☆☆

باب سوم

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت بہت پرانی ہے۔ شروعات میں اس کو انداز سخن کے طور پر جانا جاتا تھا۔ مگر بیسویں صدی کے قریب قریب اس کو باقاعدہ صنف کی حیثیت حاصل ہوئی۔ جس طرح سے انگریزی ادب میں مزاح کی شروعات شاعری سے ہوئی، اسی طرح اردو ادب میں بھی شاعری کے ذریعہ ہی سے طنز و مزاح کی روایت شروع ہوئی۔ اس کے ابتدائی نمونے کو ولی دکنی اور جعفر زٹلی کی تحریروں میں دیکھے جاسکتے ہیں، یہ نمونے ولی دکنی کے یہاں چھیڑ چھاڑ کی صورت میں نظر آتے ہیں، یہ جعفر زٹلی کے پاس فحش گوئی کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر طاہر تونسوی لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت خاصی قدیم ہے۔ اور اولین دور میں بھی اس کے نمونے مل جاتے ہیں۔ وؔلی دکنی کے ہاں واعظ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ اس کی ایک صورت ہے۔ جعفر زٹلی کے ہاں اگر چہ طنز و مزاح کے نمونے فحش گوئی کے زمرے میں آتے ہیں تاہم وہ بقول جمیل جالبی اس دور کی بہتر اور جاندار آواز ہے اور اپنے طنز کے حوالے سے اس دور کے معاشرتی زوال کی طرف توجہ دلاتا ہے''۔1؎

اردو کے پہلے مزاحیہ شاعر کلی طور پر میر جعفر زٹلی کو مانتے ہیں۔ یہ ہجو لکھا کرتے تھے، ان کی ہجو نگاری کی شروعات اپنے استاد کے خلاف '' بھوت بڑا رنامہ'' لکھ کر کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کو مکتب سے بھی باہر ہونا پڑا تھا۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے اپنے استاد ابو اسحٰق پر ایک اور ہجو'' کچھوا نامہ'' بھی

لکھا۔

میر جعفر زٹلی کی زندگی ہمیشہ مالی مشکلات کا شکار رہی ہے۔ان کے شریک حیات سے بھی ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ان تمام وجوہات نے ان کی زندگی میں زہر بھر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کے کلام میں بھی تلخی نظر آتی ہے۔ڈاکٹر طاہر تونسی لکھتے ہیں:

''انگریزی کی طرح اردو مزاحیہ ادب کا آغاز بھی شاعری سے ہوا میر جعفر زٹلی 1659ء تا 1741ء اردو کے پہلے مزاحیہ شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں، زٹلی نے ہجو کا آغاز اپنے استاد ابواسحاق کے خلاف ''بھوت بڑنامہ'' لکھ کر کیا جس کی وجہ سے ان کا مکتب سے اخراج ہوا۔انتقامی جذبے کے تحت اس کے فوراً بعد ایک اور ہجو استاد کے خلاف ''کھوانامہ'' کے عنوان سے لکھا۔زٹلی تا عمر مالی مشکلات کا شکار رہے۔کئی نوکریاں کیں، لیکن کوئی راس نہ آئی۔اپنی اہلیہ سے بھی ان کے ازدواجی رشتے خوش گوار نہ تھے۔ان تمام عوامل نے مل کر ان کی زندگی اور کلام میں زہر ناکی بھر دی۔جعفر زٹلی کی شاعری میں عریانیت ابتدائی سوقیانہ بن اور فحاشی سبھی کچھ ہے''۔2

میر جعفر زٹلی کے بعد سوداؔ نے طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھایا۔زٹلی کی طرح سوداؔ بھی پہلے ہجو نگار تھے اور بعد میں طنز و مزاح کو اپنایا۔ان کی ہجویات میں طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔انہوں نے شخصی ہجو کے ساتھ ساتھ شہرآشوب بھی تحریر کئے۔اپنے ہجویات کے لئے سماجی برائیوں اور حکومت کی بدعنوانیوں کو موضوع بنانے۔اس کی مثال ان کی تصانیف ''شہرآشوب'' اور ''تضحیک روزگار'' میں ملتی ہیں۔وہ فارسی ہجویات سے بہت متاثر تھے۔انہوں نے گھوڑے کی ہجو لکھ کر اس کی تقلید بھی کرنے کی کوشش کی۔چنانچہ وزیر آغا اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''البتہ سوداؔ کی وہ ہجویات جن کا انداز عمومی یا جن کی اہمیت سماجی ہے، کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔دراصل سوداؔ کی یہی ہجویات پائدار

عناصر کی حامل بھی ہیں۔ان ہجویات میں معاملات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کر کے زندگی کی ناہمواریوں کو نشانہ تمسخر بنایا گیا ہے اگر چہ مبالغہ آرائی نہایت مشکل چیز ہے اور اس میں توازن کی کمی خود مبالغہ کرنے والے کو نشانہ تمسخر بنا دیتی ہے۔لیکن ان ہجویات میں مرزا سودا نے کچھ ایسے نکھرے ہوئے اور بجے تلے انداز میں مبالغہ آرائی کی ہے کہ یہی چیز ان تخلیقات کا حسن بن گئی ہے''۔3

سودا کے علاوہ ان کے زمانے میں اور بھی چند طنز و مزاح نگار موجود تھے۔ان میں میر ضاحک، بقا، میر انشاء، جرات، وغیرہ تھے جن کے اشعار میں طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔

اردو نثر طنز و مزاح کی ابتدا ایک ایسے شخص کے ہاتھوں سے ہوئی۔جنھیں ہم طنز نگار کے طور پر نہیں بلکہ ایک بڑے اور مشہور شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں وہ غالب ہیں۔غالب سے پہلے بھی داستانوں میں ظرافت کے نمونے موجود تھے مگر غالب کی نثر میں اس کے واضح نمونے ملتے ہیں۔اس کی مثال بہتریں ان کے خطوط ہیں۔جس طرح سے غالب نے خطوط نگاری کی ابتداء کی اس کی روایت کو کسی نے بھی آگے نہیں بڑھایا پانے چنانچہ خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں:

''اردو نثر میں ''حسن اتفاق سے ظرافت نگاری کی رسم افتتاح ایک ایسے شخص نے انجام دیدی جس کو لوگ مزاح نگار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ااردو سب سے زیادہ مشکل گو بے حد سنجیدہ، غیر معمولی مفکر و فلسفی اور ایک عظیم شاعر ہے۔یعنی اسد اللہ خاں غالب اردو کے سارے ظرافت نگاروں کا سلسلہ انھیں سے ملتا ہے۔ان کو بابائے ظرافت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔انھوں نے اپنے خطوں کے ذریعے سے اس کی ابتداء کی ،ظرافت کا سر چشمہ تو رواں دواں ہوگیا،لیکن خطوط کا سلسلہ ختم ہوگیا۔اس لیے کہ رقعات غالب کے نمونے کے خط پھر کسی نے اس تزک و احتشام، روانی اور باہمی مکالمے کے انداز میں نہیں لکھے۔مولانا حالی نے یادگار غالب میں ان کے لطائف کا ایک باب شریک کر کے ان کی

اولیت اور کمالِ ظرافت کو حیاتِ جاودان بخش دی''۔4

غالبؔ کی طبیعت میں بلا کی شوقی ہے۔ان کی باتوں میں بھی ظرافت کے دلکشن نمونے موجود ہیں شاید انہیں خصوصیات کی بناء پر مولانا حالی نے ان کو''حیوانِ ظریف'' کہا تھا۔طنز و مزاح کے نمونے ان کے خطوط کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس کے علاوہ طنز و مزاح کے لئے ء جو شرائط ضروری ہیں۔وہ تمام ان کے پاس موجود ہیں۔چنانچہ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''طنز و مزاح کے بہترین ادبی نمونے کا جو معیار ہوتا ہے اس پر غالب کی اردو نثر کے نمونے ہی نہیں ان کے بعض اشعار بھی پورے اترتے ہیں ان کے اسلوب میں جامعیت، برجستگی اور شائستگی ایسے بنیادی اوصاف ہیں جو طنز و مزاح کے لئے بھی ضروری شرائط میں سے ہیں،اس لئے غالب کی نثر کو یہ امتیاز ملا ہے کہ وہ بیک وقت بہترین اسلوب کا نمونہ بھی ہیں''۔5

غالبؔ نے نہ صرف دوسروں کو مزاح کا موضوع بنایا وہ بلکہ خود کو بھی مزاح کی تھی۔ان کے طنز کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انکے طنز کا ہجو سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بات کو اشاروں میں بیان کر دیا ہے اور اگر وہ کسی پر طنزیہ وار بھی کرتے ہیں تو انہیں محسوس نہیں ہونے دیتے چنانچہ شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

''غالب کے طنز کی کئی خصوصیات ہیں۔ایک تو بقول رشید احمد صدیقی وہ براہ راست نہیں اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ جس پر وہ وار کرتے ہیں اسے اول تو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ان کے طنز کا نشانہ تھا، اور اگر ہوتا ہے تو اس وقت جب طنز اپنا اثر کر چکا ہوہے۔طنز کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے۔6

ڈپٹی نذیر احمد کا شمار اردو کے پہلے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کو اردو کے پہلے ء ناول نگار

تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا خاص مقصد اصلاح ذات مذہب اور معاشرہ تھا۔ انہوں نے داستانوں کے مقابلے میں اردو میں ناول تصنیف کئے ہیں جس میں زندگی کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے کلسات ناول تخلیق کئے ہیں جن کا مقصد سماجی اصلاح تھا۔ ان ناولوں میں دو ناول ایسے ہیں جن کو طنز و مزاح کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے ہیں وہ ناول ''توبتہ النصوح'' اور ابن الوقت ہیں۔ ابن الوقت میں انہوں نے ایسے لوگوں پر طنز کیا ہے کہ مغربی تہذیب اور عادات و اطوار کو اختیار کرنا فخر سمجھتے ہیں چنانچہ محمد طاہر نذیر احمد کے نالوں کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ حقیقت ہے کہ نذیر احمد کا مقصد اور نصب العین سرتا سر اصلاح ذات، اصلاح مذہب، اور اصلاح معاشرہ تھا۔ انھوں نے سحر اور جادو سے بھرے ہوئے قصوں کو جن میں محبت کا ایک عجیب سا تصور تھا۔ مخرب اخلاق جاں کر داستانوں کے مقابلے میں ایسے ناول تصنیف کئے جو حقائق سے قریب اور زندگی کو سنوارنے میں مددگار رہوں۔ انھوں نے ایسے سات ناول تخلیق کئے جو اصلاحی مقصد کے حامل تھے تاہم شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی قلم سے دو ایسے ناول بھی تخلیق پائے جن کو طنز و مزاح کے ذیل میں رکھنا زیادہ قرین انصاف ہوگا۔ یہاں اشارہ ''توبتہ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' کی جانب ہے۔ ابن الوقت میں ان لوگوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جو مغرب کی کورانہ تقلید کو باعث افتخار اور مغربی تہذیب میں رنگنے ڈھلنے کو باعث فخر جانتے تھے۔ نیز مغربی بود و باش اختیار کر کے خود کو ترقی یافتہ مہذب اور جنٹلمین تصور کرتے تھے۔ اس ناول میں طنز کی کاٹ تیز ہے، لیکن مزاح کے امتزاج سے اس تلخی کو مصنف نے خوش گوار کر کے پیش کیا ہے۔ اس ناول میں (Identify crisis) کو موضوع بنایا گیا ہے''۔ 7

ڈپٹی نزیر احمد کا تیسرا ناول ''توبتہ النصوح'' ہے۔ اس ناول میں شامل کردار مرزا ظاہر دار بیگ نے اس کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ کردار نہ تو اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ نہ ہی اس کی تخلیق میں

زیادہ توجہ برتی گئی ہے۔مگراس کردار کی حاضر جوابی نے اس کواردو ادب کے مزاحیہ کردار میں لازوال بنادیا ہے۔

نذیر احمد کے تمام ناولوں میں طنز ومزاح کے ہلکی سی جھلکیاں نظر آتی ہیں،مگر ابن الوقت اور توبتہ النصوح ایسے ناول ہیں جن میں طنز ومزاح کی جھلکیاں کچھ زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔

میر کے ہم عصر انشاء اللہ خاں ہیں۔وہ ایک ہجونگار کئے ساتھ، ہزل گوئی اور ریختی گوشاعر بھی ہیں۔جن کی شاعری میں خالص مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ان سے پہلے کے شعراء میر زٹلی اور سودا کے کلام میں ظرافت کے نمونے تو موجود ہیں مگر ان کے پاس مزاح دکھائی نہیں دیتا ہے، اس کے برخلاف انشاء کے کلام میں طنز ومزاح دونوں کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

انشاء کے بعد طنز ومزاح کے واضح نمونے نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں دکھائی دیتے ہیں ۔ایک عوامی شاعر ہیں اس کے علاوہ یہ اردو کے دوسرے طنز نگار شاعر ہیں جن کا نام تذکروں میں بھی ملتا ہے۔ انہوں نے سماج کی برائیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔اور اپنی شاعری کے لئے عوامی مسائل کے ساتھ ساتھ ان کے ہندوستانی تہواروں رسم ورواج ،اور میلے وٹھیلے وغیرہ کو بھی موضوع کے طور پر برتا ہے۔ان موضوعات کو برتتے وقت بھی ان کے یہاں مزاح پیدا ہو گیا ہے۔ان کے پاس طنز کی کاٹ تیز جب کہ ظرافت کے ہلکے پھلکے نقوش ملتے ہیں چنانچہ شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> ''نظیر بقول نیاز فتح پوری چٹکلہ بازی تھے۔دل کی لگن سے زیادہ دل لگی ان کا شیوہ تھا۔نظیر اردو کے شاید تنہا عوامی شاعر ہیں جو مقامی بھی ہیں۔انہیں ہنس ہنس کر وار کرنا خوب آتا ہے۔نظیر کے یہاں طنز وظرافت کا بڑا اچھا امتزاج ہے۔اچھا اس لئے کہ اس میں تیز قسم کا طنز اور ہلکی پھلکی ظرافت صرف کی گئی ہے۔اس کا مزاح بڑا ہی خوشگوار ہے۔شگفتگی میں تلخی کی ایسی آمزش جو مذاق صحیح کو گوارا نہ ہو، بڑے سلیقے کا کام ہے۔نظیر میں یہ سلیقہ ہے اور اس کو ایک ماہر فنکار

کی طرح اس نے برتا ہے۔'' ۔8

نظیر نے سماج کے ہر پہلو پر تفصیل سے نظر رکھا ہے اور زندگی کی رنگارنگی کو اپنی شاعری کا ایک پہلو بنایا ہیں۔

جعفر زٹلی، سودا، انشاء اور نظیر کے علاوہ دوسروں کے پاس بھی ظرافت کے نقوش ملتے ہیں۔ ان میں رنگین، بقا، ضاحک، میر حسن دہلوی، شاکر ناجی، نازنین بیگم، وغیرہ کے کلام میں مزاح کے نقوش موجود ہیں۔

غالب کے بعد طنز ومزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں ''اودھ پنچ'' کا اہم رول رہا ہے۔ غالب کا انتقال 1869ء میں ہوا۔ اس کے آٹھ سال بعد 1877ء میں اودھ پنچ کا اجراء ہوا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ انہوں نے انگلستان سے جاری ہونے والے پنچ سے متاثر ہو کر اودھ پنچ کو جاری کیا تھا۔ انگلستان کے پنچ سے متاثر ہو کر کئی اخبار جاری ہوئے مگر جو مقبولیت اودھ پنچ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور اخبار کے حصہ میں نہیں آئی۔ یہ اخبار 1912ء تک لگاتار جاری ہوتا رہا۔ پروفیسر شاہ عبدالسلام لکھتے ہیں:

> ''اودھ پنچ جو اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا دراصل لندن کے ''پنچ'' اخبار سے متاثر ہو کر جاری ہوا تھا۔ ''پنچ'' اخبار جو ہفتہ وار اخبار تھا اور جس کا پورا نام punch or the london chariuari (شاری واری) تھا اور اسے 1841ء میں مارک لیمن Mark Lemon, نے نکالا تھا۔ یہ اخبار تقریباً ڈیڑھ صدی تک جاری رہا۔ اودھ پنچ کے خدوخال، روش اور اسلوب بھی تقریباً وہی تھا جو لندن پنچ کا تھا۔ سبب شاید یہ تھا کہ منشی سجاد حسین خود پنچ کے اسلوب اور طرز نگارش سے مرغوب ومتاثر تھے۔ یہ نیا انداز اردو قارئین کو ایسا بھایا کہ اودھ پنچ کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا''۔9

اودھ پنچ اردو کا پہلا اخبار تھا۔جس کا خاص مقصد مزاح کوفروغ دینا تھا۔اس اخبار میں صحافتی مشمولا تکے ساتھ ساتھ اس میں مزاحیہ ادب کوبھی شائع کیا گیا۔اوراس میں مذہبی اور ادبی تمام پہلوؤں پرقلم اٹھایا گیا۔اوراس کے ذریعہ سے مغربی طرز کی ظرافت وجود میں آئی۔اوراس کے لکھنے والوں نے خاص طور پرشخصیات کواپنے طنز کا نشانہ بنایا۔

اودھ پنچ نے صحافت میں نئے انداز کا روشناس کرایا جیسا کہ اس میں پہلی بار کارٹونوں کوشائع کیا گیاان کارٹونوں کوسیاسی مقاصد کے تحت استعمال کیا گیا۔اس اخبار کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں پرانی چیزوں کو نت نئے انداز میں پیش کیا گیا۔اور اپنے ہم عصر، ادیبوں کے کلام اور زبان پر خصوصی توجہ صرف کی گئی اور غلطیاں کرنے والوں پر اصلاحات اوراعتراضات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اصلاح سے حالی،داغ،اور سرشار بھی محفوظ نہ رہ سکے۔

اودھ پنچ کی ترقی میں اہم رول اس کے ایڈیٹرمنشی سجاد حسین کو حاصل ہے۔ان کے علاوہ رتن ناتھ سرشار،سجاد حسین،نواب آزاد،اوراکبرالہ آبادی بھی اس اخبار کے اہم ادیب ہیں۔ان کے علاوہ منشی سجاد حسین، مچھوستم ظریف،محفوظ علی بدایوانی، برق،شوق،سید محمد آزادتر بھون ناتھ ہجراور عبدالغفور شہباز وغیرہ شامل ہیں۔ان تمام ادیبوں میں اکبرالہ آبادی کے علاوہ تمام ادیبوں نے نثر میں طنز و مزاح کوفروغ دیا۔چنانچہ خورشیداسلام لکھتے ہیں:

> ”1877ء میں اودھ پنچ جاری ہوا۔اودھ پنچ مشرق ومغرب کے تصادم کا پہلا مظہر ہے۔اس کے لکھنے والوں میں چارحضرات کے نام سرفہرست ہیں۔ رتن ناتھ سرشار،منشی سجاد حسین،نواب آزاد،اوراکبرالہ آبادی۔ان سب کی منزل ایک ہےاور سلیقہ بھی ایک ہے۔لیکن صلاحیت اور موضوع کے حدود میں فرق ہےاسی لیےان کے تخلیقی کارنامے،فنی ہیئت،مجموعی اثراورقوت حیات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں“۔10؎

اودھ پنچ کے مدیر منشی سجاد حسین نے نثر میں اپنی خدمات انجام دی ہے۔اپنی تحریروں کے لئے سیاسی ،سماجی اور معاشی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

طنز ومزاح کے میدان میں انہیں شہرت ومقبولیت ان کے مزاحیہ ناول ''حاجی بغلول'' سے حاصل ہوئی۔ یہ ناول ڈکنس کے ناول'Pic Wick Abroad"}} کا چربہ ہے۔مگرانہوں نے ا سے ہندوستانی نام اور لباس عطا کیا ہے۔اس میں''حاجی بغلول'' کا شمار اردو کے چند اہم مزاحیہ کرداروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے واقعات کے ذریعے سے مزاح پیدا کرنے کے علاوہ محاورات، ضرب الامثال اور جملوں کے استعمال سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اودھ پنچ کے مصنفین میں منشی سجاد حسن اور سرشار نے پہلی بار اردو ادب میں مزاحیہ کردار پیش کئے ہیں،منشی سجاد حسن نے حاجی بغلول اور رتن ناتھ سرشار نے خوجی کردار پیش کیا ہے۔

اودھ پنچ کے قلم کاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا نام اہمیت کا حامل ہے اور ان کو اسی اخبار کے ذریعے سے شہرت ومغبولیت حاصل ہوئی اور جب اودھ اخبار جاری ہوا تو وہ اس سے وابستہ ہوگئے۔ادب میں ان کی شہرت کا باعث ان کا شاہکار ناول''فسانہ آزاد'' ہے۔اس ناول کو انہوں نے اودھ اخبار میں قسط وار شائع کیا ہے۔

فسانہ آزاد چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔اس کا پلاٹ کمزور ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی زبان کے چٹخارے سے اس خامی کو دور کر دیا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار خوجی ہے۔اس کو اردو کے اہم مزاحیہ کرداروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔اس ناول میں لکھنو کی تہذیب وتمدن کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کیوں کہ ان کی پیدائش اور پرورش لکھنو ہی میں ہوئی تھی اس لیے اس ناول میں اس عہد کی تاریخ جیتی جاگتی صورت میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''رتن ناتھ سرشار کی تمام تر شہرت اب ان کے کلاسیکی شاہکار'' فسانہ آزاد'' کی وجہ سے ہے۔اس میں انھوں نے لکھنو کی تمدن کی عکاسی بہت خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔'' فسانہ آزاد'' کا بغور مطالعہ کرنے والا اس عہد کے تمدن کی واضح جھلکیاں'' فسانہ آزاد'' میں جتنی واضح دیکھے گا اتنی کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں ملیں گی۔ 11؎

سید محمد آزاد کا شمار بھی اودھ پنچ کے قلم کاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے اودھ پنچ کے لئے ابتداء سے لے کر آخری وقت تک وابستہ رہے ہیں۔اس کے علاوہ وہ دوسرے اخباروں میں بھی اداریہ اور مضامین لکھتے تھے۔ان کو نوابی زندگی کو بیان کرنے میں کمال حاصل تھا۔اس کی مثال ان کا ناول'' نوابی دربار'' ہے۔ یہ ناول 1877ء میں اودھ پنچ میں شائع ہوا۔ وہ اودھ پنچ میں مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ان مضامین کو اکٹھا کر کے اس کو کتابی صورت دی گئی۔

نواب سید محمد آزاد کی تحریروں میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ان کے طرز بیان اور اظہار خیال کی خوبیوں کے پیش نظر رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ انہیں اردو کا ہوریس اور چاسر کہا ہے۔اس کے ساتھ ان کی خامی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔نواب آزاد کی تحریریں کافی حد تک عریاں ہیں اور کہیں کہیں ستم ریزی کے بجائے دانتوں تلے انگلیاں بھی دبانی پڑتی ہیں''۔

جوالا پرشاد برق نے شاعری اور ترجموں کے ذریعے سے اودھ پنچ میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔انہوں نے بنکم چندر چٹر جی کے ناولوں کو اردو میں عام فہم زبان میں ترجمہ کئے اس کے علاوہ شکسپیر کے ڈراموں کا ترجمہ کیا ہے۔ان کی شاعری کا اہم نمونہ ان کی مثنوی'' بہار اور معشوقہ فرنگ'' ہے ۔یہ مثنوی انگریزی کے رومیو اور جولیٹ کا ترجمہ ہے۔

ستم ظریفی اودھ پنچ کے قلم کاروں میں ہیں۔انہوں نے بہار ہند، چشم بصیرت اور گلزار وغیرہ تصنیف کئے ہیں۔ان کے پاس مزاح کے ساتھ ساتھ شوخی بھی موجود ہے، ان کو محاوروں کے استعمال

میں بھی قدرت حاصل ہے۔ان کی محاوروں کی مہارت نے انہیں شگوفہ زاری کی طرف بھی توجہ دلائی۔

اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں اکبرالہ آبادی کا شمار اہم مزاحیہ شاعروں میں ہے۔انہوں نے سیاسی، سماجی، مذہبی صورت حال پر طنز کیا ہے۔ان کی شاعری کی شروعات انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اول میں ہوا تھا۔وہ اپنی شاعری کے ذریعے سے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اس وقت ہندوستان ایسے حالات سے گزر رہا تھا کہ یہاں کے لوگ مغربی طرز اور مغربی عادات واطوار متاثر ہورہے تھے۔وہ اپنی شاعری کے لئے قطعہ کے فارم کو اپنائے تھے۔ چنانچہ شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> ''اکبر نے طنز وظرافت کوفن کی حیثیت سے شعر میں برتا اور اس کے لیئے قطعہ کا فارم اختیار کیا۔اکبر کی شاعری میں ظرافت کا ایک خاص مقام ہے۔اردو میں اکبر کی اہمیت ظرافت کی وجہ سے ہے۔اکبر پہلے ظریف ہیں۔اس کے بعد ان کے طنز کا نمبر آتا ہے''۔12

اکبر اردو ادب کے پہلے مزاحیہ شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں ظرافت کو بھرپور طور پر استعمال کیا ہے ان کے بعد کوئی ایسا شاعر پیدا نہیں ہوا جو ان کا مقابلہ کرسکے۔البتہ اکبر کے بعد صرف ظریف لکھنوی کا نام لے سکتے ہیں جنہوں نے شاعری میں ظرافت کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔

اودھ پنچ 1912ء تک لگاتار جاری ہوتا رہا۔ یہ اخبار 1913ء میں بند ہوگیا۔ پھر دو سال بعد ممتاز عثمانی نے اس کو دوبارہ جاری کیا۔ مگر اس مرتبہ اس اخبار کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی تھی جتنی کہ پہلی بار کے اودھ پنچ کو حاصل ہوا تھا۔اس طرح دوبارہ جاری ہونے والے اخبار میں صرف ایک فرد کا نام نمایاں نظر آتا ہے جن کی تحریروں نے جان ڈالی دی تھی۔وہ سید مقبول حسین ظریف ہیں۔

ظریف لکھنوی، حضرت صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ان کے مزاحیہ مضامین اودھ پنچ کے ساتھ ساتھ سرپنچ میں بھی شائع ہوتے رہے ان کے مزاحیہ مضامین میں کلام ظریف، مزاح ظریف

۔ظرافت ظریف اور فرمانِ ظریف کے عنوانات کے تحت شائع ہوتے رہے اور سرپنچ نے انہیں ملک الشعراء کے خطاب سے بھی نوازا تھا لہٰذا خواجہ عبدالغفوران پر ان کی مزاح نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی ،طبیعت میں شوخی اور ظرافت کے مضامین سرپنچ اور اودھ پنچ میں چھپتے رہے۔ مشاعروں میں سب سے زیادہ کامیاب ،منفرد شوخی اور ظرافت سے سیاسی مضمون کا حلیہ بگاڑ دیتے تھے۔ سماجی خرابیوں کو نشانہ طنز بناتے''۔13؎

اودھ پنچ نے اپنے زمانے میں ایسے لکھنے والوں کو پیدا کیا کہ ان کی وجہ سے اودھ پنچ کو ایک تحریک بنادیا۔ اور اودھ پنچ کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے نام کی مناسبت سے کئی اخبار نکلنا شروع ہوگئے۔ جیسے کہ پنجاب پنچ، لاہور پنچ، جالندھر پنچ، بنارس پنچ، آگرہ پنچ، دکن پنچ، وغیرہ تھے۔

اودھ پنچ کو اردو کے طنز ومزاح کے میدان میں وہی مقبولیت حاصل ہے جو کہ انسان کے جسم میں ریڈ کی ہڈی کو حاصل ہے۔اس اخبار نے طنز ومزاح کو فروغ دینے کے علاوہ طنز ومزاح نگاروں کے ایک بڑے قافلے کو جمع کئے اور ان کو اردو دنیا میں شامل کردیئے اس اخبار کی خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے صحافت میں پہلی بار کارٹون چھاپنے کا رواج بھی جاری کیا۔ اور ان کارٹونوں کو سیاسی مسائل کو مدنظر رکھ کر تیار کیا جاتا تھا۔

اودھ پنچ کے خاتمے کے بعد اردو طنز ومزاح میں عہد جدید کا آغاز ہوا۔ اردو طنز ومزاح ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اور شبلی ،ظفر علی خاں، رایاض خیر آبادی اور اقبال کی شاعری نے ایک نئے رجحان کو فروغ دیا۔ان کے اشعار میں طنز ومزاح دونوں موجود تھے چنانچہ سیدہ جعفر اس سلسلے میں لکھتی ہیں:

''اودھ پنچ کے بعد ہمارا مزاح ایک نئے دور میں داخل ہوتا ہے۔شبلی ،ظفر علی

خاں اور ریاض خیرآبادی اور اقبال کی شاعری ایک نئے رجحان کا پتہ دیتی ہے۔
ان کے اشعار اردو کے مزاح اور طنز میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں، طنز کی کاٹ سے
مزاح کا وار زیادہ تیز اور خطرناک ہوسکتی ہے کیونکہ اس کا اچھا وار خود شاعر اور
ادیب کو پہنچا سکتا ہے''۔14؎

اودھ پنچ کے بعد اردو طنز و مزاح میں لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ ان میں مہدی افادی، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم منشی پریم چند، علی عباس حسینی، قاضی عبدالغفار ملا رموزی، خواجہ حسن نظامی، ظفر علی خاں، عبدالماجد دریابادی، امتیاز علی تاج، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، عبدالعزیز ملک پیما، اور عبدالمجید سالک وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

اودھ پنچ کے زمانے میں بہت سے مزاحیہ پرچے جاری بھی ہوئے اور بند بھی ہوگئے ان میں ریاض خیرآبادی کے دو مزاحیہ پرچے فتنہ اور عطر فتنہ، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ فتنہ مارچ 1883ء میں جاری ہوا۔ اس اخبار کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف نثر میں ہی لکھا جاتا رہا۔ اور کچھ سال بعد ریاض خیرآبادی نے نظم شائع کرنے کے لئے عطر فتنہ کو جاری کئے۔ ان پرچوں میں صرف ریاض خیرآباری کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

بیسویں صدی میں فتنہ اور عطر فتنہ کے بعد چراغ حسن حسرت کا فکاہیہ ہفت روزہ شیرازہ جاری ہوا۔ جس کی وجہ سے اردو طنز و مزاح میں دور جدید کا آغاز ہوا۔ شیرازہ 1936ء میں چراغ حسن حسرت نے جاری کیا۔ یہ اخبار لاہور سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے لکھنے والوں میں بڑی تعداد آگے چل کر برے ادیبوں میں شمار ہوئے۔ جیسے کہ عبدالمجید سالک، حفیظ ہوشیارپوری، میراجی، عطاءاللہ سجاد، محمود نظامی۔ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، کنہیالال کپور، ضمیر جعفری، حاجی لق لق، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، جن کی تحریروں نے شیرازہ کو زینت بخشی تھیں مگر ان میں سے صرف کنہیالال کپور اور ضمیر جعفری ہیجد یدمزاحیہ ادب کے دو سنگ میل قرار پائے۔

سرپنچ کا اجراء 1931ء میں ہوا۔اس نے اپنے کارٹونوں اور مزاحیہ تحریروں سے اردو طبقے کو اپنے طرف متوجہ کرلیا۔اس کے لکھنے والوں میں ظریف لکھنوی ،محمد علی شہباز، اور احمق پھپھوندوی ، فرحت اللہ بیگ ،عظیم بیگ چغتائی ، سلطان حیدر جوشی ،سجاد انصاری ،محفوظ علی بدایونی، اور قاضی عبد الستار وغیرہ شامل ہیں اور ان لوگوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ طاہر تونسوی لکھتے ہیں:

> ''اودھ پنچ کے ساتھ ساتھ گورکھپور سے ریاض خیرآبادی نے اخبار فتنہ اور عطرفتنہ جاری کئے۔ جو طنز و مزاح کی روایت کو مزید استوار کرتے ہیں۔ اسی طرح شوکت تھانوی کا سرپنچ بھی اس میں اضافے کا سبب بنا۔اس کے لکھنے والوں میں فرحت اللہ بیگ اور عظیم بیگ چغتائی اہم ہیں،عظیم بیگ چغتائی کے ہاں الفاظ سے طنز کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ ان کے ساتھ سلطان حیدر جوش سجاد انصاری،محفوظ علی، بدایونی اور قاضی عبد الغفار ہیں جو اپنے اپنے انفرادی انداز میں طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھائے ہیں''۔15

اودھ پنچ کے بعد اسی طرز پر کئی مزاحیہ رسالے جاری ہوئے مگر انکو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہو پائی۔اودھ پنچ کا خاتمہ اور شیرازہ کے جاری ہونے سے اردو کے مزاحیہ ادب میں دور جدید کا آغاز ہوا۔اس زمانے میں بہت سے ادیبوں نے طنز و مزاح کی طرف راغب ہوئے۔ان میں شاعروں کے علاوہ افسانہ نگار اور ناول نگار بھی شامل تھے۔جن کی وجہ سے اردو نثر میں طنز و مزاح کی عمارت کھڑی ہو پائی۔اودھ پنچ کے بعد سے لے کر آزادی تک کئی مزاح نگاروں نے اپنے تحریروں کے ذریعے سے طنز و مزاح کے خزانے میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ان میں سید محفوظ علی بدایونی مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوشی۔ پریم چند، سجاد علی انصاری، حاجی عبد الغفار، امتیاز علی تاج، ملا رموزی، شوکت تھانوی، عظیم چغتائی ، مرزا فرحت اللہ بیگ ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور

ابوالکلام آزادوغیرہ کواہمیت حاصل ہے۔

سید ضمیر جعفری، ''اخبارِ شیرازہ'' کے معاون و مدیر تھے۔ان کو نثر اور نظم دونوں میں مہارت حاصل ہے۔انھوں نے اڑتے ہوئے خاکے تصنیف کے لیے بقول خواجہ عبدالغفار ''طنزیہ شاعری کے استاد ذہانت کی پھلجھڑیاں چھوڑنے میں ماہر''۔

قاضی عبدالغفار کا شمار طنز نگاروں میں سے ہے۔ان کا طنز مغرب کی سیاست و مشرق کی اخلاقی اقدار کی پستی پر منحصر ہے۔انھوں نے مغربی تہذیب کی عادات کواپناتے ہیں اس کے علاوہ اور انہوں ان کے منفی اقداروں کی مخالفت بھی کی ہے۔ان کا خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کوفن پر حاوی ہونے نہیں دیتے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین ''پیسے کی چھوکری''، لیلیٰ کے خطوط اور ''مجنوں کی ڈائری'' شامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار اردو کے معروف ادیبوں اور صحافیوں میں ہوتا ہے۔طنز نگاروں میں بھی شمار کئے جاتے ہیں۔طنز نگاری میں ان کا اپنا الگ رنگ تھا۔

ملا رموزی کو شہرت ان کی گلابی اردو کی وجہ سے حاصل ہوئی۔جن میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج موجود ہے۔ان کے مضامین کا مجموعہ ''زندگی'' ہے۔اس میں ریل کا سفر، بیوی اور مشاعرہ وغیرہ مضامین شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کے مضامین میں لطافت، نکات رموزی، انتخاب گلابی اردو، مقالات گلابی اردو اور سوانح ملا رموزی وغیرہ شامل ہیں۔ان کا'' گلابی اردو'' قرآن مجید کے قدیم اردو ترجمہ کی پیروڈی ہے۔گلابی اردو کے بارے میں وزیر آغاز لکھتے ہیں:

> ''اردو نثر میں طنز و مزاح کے طالب علم کے لیے ملا رموزی کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا زبان و بیان سے مزاح پیدا کرنا ہے۔ وہ دراصل اپنی ''گلابی اردو'' کے لے مشہور ہیں۔یہ گلابی اردو قرآن مجید کے قدیم اردو ترجمہ کی پیروڈی ہے لیکن یہ پیروڈی صرف لفظی ہے اور اگر اس سے اصل کی تضحیک بھی

ہوتی ہے تو صرف اس حد تک کہ ترجمہ کے انداز کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ غالبًا ملا رموزی کے پیش نظر ایسا کوئی شعوری مقصد بھی موجود نہیں تاہم غیر شعوری طور پر انھوں نے تحریف کا یہ نمونہ ضرور پیش کر دیا ہے۔'' 16؎

خواجہ حسن نظامی بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں مگر انھوں نے طنز و مزاح کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے تقریباً پانچ سو کتابیں تصنیف کئے ہیں۔ ان میں جھنگیر کا جنازہ، کم آن مائی ڈیئر 14، وغیرہ ان کی مشہور تحریریں ہیں۔ مگر ان کو طنز و مزاح سے لگاؤ نہیں تھا۔ انھوں نے صرف اردو زبان کی خدمت کرنے کی غرض سے طنز و مزاح کی طرف راغب ہوئے تھے۔ اس بات کی طرف انھوں نے خود اشارہ کیا ہے کہ ''ہنسی مذاق میرا کام نہ تھا مگر میں نے محض زبان اردو کی خاطر اس میں دخل دیا اور لکھا۔

مولانا ظفر علی خان کو ایک صحافی کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ انھوں نے اخبار ''زمیندار'' کو جاری کیا۔ مگر ان کا نام مزاح نگاروں کی فہرست میں بھی اہمیت کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کو نظر و نظم دونوں میں کمال حاصل ہے۔ ان کے نظموں کے مجموعوں میں بہارستان، چمنستان وغیرہ شامل ہیں۔

امتیاز علی تاج اردو دنیا میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ مگر مزاح نگاری میں بھی ان کا نام شامل ہے۔ مزاحیہ ادب میں ان کو شہرت ان کے مزاحیہ کردار چچا چھکن کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ دراصل یہ کردار ان کے مضامین کے مجموعے میں شامل ہے۔ یہ کردار انگریزی کتاب ''تھری مین ان اے بوٹ'' سے لیا گیا ہے۔ اس کے مصنف جیروم ہیں۔ اس کتاب کا کردار انکل بوچر کا چربہ چچا چھکن ہے۔

چچا چھکن کا کردار انگریزی ہونے کے باوجود امتیاز علی تاج نے اس کے اندر ہندوستانی رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کردار ہندوستانی معلوم ہوتا ہے۔ اس کردار کی تخلیق میں امتیاز علی تاج نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کردار اصلی اور جیتا جاگتا معلوم ہوتا

ہے۔

طنز و مزاح کی تاریخ میں کئی ایسے نام شامل ہیں جن کی خدمات کو مزاحیہ ادب میں بہت مقبولیت حاصل ہے اوران لوگوں کے ذکر کے بغیر طنز و مزاح کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ وہ ہیں شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، کنہیا لال کپور، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتے ہیں۔

طنز و مزاح کے جدید اور دور میں جن ادیبوں نے عملی مذاق کے ذریعے سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان میں عظیم بیگ چغتائی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ مزاح نگاری میں ان کا خاص کام یہ ہے کہ انھوں نے مزاحیہ افسانہ نگاری کی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے تقریباً 25 ۔ ان کا خود کا کہنا ہے کہ دیڑھ سال یعنی جون 1932ء سے دسمبر 1932ء تک 12 کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں شریر بیوی، کولتار، الندری، خانم، چینی کی انگوٹھی، شاطر کی بیوی، رموز خاموشی، یکہ اور وکالت وغیرہ شامل ہیں۔ ان مضامین کو ان کے مشہور مزاح پاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عظیم بیگ چغتائی کی مزاحیہ تصانیف کے بارے میں نامی انصاری لکھتے ہیں:

> عظیم بیگ چغتائی اپنے زمانے کے مقبول ترین مزاح نگار تھے اور بے تحاشہ لکھتے بھی تھے۔ وہ خود کہتے کہ میں نے صرف ڈیڑھ سال کے عرصے میں یعنی جون 1932 سے دسمبر 1936 تک 12 کتابیں لکھ ڈالی تھیں۔ دو ایک ناول بعد میں بھی لکھے۔ ان کی بہت مشہور کتابوں میں شریر بیوی، کولتار، خانم، اور چینی کی انگوٹھی شامل ہیں۔ روح ظرافت،، روح لطافت اور مضامین چغتائی اس کے علاوہ ہیں۔ 17

انھوں نے مزاح پاروں کے ساتھ ساتھ افسانوں پر بھی توجہ دی ہے۔ مگر ان کا خاص میدان مزاحیہ افسانہ نگاری ہے اور ''روح لطافت'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔

عظیم بیگ چغتائی کے ہم عصر مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار اردو کے اہم مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔جس طرح سے عظیم بیگ چغتائی نے مزاحیہ افسانے کی بنیاد ڈالی۔اس طرح سے فرحت اللہ بیگ نے مزاحیہ خاکہ نگاری کی بنیاد ڈالی ہے۔آخری وصیت، پھول والوں کی سیر، نذیر احمد کی کہانی وغیرہ ان کے مشہور تصانیف میں شامل ہیں۔ان کے خاکوں کے اعلیٰ نمونوں میں پھول والوں کی سیر، نذیر احمد کی کہانی اور دہلی کا ایک مشاعرہ شامل ہیں۔وزیر آغا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کی خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> فرحت اللہ بیگ کے ان مضامین کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت سنجیدگی اور ظرافت کا فن کارانہ امتزاج ہے۔وہ بیشتر اوقات گذرے ہوئے واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔شاید اس مقصد کے ساتھ کہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے یہ نمونے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں۔ظاہر ہے کہ یہ مقصد بڑا سنجیدہ ہے اور اگر اس میں احتیاط نہ برتی جائے تو ادبی مضامین کا محض تاریخی مضامین ہو کر رہ جانا عین ممکن ہے۔ایسے میں فرحت اللہ بیگ ایک فطری شگفتگی اور ظرافت سے ان واقعات پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور انھیں اس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کی تاریخی ثقافت ہی ختم ہو جاتی ہے بلکہ وہ ہمدردانہ انداز نظر بھی ابھر آتا ہے جو اعلیٰ ظرافت کے لیے از بین ضروری ہے۔18

فرحت اللہ بیگ نے مولوی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد دونوں کے اثرات قبول کئے ہیں۔جس کی وجہ سے نذیر احمد کی عربیت اور آزاد کی مرقع کی اور شخصیت نگاری ان کی تحریروں میں شامل ہیں۔

عبدالعزیز فلک پیما کا نام اس دور کے طنز نگاروں میں شامل ہے۔انھوں نے فرحت اللہ بیگ کی طرح اپنے اسٹائل کے ذریعہ سے طنز و مزاح میں امتیازی مقام حاصل کیا ہے ان کے لب و لہجے میں فلسفیانہ کا انداز ملتا ہے ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کا امتزاج ہے۔ان کے یہاں موضوعات کا تنوع

ہے۔انھوں نے اللہ میاں سے لے کر اردو شاعری، فلسفے تک زندگی کے ہر پہلو پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مضامین میں اللہ میں شیطان اور بزرگ ایک سوال اور ہمایوں وغیرہ شامل ہیں۔ان کی طنز نگاری کے بارے میں نامی انصاری لکھتے ہیں:

> عبدالعزیز فلک پیا بھی اس دور کے ایک اہم طنز نگار ہیں۔ان تحریروں کی میں فکر وفلسفے کی آمیزش بہت نمایاں ہے۔ وہ صدیوں سے مستحکم چلے آرہے نظریات پر اس طور سے طنز کا وار کرتے ہیں کہ اس کی کہنگی اور ربودگی از خود نمایاں ہو جاتی ہے۔ان کے افکار میں بہت گہرائی اور ان کے اسلوب میں بڑی توانائی ہے''۔19

اودھ پنچ کے بعد کے دور کو جیسے ڈاکٹر وزیر آغا ''عبوری دور'' کہتے ہیں۔اس کے بعد طنز و مزاح کے میدان میں خواتین دکھائی دیتے ہیں۔طنز ومزاح ہو یا ہلکے پھلکے انشائیوں کے نمونے ہلکے ہی صبح دکن کی میدان میں شامل ہیں۔اس طرح اردو طنز ومزاح میں پہلی طنز ومزاح نگار خواتین دکن کے ہی ہیں۔وہ محترم آصف جہاں ہیں۔

آصف جہاں فرحت اللہ بیگ کی بھانجی ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ گل خنداں، ہے۔ یہ 1941ء میں منظر عام پر آئی۔اس کتاب کا دیباچہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے۔اس مجموعے میں گھریلو واقعات کو موضوع بناتے ہیں۔اس کے لیے انھوں نے افسانے کی تکنیک کو نہیں بلکہ مضمون نویسی کے تکنیک کو استعمال کیا ہے۔اس مجموعے میں مزاح کی خصوصیت کم نظر آتی ہیں۔اس کے باوجود اس کو مزاح نگاری کے ضمن میں اس لیے رکھ سکتے ہیں کہ یہ طنز ومزاح نگار خواتین کا پہلا کارنامہ ہے۔چنانچہ شیفتہ فرحت لکھتے ہیں:

> آصف جہاں فرحت اللہ بیگ کی بھانجی ہیں اور فرحت اللہ بیگ ہی نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے۔گل خنداں کے مضامین کے موضوعات گھریلو واقعات

> ہیں۔جس کے اظہار کے لیے افسانے کی تکنیک نہ استعمال کرتے ہوئے مضمون نویسی کا رنگ دیا گیا ہے۔اسے یوں طنز یا مزاح کے دائرے میں کھینچ لانا مشکل ہے لیکن مزاح کی دنیا میں خواتین کے سفر کی یہیں سے ابتداء ہے۔20

آصف جہاں نے " گل خنداں" کے علاوہ مضامین اور افسانے بھی تخلیق کئے ہیں۔ جو رسائل میں شائع ہوتے رہے۔اگران مضامین کو اکٹھا کر کے کتابی صورت دی جائے تو ایک ضخیم مجموعہ ہوسکتا ہے۔ " گل خنداں "میں موجود بہترین مضامین میں غائب دماغ، دوست، شاپنگ، میرا کمرہ، جلترنگ وغیرہ میں شامل ہیں۔

آصف جہاں کے بعد صالحہ بیگم حنفی، وجہ النساء، مہ جبین نے بھی طنز و مزاح میں طبع آزمائی کی ہے۔اسی دور میں شہباز بیگم کی شعری تخلیقات بھی ملتی ہیں۔ان کی شاعری اکبرالہ آبادی کی شاعری کا ہلکا سا رنگ دکھائی دیتا ہے۔اس زمانے میں جہاں بانونقوی کی انشائیہ نگاری بھی سامنے آتی ہے مگر ان کے انشائیوں میں مزاح سے زیادہ مضمون نگاری کا انداز دکھائی دیتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کے پرنواسی ہیں۔ان کی پیدائش پانی پت میں ہوئی۔شادی کے بعد وہ دہلی آ گئے اور یہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔انھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مزاح کے اچھے نمونے ان کے ڈرامے اور مضامین میں ملتی ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیائی مضامین تصنیف کئے ہیں۔ان مضامین میں شمانیت ہمسایہ، کو مقبولیت حاصل ہے۔ان کے دوسرے مضامین میں شریک غالب مزاح کی عمدہ مثال ہے۔وہ اصل میں خواتین کے طرفدار ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صادقہ ذکی لکھتے ہیں:

> بیگم صالحہ عابد حسین نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے بعض مضامین اور ڈرامے اچھے مزاح کے نمونے ہیں۔ان کی ایک تخلیق شریک غالب بھی مزاح کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہ دراصل خواتین کی طرفدار ہیں۔اس

طرفداری کے پیچھے عورتوں کی عام زبون حالی اور بے چارگی بھی کہی جاسکتی ہے۔
غالب کے اشعار میں بھی انھیں غالباً کسی ایسی ہی صورتحال سے سابقہ پڑا۔21ے

کنہیا لال کپور اردو کے اہم مزاح نگاروں میں شامل ہیں۔انھوں نے اردو ادب میں اپنا منفرد مقام بنایا۔انکی تحریروں میں طنز ومزاح دونوں کا امتزاج موجود ہے۔کنہیا لال کپور کے مزاحیہ کا پہلا مجموعہ ''سنگ وخشت'' 1942ء میں منظر عام پر آیا۔ان کے مضامین کا دوسرا مجمو''عہ شیشہ و تیشہ ''ہے۔یہ مجموعہ (1944ء) میں شائع ہوا۔تیسرا مجموعہ جنگ ورباب ہے۔(1946)ء میں عمل میں اائی۔نوک ونشتر چوتھا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ (1949ء) میں شائع ہوا۔پانچواں مجموعہ (1957)ء میں ساتواں مجموعہ ''گرد کارواں'' ہے۔(1960)ء میں اوران کا آٹھواں مجموعہ ''گستاخیاں'' ہے جو(1966ء) میں شائع ہوا۔

کنہیا لال کپور کے مزاحیہ مضامین کو اردو کے اہم مزاحیہ مضامین میں شمار کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ غالب دید شعرا کی محفل میں، برج بانو، اردو ادب کا آخری دور، اور مالی ترقی پسند ادیبوں کی محفل میں، ان کے نمائندے مضامین ہیں۔ان مضامین میں انگریزی ادب کے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ وہ انگریزی ادب سے بھی واقف تھے۔

کنہیالال کپور آزادی سے پہلے بھی لکھا کرتے تھے اور آزادی کے بعد اس میں کمی پیدا ہوگئی تھی۔مگر انھوں نے آزادی سے پہلے ہی اپنے تحریروں کے ذریعے سے اردو مزاحیہ ادب کو مالا مال کر دیا تھا۔جب وہ موگا کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے کہ اس وقت سے انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔چنانچہ نامی انصاری لکھتے ہیں

انگریزی ادب کے طنز ومزاح سے بھی بخوبی واقف تھے جس کے اثرات ان
کے مضامین پر بھی پڑے ہیں اوران میں زیادہ بالیدگی اور گہرائی پیدا ہوئی ہے۔
کنہیالال کپور کے بیشتر کارنامے آزادی کے زمانے تک منظر عام پر آچکے تھے۔

آزادی کے بعد انھوں نے بہت کم لکھا اور موگا کالج کے پرنسپل ہونے کے بعد تو تصنیف و تالیف کی طرف سے وہ تقریباً کنارہ کش ہو گئے تھے۔22؎

کنہیالال کپور کو تحریف نگاری میں بھی قدرت حاصل ہے۔اس کی مثال ''غالب جدید شعرا کی محفل میں'' ہے۔ یہ ان کا شاہکار مضمون ہے۔اس میں انھوں نے جدید شاعری کا اپنے مخصوص انداز میں مذاق اڑایا ہے۔نظم و نثر دونوں میں انھوں نے تحریف نگاری کی ہے اور انھوں نے الفاظ کی بازیگری سے طنز پیدا نہیں کیا بلکہ خیالی کردار کے ذریعے سے طنز کو ابھارا ہے۔ انھوں نے ادبی موضوعات کو اپنی طنز کے لیے انتخاب کیا ہے۔اس کی مثال ان کے مضامین یعنی شاعری، غالب جدید شعراء کی مجلس میں وغیرہ ہیں۔

کرشن چندر کا شمار اردو کے مشہور ادیبوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے تقریباً اردو ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔افسانہ ناول، ڈرامہ، انشائیہ اور تنقیدی مضامین میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کتابوں کا ترجمہ دنیا کی 65 بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ان کی ادبی زندگی کا ارتقاء طنز و مزاح سے ہوا ہے۔انھوں نے دسویں جماعت میں پروفیسر بلا کی لکھ کر اپنے فارسی استاد ماسٹر بلاتی کا خاکہ اڑایا ہے۔

کرشن چندر کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہوائی قلعے ہے۔ یہ مجموعہ 1940ء میں شائع ہوا۔ یہ تصنیف کرشن چندر کے مزاح نگار ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے گدھے کی سرگزشت، گدھے کی واپسی، جامن کا پیڑ، کانچ کے ٹکڑے، ایک گدھا نیفا ہیں اور قلمی قاعدہ و تبصرہ تصنیف کئے ہیں۔ان تصانیف میں مزاح کے علاوہ طنز کے تیر زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

کرشن چندر نے مزاحیہ ناول بھی تخلیق کئے ہیں۔ان میں شکست، باون پتے، ایک گدھے کی سرگذشت میں اور چاندنی کی کھٹائی وغیرہ شامل ہیں۔ گدھے کی سرگزشت اور گدھے کی واپسی میں انھوں نے دفتری نظام کو موضوع بنا کر ان پر طنزیہ وار کیا ہے انھوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں موجود

برائیوں پر بھی طنز کیا ہے۔

طنز و مزاح کے ادبی دور میں اب وہ دور آتا ہے جس کو مزاحیہ ادب کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں طنز و مزاح کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔ اس صنف میں لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی۔ جن میں رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشاہ، مجتبیٰ حسین، ابراہیم جلیس، وجاہت علی سندیلوی اور یوسف ناظم وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو ایک اعلیٰ مقام بخشا ہے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں رشید احمد صدیقی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی مزاح نگاری کا آغاز 1919ء میں ہوا۔ ان کے پہلے دور کے مضامین علی گڑھ منتھلی میگزین میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے طنز و مزح کے موضوعات شعر و ادب کے ساتھ ساتھ سیاست، تاریخ اور دیگر علوم و فنون ہے۔ ''مضامین رشید'' اور خندان کا شمار ان کے مزاحیہ مضامین میں کیا جاتا ہے۔ ''مضامین رشید'' کو رشید احمد صدیقی نے کچھ تبدیلیوں کے ساتھ 1964ء میں دوبارہ شائع کیا تھا۔ اس بار اس مجموعے میں انھوں نے کچھ نئے مضامین بھی شامل کئے۔ مثلاً دھوبی، سلام ہوجد پر اور سرگذشت عبدگل ہیں۔ مضامین رشید کے بہترین مضامی میں چارپائی، ارہر کا کھیت، گواہ، مغالطہ، پاسبان اور میں، دعویٰ شامل ہیں۔ ان مضامین میں بیسویں صدی کے نصف اول کا ہندوستان دکھائی دیتا ہے۔ اس مجموعے میں طنز و مزاح دونوں کا امتزاج ہے ملتا۔ چنانچہ وحید اختر لکھتے ہیں:

> ''مضامین رشید میں بیسویں صدی کے نصف اول کا ہندوستان اپنے تنوعات کے ساتھ ہنستا، بولتا اور کہیں کہیں سنجیدہ و حزین ملتا ہے۔ اس میں طنز بھی ہے۔ ظریفانہ نگاہ بھی۔ ہمدردی کا جذبہ بھی، اقدار کا احترام بھی اور ان سب کا مرکزی نقطہ ہے علی گڑھ جو مصنف کی شخصیت بھی ہے۔ فن بھی اور اظہار فن بھی۔ 23''

خنداں رشید احمد صدیقی کے ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ہے۔ انھیں ریڈیو میں پیش کرنے کے لیے تحریر کیا گیا ہیں۔ اس مجموعے میں لیڈر، دعوت، ایڈیٹر، الیکشن، رقیب، سفر اور باغ وغیرہ اہم مضامین ہیں اور ان میں طنز و مزح کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ان میں اسلوب کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ان کے دوسرے مضامین کے مقابلے میں اس میں علی گڑھ کا دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔

رشید احمد صدیقی نے طنز و مزاح کے فن پر بھی ایک کتاب ''طنزیات و مضحکات'' کے عنوان سے تخلیق کی ہے۔ وہ ''طنزیات و مضحکات'' ہے۔ یہ تصنیف 1926ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں طنز و مزاح کے فن کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یونانی، رومن، انگریزی اور فارسی ادب کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ طنزیات و مضحکات اردو ادب کی پہلی کتاب ہے جس میں پہلی بار مغربی اور دیگر زبانوں کے مزاحیہ ادب کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی مزاح کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے نہ صرف قاری کو ہنساتے ہیں بلکہ ان کو سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں اور بات میں بات پیدا کرنا اور ہر بات میں نئی بات پیدا کرنا ان کی کی فن کی شناخت ہے۔ اس کے علاوہ ان کی مزاح کے خصوصیات میں رعایت لفظی، اختصار ور جامعیت، زیرلب تبسم اور چھوٹے چھوٹے واقعات سے مزاح پیدا کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی مزاح نگاری سے اردو کے مزاحیہ ادب میں جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین ان کی مزاح نگاری کے خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو کی جدید طنز و مزاح نگاری کا آغاز رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی جدید طنز و مزاح نگاروں کے لیے منارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے فلسفیانہ اسلوب نگارش اور موضوع سے ان کے اچھوتے tratment نے اردو مزاح نگاری کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ان کی تحریروں کی شان و شوکت نے اردو مزاح نگاری کو نئی منزلیں عطا کیں۔ اگرچہ

آزادی کے بعد رشید احمد صدیقی نے بہت کم لکھا لیکن جو کچھ بھی لکھا وہ کتنے ہی مزاح نگاروں کے لیے آج بھی 'سرچشمہ فیضان' کی حیثیت رکھتا ہے''۔24؎

اس سے پتہ چلتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کے اسلوب نے اردو مزاح نگاری کو ایک اہم مقام دے دیا اور ان کی تحریں آگے لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئیں۔

رشید احمد صدیقی کے بعد طنز و مزاح نگاری کے میدان میں احمد شاہ پطرس بخاری کا نام آتا ہے۔ وہ دور جدید کے مزاحیہ ادب کے دوسرے بڑے رکن ہیں۔ اس میدان میں ان کا اہم کارنامہ ''مضامین پطرس'' ہے۔ یہ مجموعہ گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں کتے، ہوسٹل میں پڑھنا، اردو کی آخری کتاب، مرید پور کا پیر، اعلیٰ مزاح پاروں میں شامل ہیں۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن خوب لکھا ہے۔ انھوں نے صرف ایک کتاب کی وجہ سے طنز و مزاح کے میدان میں مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس مجموعے کے علاوہ انھوں نے تراجم بھی کئے ہیں۔ وہ ''مصر کی رقاصہ'' ہے۔ ان کی مزاح نگاری کے خصوصیات کے بارے میں خواجہ عبدالغفور بیان کرتے ہیں:

''زیر لب مزاح پیدا کرنے میں استاد اور الفاظ کے برمحل استعمال کے بادشاہ، بذلہ سنج ہیں داستان طراز نہیں۔ ان کی ظرافت بندھے ہوئے موضوعات، روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہے۔ ان کی ذاتی خوش دلی قوس قزح کی طرح چھا جاتی ہے۔ اصلاح کا پہلو کبھی اختیار نہیں کیا۔ مگر سماج اور سیاست پر بڑے لطیف حملے کئے ہیں۔ مزاح کے کردار بہت اچھے پیش کئے ہیں۔25؎

پطرس کے اہم مزاحیہ مضامین میں اب اور تب، رونا رلانا، انبار میں ضرورت ہے وغیرہ شامل ہیں۔ ان مضامین میں مزاح کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں انھوں نے جس موضوع پر بھی ہاتھ رکھا ہے اسے زعفران زار بنا دیا ہے۔

نذیر احمد دہقانی کا اصل نام نذیر احمد ہے۔ان کا تخلص دہقانی ہے۔ وہ 1908ء میں نلگنڈہ میں پیدا ہوئے۔ان کا نام دکنی اور دہقانی زبان کے اولیں شاعروں میں شامل ہے۔ وہ ایک مزاحیہ شاعر ہیں۔ان کی شاعری کا مقصد اصلاح معاشرہ تھا۔انھوں نے اپنی مزاحیہ شاعری کے ذریعہ سے سماج میں موجود خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے گاؤں اور شہر دونوں میں موجود رسم و رواج اور سماجی پہلوؤں کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری تین ادوار میں تقسیم ہے۔

ان کا کلام ان کے دور کی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کے کلام کو ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد نے ''صدائے دہقانی'' کے نام سے 2004ء میں شائع کیا۔

تخلص بھوپالی کا شمار اردو کے مزاحیہ شاعروں میں ہے۔انھوں نے دوسال تک بھوپال پنچ کی ادارت کی (1960) ہے۔انھوں نے نظم و نثر دونوں میں بیگماتی زبان کے ذریئے سے مزاح کو بڑھا دیا ہے۔ یہ مزاحیہ کرداروں کے ذریعے سے مزاح پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔ان کے مزاحیہ کرداروں میں 'غفور میاں' او'پاندان والی خالہ' کو مقبولیت حاصل ہے۔ بقول خواجہ عبدالغور' ان کی مزاح نگاری دراصل خاکہ نگاری ہے۔جس کا ان کو اچھا ملیکہ ہے۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

> تخلص بھوپالی کا بنیادی طور سے مزاحیہ کرداروں کے ذریعے سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔غفور میاں اور پاندان والی خالہ تخلص بھوپالی کے دو اہم مزاحیہ کردار ہیں۔انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرہ کی ٹوٹتی ہوئی قدروں کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔26؎

شوکت تھانوی کا نام اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے مشہور ہے۔ وہ یہ صحافی کالم نگار، افسانہ نگار، خالہ نگار، ڈرامہ نگار، طنز نگار، پیروڈی نگار ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے تقریباً ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے 1931ء میں اخبار سرپنچ کی ادارت بھی کی ہے۔اس کے علاوہ انھوں

نے اودھ اخبار میں بھی ملازمت کی ہے۔ ان کی مزاح نگاری کی شروعات کالم نگاری سی ہوئی۔ انھوں نے لکھنو سے شائع ہونے والے اخبار ''ہمدم'' میں فکاہیہ کالم ''دو دو باتیں'' کے ذریعہ اپنی مزاح نگاری کی ابتداء کی ہے اور اسی اخبار کے کالم میں ان کا مشہور ناول سویشی ریل بھی شائع ہوا۔ ان کی تصانیف میں ہیرو پیپہ، خبطی، موج تبسم، کتیا، ہم زلف، پیلی بیگم، مولانا، نیولفر، قاضی جی اور شیش محل وغیرہ شامل ہیں۔

مزاح نگاری میں ان کا اہم کارنامہ ''سودیشی ریل'' ہے۔ انھوں نے کئی تصانیف ہونے کے باوجود انھیں سودیشی ریل کے ذریعہ ہی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس تصنیف میں شروع سے لے کر آخر تک مزاح نظر آتا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا اور ادیبوں کے تبصرے پیش کیے ہیں۔ اس میں دو مزاحیہ کردا بھی پیش کیے ہیں۔ وہ قاضی جی اور نئی جی کے کردار ہیں۔

انھوں نے طنز و مزاح کے تقریباً تمام حربوں کو آزمایا ہے جیسے کہ انشائیہ، ناول، پیروڈی اور خاکہ نگاری وغیرہ میں انھوں نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ انھوں نے سماجی تہذیبی اور اخلاقی برائیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ طنز و مزاح میں انھوں نے اپنی الگ راہ نکالی ہے۔ ان کو بات سے بات پیدا کرنا خوب آتا ہے۔ انھوں نے اظہار خیال کے لیے نہایت سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی تصانیف میں روانی کا احساس ہوتا ہے۔ طرز تحریر میں وہ اپنے ہم عصر مزاح نگار ملا رموزی سے فوقیت حاصل ہے۔

آزادی کے بعد مزاحیہ شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے والے اشاروں میں شاد عارفی راجہ ہوئی علی خان، فرحت کاکوری اور رضا نقوی والی، دلاور فگار، سلیمان خطیب، مجید لاہوری وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔

ملک کی تقسیم ہونے کے بعد اردو کے مزاح نگاروں کو بھی دو ملکوں میں بانٹ دیا گیا لیکن

ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ ہندوستان کے حصہ میں صف اول کے مزاح نگار آئے۔ ان میں غلام فرحت کا کوری بھی شامل ہیں۔ ان کو تحریف نگاری میں خاص مقام حاصل ہے۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں میں تحریف نگاری کی ہے۔ تحریف نگاری کے علاوہ انھیں مزاح نگاری میں بھی مہارت حاصل ہے۔ ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین میں ''جشن جمہوریت کی ایک دو پہر''، صدف ہد، اور مردہ دل خاک جیسا کو مقبولیت حاصل ہے۔

غلام فرقت نے تقریباً تمام موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ جیسے کہ لاٹری کا ٹکٹ، انتخابات، جمہوریت، جدید شاعری، غالب، سماجی رسومات اور سیاسی جوڑ توڑ وغیرہ ہیں۔ ان میں انھوں نے کرداروں کے ذریعے سے مزاح پیدا کیا ہے۔

جشن جمہوریت کی ایک دو پہر، فرقت کا کوری کا ایک طویل مزاح پارہ ہے۔ اس میں انھوں نے افیونیوں، مدکیوں اور جرسیوں کا انتہائی شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی مزاح اودھ پنچ کے بیشتر مزاح نگاروں کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیف اردو ادب میں طنز و مزاح کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے تاروا عنوان کے تحت ایک خاکہ بھی لکھا ہے۔ اس میں ترقی پسند مصنفین کو موضوع بنایا گیا ہے۔

فکر تونسوی کا نام اردو کے چند ممتاز طنز و نگاروں میں سے ہے اور ان کو سیاسی طنز نگار کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہے۔ ان کی طنز نگاری کا آغاز 1900 میں روزنامہ ''نیاز مانہ'' کے طنزیہ کالم سے ہوا۔ اس کے بعد وہ روزنامہ ''ملاپ'' دہلیمیں 1902 ''پیاز کے چھلکے'' کے عنوان کے تحت لگا تار لکھتے رہے۔ انھوں نے طویل طنزیہ کالم نگاری کی مثال قائم میں اپنی ہے ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں آپ بیتی، روزنامچہ اور ناول بھی ملتے ہیں جو اس طرح ہے، پروفیسر بدھو 1904۔ 2۔ چھٹا دریا (1949)۔ تیر نیم کش (1953) ماڈرن الہ

دین (1955) خدو خال (1955) ساتواں شاستر (1956ء) ہم ہندوستانی (ہندی) (1957) بدنام کتاب (1958) آدھا آدمی (1959) آخری کتاب (1961ء) فکرنامہ (1966ء) پیاز کے چھلکھے (1972)۔13۔ چھلکے ہی چھلکے (1973) فرکمانی (1982)۔گھر میں چور (1983) آپ بیتی حصہ اول (1987) میری بیوی (آپ بیتی حصہ دوم 1987)۔

فکرتونسوی کی ادبی زندگی کا آغاز شاعر کی حیثیت سے ہوا۔انھوں نے اپنا تخلص فکر رکھا۔ تقسیم ہند کے حالات نے ان میں موجود طنز نگاری کو ابھارا۔اس کے بعد انھوں نے شاعری کو ترک کر کے طنز نگاری کو اپنایا۔ان کو عوامی مقبولیت پیاز کے چھلکے کے ذریعے حاصل ہوئی۔ یہ مجموعہ ان کے کالم نگاری کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کو ملاپ میں تقریباً 1956ء سے 1981ء تک لگاتا وہ لکھتے رہے۔اس سے انھوں نے روزمرہ زندگی کے سماجی وسیاسی مسائل پر تبصرہ کرتے رہے اوراس میں ان کی تحریر سادہ اور عام فہم ہے۔ پیاز کے چھلکے کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے مظفرحنفی لکھتے ہیں:

> ''اپنی تصنیفات اور 'ملاپ' کے مشہور زمانہ فکاہیہ کالم 'پیاز کے چھلکے' میں فکر نے جو کچھ لکھا عام آدمی کے بارے میں لکھا اور عام آدمی کے لیے لکھا ہے یعنی ان کا موضوع بھی عوامی مسائل سے تعلق رکھتا ہے اور ان کی تحریر بھی عام فہم ہے۔ خالص طنز کو اپنا فن قرار دینے کے لئے جس اخلاق قوت مضبوط کردار اور مصلحت پسندی سے دامن کش ہو کر حق بیان کی جرات کا درکار ہوتی ہے۔فکرتونسوی میں بدرجہ اتم موجود تھی۔اپنے دور کی بوالعجبیوں، بے ہودگیوں اور ناہمواریوں میں جیسے بے محابا تیر فکر کے قلم نے چلائے ہیں اسکی مثال کم ملتی ہے۔ 27

فکرتونسوی نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ان کی تخلیقات میں اخباری کالموں کے علاوہ خاکے، ناول، ڈرامے اور آپ بیتی بھی شامل ہیں۔ان کی کم وبیش پندرہ سولہ کتابوں میں ''ہیولے'' شعری مجموعہ ہے اور چھٹا دربار یورتاژ ہے اس میں طنز کی خصوصیات موجود ہیں۔ ماڈرن الہ الدین

ناول ہے اور میری بیوی دو حصوں پر مشتمل آپ بیتی ہے اور خدوخال ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

فکر تونسوی ہجرت کے بعد طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھانے جن ادیبوں میں حصہ لیا ہے۔ ان میں احمد جمال پاشا، فرحت کارکوی، وجاہت علی سندیلوی، خواجہ عبدالغفور، یوسف ناظم، شیفتہ فرحت کے نام قابل ذکر ہیں۔

راجہ مہدی علی خان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''مضطراب'' ہے۔ اسکے بعد انھوں نے کچھ وقت تک لکھنا بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی تخلیقات کا سلسلہ جاری رکھا۔ انھوں نے کئی طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور نظمیں لکھی ہیں۔ یہ تمام نظمیں ''انداز بیان اور'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے پیروڈیاں بھی تخلیق کی ہیں۔

رضا نقوی واہی کا شمار طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں اہم ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع دکھائی دیتا ہے۔ ان کی مزاحیہ نظموں میں نوکر شاہی اور لیڈری، فیشن اور کرپشن، ترقی پسندی اور جدیدیت، مرغ بازی سے ملا وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے لیے مواد انھوں نے اپنے عہد کی شعر و شاعری اور بکھری ہوئی تہذیبی زندگی سے لیا ہے۔

ان کے کلام میں طنز و مزاح دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے عصری مسائل پر طنز کیا ہے۔ چنانچہ ان کی طنز و مزاح کی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہوئے خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں:

> ''کلام میں طنز و مزاح دونوں ہے شعر کہنے کی فطری صلاحیت برملا، عصری مسائل پر بھرپور طنز اور تمام سماجی موضوعات پر ہے قلم اٹھایا ہے۔ زبانوں بیان پر قادر صرف نشتر زنی ہی نہیں بلکہ مرہم بھی رکھتے ہیں۔ ان کا طنز و مزاح چوٹ سہہ کر ابھرتا ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کو طنز مزاح میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ سیاست اور تہذیبی زندگی کی کروٹیں بھی انھیں متاثر کرتی ہیں''۔[28]

ان شعراء کے علاوہ مزاحیہ شاعری کرنے یں ماچس لکھنوی، راہی قریشی، مائل لکھنوی وغیرہ اہم ہیں۔ جدید دور کے شعر میں شاد عارضی اور راجہ مہدی خان کی طنزیہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔ شاد عارفی کی مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار ہیں۔ ان کی نظموں میں پرانا قلعہ، ان اونچے اونچے محلوں میں، ان سے ملیئے وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی غزلوں میں سماج اور سیاست میں موجودہ برائیوں پر بڑی نازک سے طنزیہ چوٹ کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں گھر کی بعض ناہمواریوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انھوں نے کبھی ساس بہو کے تعلقات کے بارے میں لکھا ہے تو کبھی شادی بیاہ کے اخرجات کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ان کے آباءواجداد کا پیشہ بھی سپہ گری تھا اور ان کو غالب کی طرح اپنے آباواجداد پر ناز ہے۔ اسی وجہ سے ان کی زبان واسلوب میں طنز ملتا ہے۔

راجہ مہدی علی خان نظموں میں تحریف نگاری کرتے ہیں۔ ان کا نام بے باک اور تیز لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ان کی مزاح میں فکر دکھائی دیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ تیکھا پن بھی موجود ہے۔ ان کے موضوعات بھی نئے ہیں جیسے ورزن اور لارڈ کرزن، سسرال کی جیل، چور اور خدا، کالے آنسو، اجی پہلے آپ، ایک چہلم پر، حرام زادے، میرے تکیوں پر لکھے اشعار، آخری گالی، ہمیں ہماری بیویوں سے بچاؤ، اور مزاح نگاری کے سلسلے میں اہم جنت میں حسینوں کی بھوک ہڑتال وغیرہ کے ذریعے سے ان کے موضوعات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں چور کی دعا، خرگوشوں کی غزل، مولوی صاحب کا خواب، جہنم میں غنڈے، پیر اور مرید، مانگے کی کتابیں واپسی پر وغیرہ ہیں۔

اردو کے طنز و مزاح کی تاریخ میں دکنی مزاح نگاروں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ سرزمین دکن سے طنزیہ ومزاحیہ رسالہ ''شگوفہ'' 1968ء میں جاری ہوا۔ اس کی ادارت مصطفیٰ کمال نے کی۔ اس رسالے میں مزاح نگار اور مزاحیہ ادب کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس اخبار کی ادارت سنبھالنے والے مصطفیٰ کمال نے ''زندہ دلان حیدرآباد، کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس

ادارے کے ذریعہ سے دکن کے قابل ذکر مزاح نگاروں کو جمع کر کے ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کے اہم مزاح نگاروں میں مصطفیٰ علی بیگ، کلیم میدکی، سرپٹ حیدرآبادی، محمد علی منگلی، قادر حیدرآبادی، گڑبڑ حیدرآبادی، فیض الرحمٰن فیض، حفیظ خان مذاق، عظمت بھلاواں، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، رشیدالدین، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، خواجہ عبدالغفور، اسحاق ایوبی، مسیح انجم، طالب خوندمیری، احسن علی مرزا، عاقل علی خان، شیفتہ فرحت، لیئق صلاح، رشید موسوی اور حبیب ضیاء وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح کے فروغ میں زندہ دلان حیدرآباد کو اہم مقام حاصل ہے۔ یہ ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک بھی تھی۔ اس ادارے کے ذریعہ سے طنز و مزاح کو فروغ حاصل ہوا۔ دکن کے مزاح نگاروں نے خاص طور پر دکنی زبان اور یہاں کے لب ولہجہ کے ذریعہ اپنے تجربات و مشاہدات کو پیش کیا۔ ان کے پاس موضوعات کا تنوع، عصری حسیت اور ہندوستانی عناصر کی عکاسی ملتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کا شمار اردو کے صف اول کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے پاس وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی نثر اور خالص مزاح کے لیے ضروری ہیں۔ طنز و مزاح کے میدان میں ان کے اہم کارنامے چراغ تلے، خاکم بدہن اور گذشت ہیں۔ یوسفی کے مضامین کا اولین مجموعہ چراغ تلے ہے۔ اس کو 1961ء میں کراچی سے شائع کیا گیا۔ اس مجموعے میں کل تیر مزاح پارے شامل ہیں۔ وہ پڑیے گر بیمار، تو نے پی ہی نہیں، یادداش بخیر، موذی، جنونِ لطیفہ، چارپائی اور کلچر، اور آنا گھر میں مرغیوں کا، کرکٹ، صنف لاغر، موسموں کا شہر، اور کاغذی پیرہن اہم ہیں۔ اس مجموعے کا مقدمہ ''پہلا پتھر'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس کی حیثیت بھی ایک مضمون کی ہے۔ ان مضامین پر رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کا ہلکا سا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ مگر انھوں نے طنز و مزاح میں بہت جلد

اپنا منفرد اسلوب اختیار کرلیا۔

خاکم بدہن یوسفی کے مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 24/ اکتوبر 1969ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ مجموعہ کل 8 مزاح پاروں پر مشتمل ہے۔اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں انھوں نے جملوں کی ساخت اور نوک پلک درست کرنے پر خاص توجہ دی ہے جس کی وجہ سے ان مضامین میں طوالت کے بجائے دلچسپی اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔ان کے پہلے مجموعہ ''چراغ تلے'' میں مزاح موجود ہے مگر طنز کی جھلکیاں کم دکھائی دیتی ہیں۔ان کے برخلاف خاکم بدہن میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج ہے۔

یوسفی کے مضامین کا تیسرا مجموعہ زرگشت ہے۔اس مجموعے میں ان کا مزاح نکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ان میں روانی، سادگی اور صحت مندی کے علاوہ ذہانت کی چمک بھی شامل ہے۔یوسفی نے اس مجموعے کو تحریف نگاری اور زور بیان کی قوت کی وجہ سے پرکشش بنادیا ہے اور اپنی ملازمت اور پیشہ ورانہ زندگی کو ذیلی عنوانات کے تحت بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔اس مجموعے کے مطالعے سے انداز ہوتا ہے کہ ان کی پرورش راجستھان کے ایک کٹر مذہبی خاندان میں ہوئی ہے۔

''آب گم'' یوسفی کے مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب 1990ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ مجموعہ چار سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔اس مجموعے میں انھوں نے کرداروں کی حرکات و سکنات کے ذریعے سے تقسیم وطن کے المیہ سے پیدا ہونے والے حالات کا بیان بڑی فنکاری سے کیا ہے۔اس کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ یہ پانچ کہانی نما خاکے ہیں۔مشتاق احمد یوسفی نے دو مزاحیہ کردار بھی پیش کئے ہیں۔ جو فرضی ہیں۔

آزادی کے بعد لکھنے والے مزاح نگاروں میں شفیق الرحمٰن کا نام بھی اہمیت رکھتے ہے۔ وہ آزادی سے پہلے بھی لکھا کرتے تھے مگر آزادی کے بعد ہی ان کی تحریروں میں پختگی نظر آتی ہے۔ان

کے مزاحیہ مضامین کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔مثلاً وہ حماقتیں،مزید حماقتیں اورلہریں۔

شفیق الرحمٰن کے مضامین کا پہلا مجموعہ ’’حماقتیں‘‘میں کل نومضامین شامل ہیں اور وہ نیلی جھیل، بے بی،تونند،نناوے ناٹ آوٹ، بلڈ پریشر کلب،تمنا،حماقتیں اورتمغہ،پروفیسرعلی بابا وغیرہ میں شامل ہیں۔

شفیق الرحمٰن کے مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ’’مزید حماقتیں‘‘ میں کل دس مجموعے موجود ہیں۔وہ تزک نادری،عرف سیاحت نامہ، ہندیہ ریڈیو روم تھا،کلیدی کامیابی حصہ دوم،شیطانی عینک،ملکی پرندے،سفرنامہ،دونظمیں ٹکسیلا سے پہلے ٹکسیلا کے بعد،زنانہ اوراردوخط وکتابت شامل ہے۔

لہریں ان کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔ یہ جو دس مزاح پاروں پر مشتمل ہے جس میں ریڈیو،زیادتی، ہماری فلمیں بیزاری،ایک نسخہ،قصہ چہار درویش،اورمکان کی تلاش شامل ہیں۔یہ تینوں مجموعے مکتبہ جامعہ لاہور سے شائع ہوئے۔مگر ہندوستان میں یہ تینوں مجموعے فنی حماقتیں،شیطانی عینک اورموسم بہار کے نام سے شائع ہوئے۔

شفیق الرحمٰن نے مزاح پاروں کے ساتھ ساتھ افسانے بھی تصنیف کئے ہیں۔مثلاً شگوفے، مدوجزر، پرواز، پچھتاوے وغیرہ ہیں۔اس کے بعد تین سال تک انھوں نے لکھنا بند کردیا اور بعد میں سفرنامہ تصنیف کیا۔اورانھوں نے ناولٹ طرز کے سفرنامے بھی تصنیف کئے ہیں جو’’نیل‘‘اور’’دھند‘‘ ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے نثری پیروڈیاں بھی لکھی ہیں۔

شفیق الرحمٰن کواردوطنز ومزاح میں وہی مقام حاصل ہے جوانگریزی میں اسٹیفن لیکاک کو حاصل ہے۔بات بات پر ہنساان کی خصوصیت ہے۔یہ خصوصیت اردو کے دوسرے مزاح نگاروں کے حصّے میں نہیں آتی ہے۔ان کی ہر چھوٹی تحریر کواردوادب میں بہت اہمیت حاصل ہے انھوں نے اپنی تحریروں میں لطیفوں کا زیادہ استعمال کیا ہے۔اسکے علاوہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے بھی مزاح پیدا

کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ان کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی موجود ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے ہم عصر مزاح نگار کرنل صمد خاں ہیں۔انہوں نے صرف اپنی ایک کتاب کی وجہ سے طنز ومزاح کی تاریخ میں اپنی جگہ بنالیہے ۔وہ ''بجنگ آمد'' ہے۔اس کا موضوع انہوں نے اپنی فوجی زندگی کو بنایا ہے۔ان کا مزاحیہ سفر نامہ ''یہ سلامت روی'' ہے اس میں یورپ اور ترکی وغیرہ کے سفر کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ''بزم آرائیاں'' ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ان کے اسلوب نے ان کو اپنے طرز کا منفرد مزاح نگار بنادیا۔

اردو کے مزاحیہ ادب میں کرنل محمد خاں کے مزاح کو خصوصی مرتبہ حاصل ہے۔کیونکہ انہوں نے اپنی مزاحیہ تصانیف میں فوجی زندگی کو موضوع کے طور پر برتا ہے۔فوجی زندگی روکھی زندگی ہوتی ہے۔اس میں انہوں نے طنز ومزاح پیدا کیا ہے۔انہوں نے اپنی تصانیف میں ایک فوجی کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ فنی اصولوں کی پابندی بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیف ''بجنگ آمد'' کو طنز ومزاح میں اہم مقام حاصل ہے۔

ابن انشاء ایک شاعر، کالم نگار، سفر نامہ نگار، اور مزاح نگار ہیں۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ان کی پہلی نظم ''بغداد کی ایک رات'' ہے۔یہ نظم 1949ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ غزل میں انہوں نے رومانی اور ڈرامائی انداز کو اپنایا ہے۔

ابن انشا کی پہچان نہ صرف شاعری کی وجہ سے ہے بلکہ وہ مزاح نگار کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔انہوں نے پانچ مزاحیہ سفر نامے تصنیف کئے ہیں۔ان کا پہلا سفر نامہ ''چلتے ہو تو چین کو چلئے'' ہے۔جو 1969ء میں شائع ہوا۔اور دوسرا سفر نامہ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' ہے۔یہ اس کی اشاعت 1971 ء میں عمل میں آئی۔ان کا تیسرا سفر نامہ ''دنیا گول''، 1972ء میں شائع کیا گیا۔ چوتھا سفر نامہ ''نگری نگری پھرا مسافر'' ہے۔اور پانچوں مجموعہ ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' ہے۔ان

سفر ناموں کے علاوہ مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مثلاً'' اردو کی آخری کتاب'' (1971ء) '' خمار گندم'' 1980ء منظر عام پر ان کے دو شعری مجموعے '' چاند نگر'' (1955)اور''بستی کے اس کونے میں''(1976) ہیں۔

ابن انشاء کے بہترین سفر ناموں میں '' چلتے ہو تو چین کو چلئے''ابن بطوطہ کے تعاقب میں اور دنیا گول ہے ہیں۔ یہ سفر نامے نہ صرف ان کے بہترین سفر ناموں میں شامل ہو گے ہیں بلکہ یہ اردو ادب کے بہترین سفر ناموں میں ہیں۔

کرنل محمد خان کے طرح ابن انشا بھی منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔ان کی تحریروں میں نہ گھن گھرج، نہ نفرت اور نہ ہی حقارت کا جذبہ شامل ہے۔ بلکہ ان کی تحریروں میں اعتدال اور عامیانہ رویہ موجود ہے ابن انشا شاعر ہونے کی وجہ سے ان کی مزاح پاروں میں بھی وہی لطافت موجود ہے۔

ابراہیم جلیس اردو کے ممتاز طنز نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے سیاسی اور معاشی ناہمواریوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔اس کے علاوہ حالات حاضرہ پر بھی طنزیہ وار کیا ہے۔ان کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ'' پبلک سیفٹی ریز'' ہے۔اس مجموعے میں تیرہ (۱۳) مضامین شامل ہیں۔ان مضامین میں طنز کا رنگ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے ایسے موضوعات کو انتخاب کیا ہے جس کی وجہ سے مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ نیکی کر تھانے جا، بیٹ بڑا یدکار ہے بابا۔ اوپر شیروانی اور اندر پریشانی، آزاد غلام، چالیس کروڑ بھکاری گورے گئے کالے آئے، بھوکا ہے بنگالی وغیرہ۔

ہندوستان میں فکاہیہ کالم نگاری پر کم وجہ دی گئی جب کہ پاکستان میں اسی کو فروغ حاصل ہوا۔ یہاں کے مشہور کالم نگاروں میں ابراہیم جلیس کے علاوہ، محمد خالد اختر، عطاالحق قاسمی اور طاہر مسعود کے نام شامل ہیں۔

محمد خالد اختر 1912ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے ان کو طنز مزاح نگاری میں اہم مقام حاصل

ہے مزاح نگار رفیق الرحمٰن ان کے ہم جماعت تھے۔انکی ادبی زندگی کا ارتقاء1946ء میں ہوا۔

بیس سو گیارہ خالد اختر کا پہلا طنزیہ ناول ہے۔ یہ ناول 1950ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول میں سیاسی اور سماجی برایوں پر طنز کیا گیا۔اور"چا کی واڑہ میں وصال"ان کا دوسرا طنزیہ ناول ہے۔اس ناول کو52-1951 میں لکھا گیا۔اوراس کی اشاعت 1960ء میں عمل میں آئی۔اس ناول میں چا کی واڑہ کے گلی کوچوں کے حالات اوران کے دن رات کی زندگی کو پر لطف انداز میں بیان کیا گیا۔

کھویا ہوا افق خالد اختر کے مزاحیہ مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تصنیف 1968ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔اس کے لئے انہیں 1969ء میں آدم جی ادب ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔اور"دو سفر"میں ان کے مختلف سفر نامے شامل ہیں۔اس کو 1984ء میں کتابی صورت دی گئی۔ان کی ایک اور تصنیف عبد الباقی کی کہانیاں ان کے مختلف کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کہانیوں کا مجموعہ 1985ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ ان کہانیوں میں شامل دو کرداروں کا شمار اردو کے اہم مزاحیہ کرداروں میں ہوتا ہے۔ وہ چچا عبد الباقی اور بھتیجا بختیار کے کردار ہیں۔ان کی تصنیف"ابلیس جہاں میں" ہےاس میں بچوں کے کہانیاں شامل ہیں۔ان کہانیوں کو انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔خلالد اختر نے مزاحیہ مضامین اور کہانیوں کے علاوہ خطوط بھی تحریری کئے ہیں۔"مکاتیب خضر"ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ان خطوط میں سماجی اور سیاسی برائیوں پر طنز کیا گیا ہے۔اس مجموعے کی اشاعت 1989ء میں ہوئی۔ان کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ہر تصنیف میں طنز و مزاح کو برقرار رکھا ہے۔

وجاہت علی سندیلوی بھی اردو کے اہم مزاح نگاروں میں شامل ہیں۔انہوں نے مزاح کے لئے خام مواد اپنے آس پاس کے ماحول سے لیا ہے۔ان کی تخلیقات میں باقیات غالب، دھوپ کی عینک،طشت از بام،دودھ کے دھلے۔الکشیتات، گونگی حویلی، بے ضابطہ اور بے ساختہ وغیرہ شامل ہیں۔

وجاہت علی سندیلوی کے افسانے میں افسانوں کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح بھی دکھائی دیتا ہے۔اس کے مثال تربوز، الیکشن کا قبط شرافت، اور برکت ایک چھینک کی، وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔انہوں نے تخلص بھوپالی اور عبدالمجید سالکی کی طرح متوسط طبقوں کی گھریلو زندگی اور ان کے رسم و رواج وغیرہ کو موضوع ہے۔ان کے مزاحیہ مضامین میں شوخی اور شگفتگی ملتی ہے۔

ابن صفی کا اصلی نام اسرار احمد تھا۔وہ پہلے طغرلؔ، فرغانؔ اور اسرار ناروؔی کے نام سے مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ یہ مضامین ممبئ شاہد ویکلی اور الہ آباد کے نکہت میں شائع ہوتے رہے۔اس کے علاوہ انہوں نے کراچی سے دو تفریحی ڈائجسٹ بھی نکالے۔ان میں ایک پندرہ روزہ ''نئے افق'' ہے تو دوسرا ماہنامہ ''نیارخ'' ہے۔ان میں ابن صفی کے جاسوسی ناول کے ساتھ دوسرے فن کاروں کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین پر مشتمل ایک خصوصی شمارہ ''نیرنگ'' دہلی نے 1980ء میں نکالا تھا۔اس میں ان کے چار جاسوسی ناولوں کے ساتھ ساتھ ان کی 15 مزاحیہ کہانیاں بھی شائع کی گئی تھیں۔

ابن صفی کے مزاحیہ مضامین میں پردیسی لٹیرا، قابل اعتراض، تصویر، شمیر فائنڈ، چراغ اللہ دین، چاپلوسی، شیر کا شکار، ہوائی قلعہ، ڈپلومیٹ مرغ، اب کدھر جاؤں، لالوکھیت کا خلیفہ، میں نے لکھنا کیسے شروع کیا۔بقلم خود، ایک ادبی نشست، میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں، دیوانے کی ڈائری وغیرہ اہم ہیں۔انہوں نے مضامین کے علاوہ پرنس چلی اور تزک دوپازی جیسے ناول بھی تصنیف کئے ہیں۔

ابن صفی کی ناول نگاری کا آغاز 1952ء میں ہوا، انکا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' ہے۔ان کا مزاحیہ ناول، ''تزکردوپیازی'' ہے۔یہ ناول ''نئے افق'' میں قسط وار چھپتا رہا۔اس ناول کا اہم کردار ''ملا دوپیازہ'' ہے۔اس کردار کو نئے اور جدید واقعات کے ذریعے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

بھارت چند کھنہ کا شمار اردو کے کہنہ مشق مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔وہ یہ زندہ دلان حیدرآباد

کے برسوں تک صدر رہے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے چار مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جو مصیبتیں، مسکراتے آنسو، ٹھنڈی بجلیاں اور تیر نیم کش ہیں۔ ان مجموعوں میں مسکراتے آنسو افسانوں کو مجموعہ ہے اور مصیبتیں اور ٹھنڈی بجلیاں مضامین کے مجموعے ہیں۔ تیر شیر کشی مضامین اور ڈراموں کا مجوعہ ہے۔ اور کیا نام نہ ہوگا مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مجموعہ 1977ء میں منظر عام پر آیا۔ بھارت چند کھنہ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ سماجی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں طنز سے زیادہ مزاح دکھائی دیتا ہے۔

یوسف ناظم کا شمار اردو کے اہم مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ خاکے، تبصرے، سفر نامے اور تنقیدی مضامین پر بھی طبع آزمائی کی ہے ان کی تخلیقات میں مزاح شامل ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز کم اور مزاح زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی مزاح نگاری کی شروعات 1944ء سے ہوئی۔

یوسف ناظم کے بارہ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں وہ کیف وکم، فٹ نوٹ، دیواراتے، سائے ہمسائے، فی الحال، البتہ اور رفقط کا شمار ان کے مشہور مجموعوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کرنے اور لفظوں کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔ میں چنانچہ ان کی مزاح نگاری کے بارے قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''یوسف ناظم موقع ومحل کی نسبت سے اور اکثر حدِّ اعتدال میں ان دونوں سے کام لیتے ہیں وہ روز مرہ زندگی کے کسی چھوٹے سے واقعہ یا عام مشاہدے کو تلازمات، تبصروں اور ظریفانہ دلیلوں کے ذریعہ معنی خیز بنا دیتے ہیں۔ طول کلام اور ابتذال سے بچ کر لفظوں کی رعایت اور الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے کا جیسا ہنر وہ جانتے ہیں۔ وہ اس دور کے کم مزاح نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔ آداب عرض، دیوارے، نام رکھنا اور دوسرے بے شمار مزاحیوں اور خاکوں میں

انھوں نے اسی وصف اور تکنیک سے کام لیا ہے‘‘۔29؎

یوسف ناظم کی مزاح کے ذریعے قہقہہ لگانے کے بجائے زیرلب تبسم پیدا کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے طنز سے کسی پر وار کیا ہے، اس بات کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا ہے۔اور انہوں نے ہمیشہ نئے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔

سلیمان خطیب 1919ء میں پیدا ہوئے ۔دکنی زبان کے مزاحیہ شاعروں میں ان کو اہم مقام حاصل ہے۔بقول رشید شکیب سلیمان خطیب حیدرآباد کے چار میناروں میں سے ایک مینار کا درجہ رکھتے ہیں۔ان کی شاعری میں کنڑی، تلگو کے علاوہ مرہٹی زبان کے اثرات بھی ملتے ہیں۔وہ ایک عوامی شاعر تھے۔اپنی شاعری میں سماجی ، معاشرتی اور معاشی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔انہوں نے عوامی موضوعات پر قلم اٹھایا۔اور اپنی شاعری میں نئے اشعارات اور تشبیہات کو بھی استعمال کیا۔معاشی مسائل پر مبنی ان کی نظموں میں ساس بہو، چھورا چھوری، پہلی تاریخ، ایک کلرک کی بیوہ، سانپ، یادِ کلیم، قابل ذکر ہیں اور رومانی نظریات پر مشتمل نظموں میں محبوب صاحب اور محبوب بی، پروسن، دکنی عورت کا انتظار، ہمالہ کی چاندی، موٹ کا پانی، دل کی تبدیلی، کہنی، چینی گڑیا، سن ری گوری، رستے اور جھاڑ وتار قابل ذکر ہیں۔ان کے کلام میں طنز و مزاح دونوں کا حسین امتزاج ہے۔انہوں نے تقریباً 20 سال سے دکن میں شاعری کی ہے۔دکنی شاعری کی وجہ سے انھیں نہ صرف دکن میں پسند کیا جاتا تھا بلکہ دیگر شہروں میں بھی وہی مقبولیت حاصل ہے۔

دلیپ سنگھ ایک بڑے مزاح نگار ہیں۔مگر انہوں نے اپنے عمر کے آخری دہائی میں مزاح نگاری کی طرف توجہ کی۔انہوں نے مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ ریڈیائی ڈرامے، خاکے، آپ بیتی، سفر نامے، کالم نگاری، کے علاوہ ٹیلی ویژن کے لئے مزاحیہ سیریل پر بھی لکھے ہیں۔ان کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مضمون ’’معذرت نامہ‘‘ ہے۔اس کو رسالہ شاعر میں شائع کیا گیا۔اس میں انہوں نے کتابوں

کے تبصروں پر خاکہ اُڑایا ہے۔اس مضمون کی مقبولیت نے لکھنے میں تیزی بڑھادی،جس کی وجہ سے ان کے دیر سے لکھنے کا گلہ بھی دور ہوگیا۔ وہ مزاحیہ مضامین کے ساتھ روز نامہ قومی آواز میں ’’گلِ گفت‘‘ کے عنوان کے تحت فکاحیہ کالم بھی لکھا کرتے تھے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ کی پیدائش مئی 1924ء میں رائچور میں ہوا۔انہوں نے نویں جماعت سے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے لئے کہانیاں اور مضامین لکھے۔ان کی ایم۔اے کی تعلیم کے دوران ان کی کہانیوں کا مجموعہ ’’جلترنگ‘‘ شائع ہوئی۔ان کی دوسرے تصانیف میں حیدرآباد کے ادیب،تلگوادب کی تاریخ،کلیات ثانی قابل ذکر ہیں انہوں نے بچوں کے لئے دو کتابیں تصنیف کی ہیں، وہ محبّ وطن خواتین اور بہادرعورتیں اس کے علاوہ طنز ومزاح سے بھرپور ان کے مضامین روز نامہ سیاست میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے قابل ذکر کارناموں میں نوسر بار کی تنقیدی و تدوین ہے یہ ان کے پی۔ایچ۔ڈی،کا مقالہ ہے حیدرآباد کے مختلف علمی،ادبی اداروں اورانجمنوں سے وابستگی رہی ہے۔

غلام سرورخاں نام بھی اہم مزاح نگار ہیں ان کی پیدائش 1925ء میں حیدرآباد میں ہوئی، دکنی زبان کے مزاحیہ شعراء میں سرور ڈنڈا کو نام اور شہرت حاصل ہے۔جنہوں نے طنز ومزاح کے ذریعے سماجی،معاشرتی،اخلاقی،مذہبی اور سیاسی موضوعات پر نشتر چلاتے ہیں۔انہوں نے گیت،غزل ،رباعی اور نظم میں قطعہ طبع آزمائی کی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کے لئے شہری اور دیہاتی عوام کے احساسات کوموضوع بنایا ہے۔ان کی شاعری کے وجہ سے لبوں پر مسکراہٹ تو ضرور آتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی نم ہوجاتی ہیں۔

احمد جمال پاشا اردو کے اہم مزاح نگاروں میں سے ہیں۔ان کا خاص میدان خاکہ نگاری اور تحریف نگاری ہے۔ وہ مجتبٰی حسین کی طرح سماج کی برائی کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔انہوں نے تقریباً پچیس کتابوں کو تخلیق کیا ہے۔ان میں فن لطیفہ گوئی،شوکت تھانوی کی مزاحیہ

صحافت، لذت آزاد، ستم ایجاد، مجاز کے لطیفے، مضامین پاشا، چشم حیراں ظرافت، تنقید اندیشہ شہر، پتیوں پر چھڑکاؤ، ادب میں مراشل لا، مشکر کا چکر، اقبال کی تلاش میں، مونچھیں، رستم امتحان کے میدان میں، کتے کا خط پطرس کے نام اور میزبان بے زبان وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے عبدالعلیم کی شخصیت پر ایک خاکہ بھی تخلیق کیا ہے۔

احمد جمال پاشا نے پیروڈی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس میں ان کا اہم کارنامہ کپور۔ ایک تحقیقی مطالعہ'' ہے اس میں رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، عبادت بریلوی، کلیم الدین احمد، اور قاضی عبدالودود کی پیروڈیاں پیش کی ہیں اور ''ادب میں مارشک لاء'' بھی ان کی پیروڈی ہے۔ اس میں فوجی مارشل کی پیروڈی بیان کی گئی ہے۔ یہ پیروڈی ان کا شاہکار ہے۔

احمد جمال پاشا کا آخری مجموعہ ''پتیوں پر چھڑکاؤ'' ہے۔ یہ مجموعہ طنز کی اچھی مثال ہے۔ ان کے انتقال کے بعد عابد سہیل نے ان کے عمدہ مضامین کو انتخاب کر کے ''انتخاب مضامین احمد جمال پاشا کے نام سے 1988ء میں شائع کیا۔ ان کی تصنیف ''اردو کے چار مزاحیہ شاعر'' ہے۔ جو طنز و مزاح پر ان کی تنقیدی کتاب ہے۔

احمد جمال پاشا کے مضامین ''مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہوس میں''، رستم میدان، چائے کی پیالی، وگیرہ میں بھی مزاح کی خصوصیات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے روزنامہ قومی آواز'' میں گلوریاں کے عنوان سے کالم بھی لکھے ہیں۔ ان کے کالموں میں مزاح کے ساتھ طنز کی کاٹ بھی موجود ہے اور کالم نگاری میں کرسی، سڑک کا گھیراؤ، رشوت، ٹیکس، وغیرہ یادگار نمونے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے لکھنا بند کر دیا اور اپنی عمر کے آخری وقت تک نہیں لکھا۔

شفیقہ فرحت 1931ء میں پیدا ہوئیں۔ مزاح نگاری میں ان کو اہم مقام حاصل ہے۔ تقریباً 35 سال سے لگاتار لکھ رہی ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے

ہیں۔ وہ لوآج ہم بھی، رانگ نمبر، اور گول مال شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بہترین مضامین میں زندگیوں بھی گزر رہی جاتی اوراندیشہ ہائے دوردراز شامل ہیں۔ان کے ہاں موضوعات کی تنوع ہے۔ان کے مضامین میں کرکٹ سے لے کر کرسی تک تمام مسائل کو پیش کیا گیا۔انہوں نے بچوں کے لئے بھی شگفتہ ادب تحریر کیا ہے۔

شفیقہ فرحت کے ساتھ خواتین طنز ومزاح نگاروں میں سلمی صدیقی کا نام آتا ہے۔ وہ اردو کے اہم مزاح نگار رشید احمد صدیقی کی بیٹی ہیں۔ان کومزاح وراثت میں ملی تھی۔طنز ومزاح میں ان کا اہم کارنامہ ''سکندر نامہ'' ہے۔ان کے باورچی سکندر کی مضحکہ خیز حرکتوں کی داستان ہے۔اس میں مرکزی کردار کے اردگرد کی ماحول کوطنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔دراصل ایک مزاحیہ ناولٹ۔اس کے علاوہ انہوں نے کئی مزاحیہ مضامین اورخاکے بھی تصنیف کئے ہیں۔چنانچہ خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں:

> ''ایک حساس اور ذہین عورت کی نگاہ سے دنیا کو دیکھتی ہیں اوراس موڈ میں مزاح بکھیرتی ہیں۔ ہلکا پھلکا، شگفتہ مذاق، زبان کی لطافت اور سلاست کے ساتھ نفسیات پر بھی گہرے مشاہدے کوقلم بند کرتی ہیں تو مزاح کے دریا بہہ نکلتے ہیں۔مزاح ان کو اپنے نامی گرامی والد کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔عشق نے اس جوہر میں چار چاند لگا دیئے ہیں''۔30؎

سلمی صدیقی نے سکندرنامہ کے علاوہ نقاب اور چہرے، مٹی کا چراغ بھی تخلیق کئے ہیں۔

مجتبٰی حسین دور حاضر کے ممتاز اور منفرد مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کالم نگاری سے کیا۔ وہ پبلک اڈمنسٹریشن میں ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد روزنامہ سیاست میں صحافی کی خدمات انجام دیتے رہے۔روزنامہ سیاست میں اس وقت شاد صدیقی کالم لکا کرتے تھے۔ان کا انتقال 12/اگسٹ 1962ء میں ہوا۔تو یہ ذمہ داری مجتبٰی حسین کوسونپی گئی۔اس طرح سے ان کی کالم نگاری کا آغاز ہوا۔وہ روزنامہ سیاست میں ''کوہ پیما'' کے قلمی نام سے لکھا کرتے

تھے۔اس کے بعد وہ ''میرا کالم'' کے عنوان کے تحت باقاعدہ کالم لکھنے لگے اور یہیں سے ان کی مزاح نگاری کا بھی آغاز ہوا۔

مجتبیٰ حسین نے کالم نگاری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مضامین، مزاحیہ خاکے اور سفر نامے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد درجن سے زیادہ ہے۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''تکلف برطرف'' کی اشاعت 1968ء میں عمل میں آیا۔ان کی تصانیف میں قطع کلام، بہر حال، قصہ مختصر، بالآخر، جاپان چلو جاپان چلو، آدمی نامہ وغیرہ اہم ہیں۔ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ''ہم طرف دار ہیں غالبؔ کے'' ہے۔ان کے مزاحیہ مضامین میں زندگی کے تمام مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ان مضامین میں مزاح کے ساتھ ساتھ انسان دوستی اور دردمندی کا احساس بھی موجود ہے۔مجتبیٰ حسین کے مزاح نگاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے نامی انصاری لکھتے ہیں:

> ''مجتبیٰ حسین نے زندگی اور اس کے مظاہر کو ایک متوسط طبقے کے آدمی کے زاویہ نظر سے دیکھا اور برتا ہے۔اس لیے ان کے مضامین میں زندگی کے تلخ و ترش و شریں سبھی ذائقے موجود ہیں۔ان کے مزاح میں طنز کی ہلکی سی تلخی ضرور ہوتی ہے مگر اس کے پیچھے انسان دوستی اور دردمندی کی ایک زیریں لہر ہمیشہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ان کا مزاح انسانی صورتحال کی نہ صرف اخلاقانہ مصوری کرتا ہے بلکہ خرابیوں کو بدلنے کی زیریں خواہش کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے۔31''

آزادی کے بعد کے مزاح نگاروں میں فکر تونسوی کے ساتھ مزاحیہ کالم نگار کی حیثیت سے مشفق خواجہ بھی شامل ہیں۔فکر تونسوی اور مشفق خواجہ میں فرق یہ ہے کہ فکر سیاسی اور سماجی کالم نگار تھے جب کہ مشفق خواجہ اردو کی ادبی کتابوں، شاعر وادیبوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔انہوں نے ہفت روزہ فکر میں خامہ بگوش کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔اس اخبار میں شائع ہونے والے تحریروں کو اکٹھا کر کے

مظفر علی سید نے ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

ان مزاح نگاروں کے علاوہ عامر عثمانی، نریندر لوتھر، ڈاکٹر حبیب ضیاء، طالب خوندمیری، نسیمہ تراب الحسن، عطاء الحق قاسمی، اظہر مسعود، مجید بیدار اور روؤف رحیم نے خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔

غرض اردو ادب میں طنز و مزاح کی اس مضبوط و مستحکم روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شعراء وادیبوں اس صنف کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ طنز و مزاح نگاروں نے نہ صرف سماجی، تہذیبی، سیاسی مسائل کی طرف توجہ صرف کی بلکہ بعض ادبی مسائل پر بھی لکھ کر اردو ادب سے ان کی وابستگی کا اظہار کیا ہے، ان شعراء اور ادباء کے یہاں طنز کے نشتر کے ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے، زبان و بیان اور اسلوب و تکنیک کے تجربے بھی ملتے ہیں، غرض اردو طنز و مزاح کے فروغ میں اردو ادیبوں کے شعراء نے اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔

☆☆☆

حواشی

1۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی،طنز ومزاح کا تجزیاتی مطالعہ،مشمولہ،طنز ومزاح تاریخ وتنقید ماہنامہ شان ہند،دریا گنج نئی دہلی،1986ء ص 8

2۔ڈاکٹر محمد طاہر،مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات،شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج،اعظم گڑھ،2003ء ،ص51

3۔وزیر آغا،اردوادب میں طنز ومزاح،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،2007ء،ص:86

4۔خواجہ عبدالغفور،طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ،موڈرن پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،1983ء،ص:237

5۔نثار احمد فاروقی،اردوادب میں طنز ومزاح کی روایت،مشمولہ،طنز ومزاح تاریخ وتنقید،،نئی دہلی،1986ء، ص:125

6۔شوکت سبزواری،اردوشاعری میں طنز،طنز ومزاح تاریخ وتنقید، نئی دہلی،1986ء،ص105

7۔ڈاکٹر محمد طاہر،مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات، شبلی نیشنل پوشٹ گریجویٹ کالج،اعظم گڑھ،2003ء، ص54

8۔شوکت سبزارواری،اردوشاعری میں طنز، طنز ومزاح تاریخ وتنقید،ماہنامہ شان ہند،نئی دہلی،1986ء، ص103

9۔اردوادب میں طنز مزاح کی روایت،اودھ پنچ کے طنز ومزاح نگار،اردو اکادمی،دہلی،2005ء،ص:120

10۔ڈاکٹر خورشید اسلام،طنز وظرافت،طنز ومزاح تاریخ وتنقید،ماہنامہ شان ہند،دریا گنج،نئی دہلی،1986ء، ص15

11۔نثار احمد فاروقی، اردوادب میں طنز ومزاح کی روایت،طنز ومزاح تاریخ تنقید،ماہنامہ شان ہند،نئی دہلی، 1986ء،ص128

12۔شوکت سبزاری،اردوشاعری میں طنز،طنز ومزاح تاریخ وتنقید ماہنامہ شان ہند،نئی، دہلی، 1986،ص 109

13۔خواجہ عبدالغفور، طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ,1983ء ص229
14۔سیدہ جعفر، نظم میں طنز و مزاح کے نئے رجحانات، طنز و مزاح، تاریخ تنقید، ماہنامہ شان ہند، نئی دہلی، 1986ء، ص135
15۔ڈاکر طاہر تونسوی، طنز و مزاح کا تجزیاتی مطالعہ، طنز و مزاح تاریخ تنقید، ماہنامہ شان ہند، نئی دہلی، 1986ء، ص9
16۔وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2007، ص205
17۔نامی انصاری، بیسویں صدی میں طنز و مزاح، غفیف آفسٹ پرنٹرس، نئی دہلی، 2002، ص74
18۔ وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2007، ص:223
19۔نامی انصاری، بیسویں صدی میں طنز و مزاح، غفیف آفسٹ پرنٹرس، دہلی، 2002، ص18، ۲۶۔
20۔اردو ادب کو خواتین کی دین، اردو کے طنز اور مزاحیہ ادب میں خواتین کا حصہ، شفیقہ فرحت، اردو اکادمی، 1994، ص:125، 27
21۔ ڈاکٹر صادقہ ذکی، ادب خواتین اور سماج، اردو مزاح نگاری اور خواتین، لبرٹی آرٹ پریس، 1996، ص 109:
22۔بیسویں صدی میں طنز و مزاح، نامی انصاری، غفیف آفسٹ پرنٹرس، دہلی 2002، ص:115
23۔رشید احمد صدیقی آثار و اقدار، مضامین رشید، وحید اختر، ص:85
24۔طنز و مزاح تاریخ تقنید، اردو طنز و مزاح کے ہم سائی، مجتبیٰ حسین، ماہنامہ شان ہند، نئی دہلی، 1986، ص:114
25۔طنز و مزاح کے تنقیدی جائزے، خواجہ عبدالغفور، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1983ء، ص:239
26۔طنز و مزاح تاریخ و تنقید، مشمولہ، اردو طنز و مزاح کے پچیس سال، مجتبیٰ حسین، ماہانہ شان ہند، نئی دہلی، 1986، ص:117
27۔ آزادی کے بعد دہلی میں طنز و مزاح، مظفر حنفی، اردو اکادمی، دہلی 1992، ص:21
28۔طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ، خواجہ عبدالغفور، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1983، ص:235

29۔طنز و مزاح تاریخ و تنقید، مشمولہ، عصر حاضر میں اردو طنز و مزاح، ڈاکٹر قمر رئیس، ماہنامہ شان ہند، نئی دہلی، 1981ء، ص:91

30۔طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ، خواجہ عبدالغفور، مذان، پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1983ء، ص:242

31۔اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، مشمولہ، اردو نثر میں طنز و مزاح آزادی کے بعد، نامی انصاری، اردو اکاڈمی دہلی، 2005ء، ص:112

☆☆☆

باب چہارم

اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح نگاروں کے حوالے سے

(الف) پس منظر

تیز رفتاری کے اس دور میں جب فاصلوں کی طرح اشیاء بھی تیزی سے سمٹنے لگیں تو ادب بھی ہمارے اس مجموعی معاشرتی رویے سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھتے ہیں دیکھتے داستانوں کی جگہ ناول ۔ ناول کی جگہ مختصر افسانہ، اور مختصر افسانے کی جگہ خاکے نے لے لی، اس کی وجہ یہ بھی رہی کہ پرانے زمانے میں شام کو سب لوگ کام کر کے تھک کر آتے ہیں۔ تو ان کے پاس وقت گزاری کا ذریعہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ لوگ داستانیں سن کر اپنا وقت کاٹتے تھے۔ مگر آج کے زمانے میں وقت کی کمی کی وجہ سے داستانوں کی جگہ خاکے نے لے لی ہے۔ کیوں کہ خاکے کے لیے اتنا وقت نہیں لگتا ہے جتنا داستان کے لئے درکار ہے۔ اس لئے موجودہ دور میں خاکہ نگاری کی طرف توجہ دیا جا رہا ہے۔

خاکہ اردو کی نثری صنف ہے جو مغرب کے زیر اثر اردو میں آئی۔ خاکہ کو انگریزی میں Sketch کہتے ہیں جس کے لغوی معنی کچا نقشہ، چربہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں۔ لیکن ادبی اصطلاح میں خاکہ سے مراد کسی شخصیت کی قلمی تصویر ہوتی ہے۔ جس میں ان کی شکل و صورت، کے ساتھ ساتھ اس کے طرز زندگی، عادات و اطوار، گفتگو، چال ڈھال، رہن سہن، حلیہ، مزاج و پسند ناپسند وغیرہ کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ قاری کے ذہن میں ایک شخص کی مکمل تصویر ابھر جاتی ہے۔

خاکہ نگاری کے اولین نقوش قدیم شعراء کے تذکروں میں دیکھنے میں کو ملتے ہیں۔ تذکروں میں شاعر کی ذات کے متعلق چند تعارفی جملے، اور اگر شاعر زیادہ معروف ہو تو ان کی زندگی کا ایک آدھ

واقعہ بھی بیان کیا جاتا تھا۔ساتھ ہی کلام کا کچھ حصہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔مگر ان تعارفی جملوں اور ان واقعات سے مجموعی طور پر کوئی واحد تاثر قائم نہیں ہوتا اور نہ ہی پوری طرح سے شخصیت اجاگر ہو پاتی ہے۔اس کے علاوہ تذکروں میں شاعر کے بارے میں جانبداری سے کام لیا جاتا ہے۔صنف خاکہ کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس میں غیر جانبداری کا خیال رکھا جاتا ہے۔اس طرح تذکروں میں خاکہ نگاری کے ہلکے پھلکے نقوش ملتے ہیں۔اس طرح یہ خاکہ لکھنے کی پہلی کوشش تھی۔

تذکروں کی ترقی یافتہ شکل ''آب حیات'' ہے محمد حسین آزاد کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ قدیم تذکروں سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی طبیعت اور عادات واطوار کا حال کھلتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ کتاب اس نقطہ نظر سے لکھی اس کی وضاحت انھوں نے دیباچہ میں اس طرح سے کی ہے کہ ''خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم یا مختلف خیال کو مدنظر رکھ کر لکھی ہے۔

تذکروں میں متفرق مذکور، انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی، چلتی، پھرتی تصویر سامنے آن کھری ہوں۔''

محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں شاعروں کی شکل وصورت ان کی جسامت، لباس، وضع قطع، تراش خراش کو پیش کردینے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں ان کی توجہ چہرہ نویسی سے زیادہ لباس پر زور دیا ہے۔جن شعراء کے لباس سے متعلق ان تک تفصیلی معلومات پہنچ گئی ہیں، ان کو گویا تصویر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔انھوں نے اس انداز سے بیان کیا ہے۔تمام شاعر واقعی ہمیں پہلی بار چلتے پھرتے، بولتے چلتے نظر آتے ہیں۔انھوں نے ہر فرد کی انفرادیت اجاگر کرنے کے ساتھ اس دور کی مکمل تہذیب بھی پیش کردی ہیں، ان تمام معلومات کے بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا رجحان سوانحی ہے۔سوانحی رجحان کے باوجود اس کی حیثیت ایسی پہلی کتاب کی تھی جس نے خاکوں کو شعور دیا۔

اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا 1927ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' لکھ کر اردو میں خاکہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ان کو اردو کے پہلے خاکہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔انھوں نے اپنے استاد نذیر احمد دہلوی کے واقعات وحالات کو اس طرح سے ترتیب دیا ہے کہ وہ مضمون خاکے کا شکل اختیار کر لیا۔اس میں انھوں نے نذیر احمد کی شکل و سورت ،لباس ، وضع قطع ، ان کی صبح سے لے کر شام تک کی جملہ مصروفیات وغیرہ بہترین اسلوب کے ذریعے پیش کیا ہے۔مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی کمیوں کا ذکر بھی ایسے ہمدردانہ انداز میں کیا ہے کہ ہمیں ان کی شخصیت سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ ان سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ان کا ایک اور خاکہ ''ایک وصیت کی تعمیل میں'' کے عنوان کے تحت ہے۔اس میں مولوی وحید الدین سلیم کی شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مرزا فرحت کے علاوہ مولوی عبدالحق نے بھی خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ چند ہم عصر ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔اس میں انھوں نے اپنی جانی پہچانی ،معروف وغیر معروف لوگوں کے حالات اور کارنامے لکھے ہیں لیکن ان کے خاکوں میں ہمیں مزاحیہ اسلوب نظر نہیں آتا۔ وہ گنجہائے گراں مایہ، ہم نفساں رفتہ ، اور ہمارے ذاکر صاحب ہیں۔ ان خاکوں کے لئے انھوں نے ایسی شخصیات کا انتخاب کیا ہے،جن سے طویل عرصہ سے ان کے روابط رہے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے علاوہ چراغ حسن حسرت ،شوکت تھانوی ،خواجہ حسن نظامی ، سعادت حسن منٹو، شاہد احمد دہلوی ، اشرف صبوحی ، عصمت چغتائی ، شفیق الرحمٰن ،عطا الحق قاسمی ، یوسف ناظم ،فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے مزاحیہ خاکے لکھ کر اردو میں ایک نئے اسلوب کو جگہ دی ہے۔

☆☆☆

(ب) مزاح نگاروں کی خاکہ نگاری

یہاں اردو کے اہم مزاح نگاروں کی خاکہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا جا رہا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ (پیدائش 1883۔وفات 1947)

مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاندان شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان آیا تھا، ان کے دادا کا نام عبداللہ بیگ تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا حشمت اللہ بیگ اور والدہ کا نام مرزا مشرف جہاں بیگ تھا۔فرحت اللہ بیگ کی ولادت ستمبر 1883ء میں ہوئی۔ان کے لڑکپن ہی میں ان کے والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔اس لئے ان کی پرورش ان کی پھوپھی حسن جہاں بیگم نے کی اور انھیں کو وہ اپنی ماں سمجھتے تھے۔ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری بھی ان کی پھوپھی ہی نے اٹھائی تھی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے قرآن اور دین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اس کے بعد کشمیری دروازے کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔انھوں نے اسکول میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ کرکٹ اور فٹ بال کے کھیل میں بھی نام پیدا کیا۔ 1901ء میں انھوں نے ہندو کالج میں داخلہ لیا۔یہیں سے انھیں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ 1903ء میں انھوں نے سینٹ اسٹفینز کالج سے داخلہ لیا اور یہیں سے 1905ء میں اچھے نمبروں سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔1905ء کے بعد اسی کالج میں انھوں نے ایم۔اے کی کلاسیس کو جاری رکھے مگر گھر کے حالات کی وجہ سے وہ امتحان نہیں دے سکے۔اور پھر ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ 1907ء میں ملازمت کی غرض سے حیدرآباد چلے آئے اور آخری عمر تک یہیں پر قیام پذیر رہے۔حیدرآباد میں ملازمت کا سلسلہ ہیڈ ماسٹری سے شروع ہوا تھا۔اس کے بعد ترقی کرتے کرتے سیشن جج کے عہدے تک پہنچے۔سیشن جج کی حیثیت سے گلبرگہ میں ان کا تقرر ہوا۔ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد حیدرآباد میں ایک ادبی تنظیم ''اردو مجلس'' کے نام سے قائم کی تھی 27/اپریل 1947ء

کوحیدرآباد میں ان کا انتقال ہوا۔حیدرآباد کے الہٰی چمن کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار اردو کے اہم مزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے۔وہ ایک اچھے مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ خاکہ نگار، ادبی محقق، اور شاعر بھی تھے۔ان کا قلمی نام ''الم نشرح'' تھا۔کئی مضامین اسی نام سے لکھے تھے۔ان کی مضمون نگاری کا آغاز رفیق اللہ بیگ کے رسالہ ''نمائش'' سے ہوا۔اس سے پہلے مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون ''ہم اور ہمارا امتحان'' 1919ء میں رسالہ افادہ میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ خوش مذاقی کل کا گھوڑا، کم سنی کی شادی وغیرہ جیسے مضامین لکھے۔ان کے جن تین مضامین کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی''، ''دہلی کا یادگار مشاعرہ''، ''پھول والوں کی سیر'' ہیں۔انھیں مضامین نے انھیں اردو ادب میں بے حد مقبول کیا۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''میری شاعری'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

علم و ادب سے انھیں طالب علمی کے زمانے ہی سے رغبت تھی انھیں کتب بینی کا بھی بہت شوق تھا۔وہ کتب فروشوں سے ڈھیروں کتابیں لاتے اور ان کو اس انہماک سے پڑھتے تھے کہ اکثر کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا کہا جاتا ہے کہ ان کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً دو ہزار کتابیں تھیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ بنیادی طور پر ایک مزاح نگار تھے۔لیکن انھوں نے خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی ہے۔حالاں کہ انھوں نے زیادہ تر مضامین ہی لکھے ہیں۔لیکن ان کا مضمون ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کی وجہ سے وہ اردو کے پہلے باضابطہ خاکہ نگار کی حیثیت سے پہنچانے جانے لگے۔اس کے علاوہ ان کا مضمون ''ایک وصیت کی تعمیل میں'' بھی ایک عمدہ خاکہ ہے۔اس خاکے میں مولوی وحید الدین سلیم کی شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔یہ خاکہ خود مولوی وحید الدین سلیم کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔

''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' 1927ء میں شائع ہوا۔اس کو مولوی عبدالحق

کے اصرار اور ہمت افزائی کی وجہ سے لکھا تھا۔ کیونکہ پہلے وہ نذیر احمد کے تعلق سے بہت کچھ لکھ کر پھاڑ چکے تھے۔ اس موقع پر مولوی عبدالحق نے انھیں ہمت دی اور کہا کہ ''دل کی بات مانو'' اور انھوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے فرحت اللہ بیگ لکھے ہیں:

> ''بہت کچھ لکھا لکھ لیا تھا، وہ پھاڑ ڈالا کہ کہیں ایچن چھوڑ گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ انھوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کا حوالہ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا۔ خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا۔ وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کر دوں گا، تاکہ اس مرحوم کی اصل اور جیتی جاگتی تصویر کھینچ جائے اور یہ چند صفحات، ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو''۔1

اس اقتباس سے فرحت اللہ بیگ کی صاف گوئی اور غیر جانبداری واضح طور پر نظر آتی ہے انھوں نے بالکل حقیقی واقعات کو جوں کا توں رقم کر دیا ہے۔ خامیوں اور خوبیوں کے بیان میں غیر جانبداری سے کام لیا اور کسی طرح کی عقیدت مندی اور تعصب کو ملحوظ نہیں رکھا جو کہ خاکہ نگاری کا تقاضہ بھی ہے۔

فرحت اللہ بیگ کا ایک اور خاکہ ''ایک وصیت کی تعمیل میں'' ہے۔ اس خاکے میں مولوی وحیدالدین سلیم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ خاکہ انھیں کی خواہش پر لکھا گیا تھا۔ مگر افسوس کہ یہ خاکہ ان کی وفات کے بعد تحریر ہوا اور وحیدالدین سلیم مرحوم خود اس خاکے سے لطف اندوز نہیں ہو سکے۔ چنانچہ فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

> ''مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملا جو مرنے

کے بعد اس رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے۔ بسم اللہ کیجیے مر جایئے۔ مضمون میں لکھ دوں گا۔ کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا''۔2؎

مذکورہ اقتباس سے علم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خاکے لکھنے کی وجوہات بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ اس سے ان کی پُر مزاح طبیعت کا علم ہوتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اردو کے پہلے خاکہ نگار ہیں اس کے باوجود ان کے خاکوں میں خاکہ نگاری کے تمام فنی لوازمات موجود ہیں۔ ان کے خاکوں میں شخصیات کی حلیہ نگاری، عادات واطوار اور ان سے پہلی ملاقات کا ذکر بڑی دلچسپی سے بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے نذیر احمد سے پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ نذیر احمد سے ان کی ملاقات ان کے ہم جماعت عبدالرحمٰن نے کروائی تھی۔ فرحت اللہ بیگ نے بی۔اے میں عربی کو اختیاری مضمون کے طور پر لیا تھا۔ اس مضمون کے لیے انھیں مولوی نذیر احمد سے ملنا پڑا۔ مولوی نذیر احمد سے پہلی بار سراج الدین صاحب کی دکان پر ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں نذیر احمد کچھ حساب کتاب دیکھ رہے تھے اور حساب کتاب میں وہ اس قدر مشغول تھے کہ ان کو کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ جیسے ہی ان کا کام ختم ہوا انھوں نے فرحت اللہ بیگ کی طرف دیکھا اس واقعہ کا ذکر انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا کہ یہ دونوں صاحب کون ہیں؟ عبدالرحمٰن نے ہمارے نام بتائے، کچھ اُلٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کیے، اُسکے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہوگئے۔ میں نے دل میں کہا، پرائے برتے کھیلا جوا، آج نہ مؤا، کل موا، اب میاں عبدالرحمٰن کو رہنے دو، جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نیل مرام باضابطہ پسپائی ہو۔ میں نے نہایت رقت آمیز لہجے میں اپنی

مصیبت کا تذکرہ شروع کیا۔فرمانے لگے: تو عربی عربی چھوڑ دو، سائنس پڑھو۔ بیٹا ! آج کل مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں مثل ہے۔ پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کا کھیل۔ فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لو گے، عربی پڑھ کر تیل بیچنا بھی نہ آئے گا۔ ان کی اس پر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے۔ ہم رہنے والے ٹھہرے جامع مسجد کے نیچے کے بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون ذرا سکتا ہے۔اس کے بعد کھکھلا کر ہنس دیئے۔ دانی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے۔ مگر تو بڑا بدمعاش ہے۔ بیٹا! جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو۔ دلی میں کیا مولویوں کا کال ہے! مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا۔ میں نے عرض کی کہ جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے، مگر جو مولوی ہیں، وہ پڑھاتے نہیں اور جو پڑھاتے ہیں وہ مولوی نہیں ہیں۔ کہنے لگے نہیں، ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی۔ جناب شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خاں صاحب ایل۔ایل۔ڈی (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ، ان کو فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کے ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہیں کہنے لگے میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ یہاں تو جلے بیٹھے ہی تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں والا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا، بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ بھئی تم لونڈوں سے ڈرنا چاہئے۔ ضیاء الدین کو اگر خبر ہو جائے کہ ان کے اوصاف حمیدہ وفضائل پسندیدہ سراج الادین کی دکان پر اس طرح معرض بحث میں آتے ہیں، تو یقین جانو کہ نالش ٹھونک دیں۔ اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤں گا، مگر تم بھاگ جاؤ گے ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا نہیں۔ ہر گز نہیں''۔3

اس اقتباس سے نذیر احمد سے پہلی ملاقات کے حال کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا بھی علم

ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت بزلہ سنج تھی۔ وہ طنز ومزاح دونوں سے کام لیتے تھے اور اپنا کام بڑے انہماک سے کرتے تھے۔ اقتباس قدرے طویل ہے لیکن پورے واقعہ کی عکاسی کے لیے ضروری تھا۔ فرحت اللہ بیگ کے اسلوب کا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مولوی وحیدالدن سلیم سے بھی مرزا فرحت اللہ بیگ کی پہلی ملاقات بڑی دلچسپ رہی۔ ان سے پہلی ملاقات حیدراباد کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ اس وقت مولوی صاحب ایک کالج کے جلسے کے سلسلے میں اورنگ آباد جارہے تھے۔ وہ ان سے بڑی شفقت سے ملے تھے۔ اس وقت کافی ضعیف تھے۔ ان کی ملاقات کا ذکر بھی بڑے پرلطف اسلوب اور دلچسپ انداز بیان کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میں مدت سے حیدرآباد میں ہوں۔ مولوی وحیدالدین بھی برسوں سے یہاں تھے۔ لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گزشتہ سال کالج کے جلسہ میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن کا اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں ماسٹر بھی ہیں۔ کچھ ضرورت سے جارہے ہیں کچھ بے ضرورت جارہے ہیں۔ کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں۔ غرض یہ کہ آدھی ریل انھیں اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے غپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کررہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے بڑے بڑے ڈگ بھرتے، میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گھٹیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی

آنکھیں، شرعی سفید پائجامہ، کھتی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگایا۔ حیران تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کیا امیر حبیب اللہ خان اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے۔ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے تھک کر چور ہوگئیں۔ اس وقت انھوں نے فرمایا ''میاں فرحت''! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمہارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آ کر ملوں۔ مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا''۔ 4

اس اقتباس سے فرحت اللہ بیگ کی زبان و بیان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وحیدالدین سلیم کے حلیے اور خدوخال کا بیان بھی بڑے دلکش اسلوب میں کیا ہے۔ محاوروں، کہاوتوں اور صنعتوں کا استعمال اس بڑی ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔

فرحت اللہ بیگ کو حلیہ نگاری میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے مولوی نذیر احمد کا حلیہ اور خدوخال کا بیان بڑے لطیف اور مزاحیہ انداز میں کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

رنگ سانولا مگر روکھا۔ قد خاصا اونچا تھا، مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دہرا بدن، گورا ہی نہیں بلکہ مٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مُرمُروں کا تھیلا ہوجاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چوں کہ قد ٹھنگنا معلوم ہونے لگا تھا، اس لیے اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کردیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بےضرورت ہی نہیں تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا''۔ 5

انھوں نے آگے نذیر احمد کے سر، بالوں اور آنکھوں کا بیان بھی بڑی خوبصورت تشبیہات کے

ذریعہ دلکش انداز میں کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''سر بہت بڑا تھا،مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا۔ جو تھوڑے رہے سہے بال تھے۔ وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرادئے جاتے تھے،ورنہ بالوں کی یہ گگر،سفید مقیش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہوجاتی تھی۔آنکھیں چھوٹی چھوٹی، ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھوئیں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ چمک نہیں جو غصّے کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔6

مولوی وحیدالدین سلیم کی آواز زوردار تھی۔ان کے لکچر دینے کا انداز بھی جاندار ہوتا تھا۔ان کے لکچر سے سبھی بہت متاثر ہوتے تھے۔فرحت اللہ بیگ بھی ان کے لکچر سے بہت متاثر ہوئے۔سرسید نے ان کے لکچر کی دلکشی اور تاثر کی وجہ سے ان سے بہت سے لکچر دلوائے تھے۔فرحت اللہ بیگ ایک مرتبہ ان کا لکچر سننے گئے تھے اس واقعہ کی عکاسی انھوں نے دلکش وانوکھی تشبیہات کے زریعہ دلچسپ انداز میں کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں

''انھوں نے اپنی جیب سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا۔ میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہوجاتا ہے۔مگر مولوی صاحب کے طرز ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا، جتنا بولنے میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا مگر سنانے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو،لفظوں کی نشست، زبان کی روانی،آواز کے اُتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ امڈ چلا آرہا ہے یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کررہی ہے۔ برس

روز ہو چکا ہے۔ مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لکچر انھیں سے پڑھوایا کرتے تھے۔ یا تو لکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خداداد صلاحیت تھی جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا''۔7

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ وحیدالدین سلیم کی آواز سے بہت متاثر تھے۔ نہ صرف وہ وحیدالدین سلیم سے متاثر تھے بلکہ نذیر احمد کی آواز سے بھی متاثر تھے کیوں کہ مولوی نذیر احمد کی آواز بہت کڑک تھی۔ ان کی آواز میں ایسی گرج تھی۔ ان کو دور سے بات کرتے سننے والوں اکثر غلط فہمی ہو جاتی تھی وہ کسی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ ان کی بلند آواز سے ہر کوئی متاثر تھا۔ ان کی آواز کی اسی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی دلکش انداز میں فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

''کلّہ جبڑا بڑا زبردست پایا تھا۔ چوں کہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لیے گنجائش بڑھا دی تھی۔ اس لیے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ آواز میں گرج تھی۔ گر لوچ کے ساتھ، کوئی دور سے جو سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو، جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے، تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے۔ اسی لیے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف سنائی دیتا تھا''۔8

مولوی نذیر احمد عام طور پر کشمیری جُبّہ یا ایل۔ ایل۔ ڈی کے گون ہی میں دیکھے گئے مگر ان کے باہر پہننے والے لباس اور گھر میں پہننے والے لباس میں بہت فرق تھا۔ گھر سے باہر وہ ترکی ٹوپی، چھوٹا

سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے اور گرمیوں میں سفید اچکن اور سفید کرتا پائجامہ پہنتے تھے۔ فرحت اللہ بیگ ان کے لباس اور جوتے کا ذکر بھی بڑے شگفتہ انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں

''جنھوں نے ان کو مثالی رومال باندھے، کشمیری جُبّہ یا ایل۔ ایل۔ ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے، انھوں نے عالی جناب شمس العلماء مولوی، حافظ، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا۔ ان کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی مذہبی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔ جب شام کو گھر سے نکلتے، تو عموماً ترکی ٹوپی، یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔ گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید کرتا پائجامہ ہوتا، اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچک یا کشمیری کام کا جُبّہ۔ چوں کہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا اس لیے لال نری کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی وقت بے وقت کے لیے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے، جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی، یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑ نک ہو گئے تھے۔ انھی کا پانو تھا کہ ان چینیوں کے سے سخت جوتوں کی برداشت کرتا تھا''۔9

یہ لباس وہ گھر سے باہر پہنتے تھے مگر وہ گھر کے اندر اکثر ایک الگ ہی انداز میں دکھائی دیتے تھے۔ گھر پر وہ نہ تو کرتا پہنتے ہیں، نہ ہی ٹوپی اور نہ ہی پائجامہ بلکہ ان کے کمر پر برائے نام ایک چھوٹی سی تہمد رہتی تھی۔ جسے بدن سے لپیٹ کر رکھتے تھے۔ ان کے گھر کے لباس کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرحت اللہ لکھتے ہیں:

''ہاں تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس، مگر خدا کے فضل سے ان کے جسم پر وئی لباس نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کُرتا ہے نہ ٹوپی نہ پیجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے۔ بندھی

ہوئی نہیں بلکہ ہے محض لپٹی ہوئی ہے''۔10؎

وحیدالدین سلیم کے باہر کا لباس عمدہ ہوتا تھا۔ وہ ریشمی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ان کے لباس کی عکاسی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ٹرنک میں سے جوڑا نکالا، ریشمی شیروانی نکالی، نئی ترکی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ واہ''۔11؎

ہر شخص کی اپنی اپنی عادت ہوتی ہیں جس کے ذریعے سے ان کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔ مولوی نذیر احمد کا سارا کام وقت کے مطابق ہوتا تھا جس کی وہ برابر پابندی کرتے تھے۔ان کی روزمرہ کی معمولات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

''چار بجے اور مولوی صاحب غسل خانے میں گئے۔نہائے دھوئے، کپڑے پہن نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے شمس العارفین کی دکان پر ٹھہرے۔ یہاں بھی ان کا حساب کتاب تھا۔ وہاں کا کھاتا دیکھا، جو کچھ لینا دینا تھا، لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہنچ گئے۔ سات بجے تک وہاں ٹھہرے جس کو ملنا ہوا وہ وہاں مل لیا۔ سات بجے وہاں سے اٹھ کر سراج الدین صاحب کی دکان پر آئے، یہاں بھی حساب کتاب کیا، عبدالرحمٰن کو پڑھایا۔ گھنٹا بھر یہاں ٹھہر کر مکان پہنچ گئے۔ کھانا کھایا کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے۔ جاڑے میں پروگرام میں یہ تبدیلی ہوجاتی تھی کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے۔ اس کے بعد مولوی کی جماعت آتی تھی۔ رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا''۔12؎

اس خاکے ذریعے نذیر احمد کی زندگی کے ان اخفا پردوں روشنی پڑتی ہیں جس کا ہمیں علم نہ تھا یعنی ان کی معمولات زندگی اور طرز زندگی بہت سی باتوں سے شناسائی ہوتا ہے۔

فرحت اللہ بیگ نے ان کی پسند ناپسند، شوق، مشاغل اور عادتوں کا ذکر بھی اس کے خاکے میں کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کو حقہ پینے کا بہت شوق تھا وہ حقے میں تمباکو کا اتنا زیادہ استعمال کرتے تھے

کہ ان کے سامنے بیٹھنے والے کو سانس لینے میں تکلیف ہوتی تھی۔ چنانچہ مرزا فرحت اللہ بیگ، ان کے اسی شوق کا ذکر کرتے ہوئے شگفتہ انداز میں رقم طراز ہیں:

''سامنے ایک چھوٹی میز، پہلو میں حقہ۔ اسکی حقیقت کما حقہ بیان کرنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کو حقے کا بہت شوق تھا۔ مگر تمبا کو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتے ہے''۔13؎

مولوی وحید الدین سلیم کو مٹھائی کھانے کا بہت شوق تھا۔ ان کی اس پسند کا انداز ان کے ہر دوست، شاگرد اور عزیزوں کو تھا۔ اس لیے وہ لوگ ان کے لیے ہمیشہ کوئی نہ کوئی مٹھائی اپنے ساتھ ضرور لاتے تھے۔ ان کے اس شوق کا ذکر بڑھے دلچسپ انداز میں وہ یوں کرتے ہیں:

''مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار، دوست، شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے، مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر جمع کرتے تھے، ان ہی کاغذوں پر خط لکھتے۔ غزلیں لکھتے غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انھیں کاغذوں پر ہوتا۔ خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کرتھے''۔14؎

نذیر احمد کو پیدل چلنے کی عادت تھی۔ ان کی یہ عادت ان کی زندگی کی ابتدا سے آخر تک جاری و ساری رہی۔ وہ بوڑھے ہونے کے بعد بھی کبھی کہیں جانے کے لیے سواری کا سہارا نہیں لیتے تھے بلکہ پیدل ہی جایا کرتے تھے۔ ان کے پاس سواری رکھنے کی صلاحیت تھی پھر بھی انھوں نے کبھی سواری نہیں رکھی کیوں کہ انھیں پیدل چلنے کی عادت تھی۔ فرحت اللہ بیگ ان کے پیدل چلنے کی عادت کا ذکر ایک واقعہ کے ذریعہ پیش کر کے ان کی شخصیت کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترے۔ باہر دیکھوں تو کوئی سواری نہیں۔ میں نے کہا۔ مولوی صاحب! خدا کے لیے اب اس عمر میں تو اس طرح پیدل نہ پھیرا

کیجئے! خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔آخر یہ کس دن کے لیے ہے! روپیہ اسی لے ہوتا ہے کہ خرچ کیا جائے۔ بال بچوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے۔ کیوں اس بڑھاپے میں آپ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ذرا اپنی حالت کو دیکھئے اور کشمیری دروازے کو دیکھئے! یہ دو میل آنا اور جانا آپ کا مضمحل کردے گا۔ ذرا ٹھہر جائے، میں گاڑی لے آتا ہوں۔ بہت بگڑے اور کہنے لگے۔ تجھ کو میرے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔اب چلتا ہے تو چل نہیں تو میں کسی اور کو بلاتا ہوں۔ابھی میرے ہاتھ پاؤں نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازے تک نہ جا سکوں۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! خدا کے لیے اب تو گاڑی رکھ لیجئے۔ اگر آپ خرچ نہیں اٹھاتے، میں اٹھاؤں گا۔ ہنس کر کہنے لگے کیوں نہ ہو، روپیہ اچھلنے لگا ہے۔ کیا میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ گاڑی نہ رکھ سکوں۔ بیٹا! بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے اس لیے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک تو دانہ گھاس چراتے ہیں دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے، تیسرے گاڑی کا آج یہ توڑا، کل وہ توڑا، کون بیٹھے بیٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو یہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے۔ رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہوگئی۔ اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی، تو گاڑھی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرتے، اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہو کر پھرتے ہیں نا بھئی نا! اب گاڑی رکھنا وضع داری کے خلاف ہے۔ ہمیشہ کچہری میں جا کر گواہی دی، اب بڑھاپے میں اس وضع داری کو کیوں توڑوں۔ بہرحال یہی حجتیں کرتے کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور سب سے پہلے انھیں کا مقدمہ لے کر ان کی شہادت قلم بند کی۔اور یہ جس طرح گئے تھے اسی طرح ہانپتے کانپتے میرا ہاتھ پکڑ

کر گھر آ گئے‘‘۔15؎

واقعہ کے ذریعہ نذیر احمد کی شخصیت کے اس پہلو کی عمدہ عکاسی ہوتی ہے۔ ان کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی شخصیت نظروں میں گھوم جاتی ہے۔

مولوی نذیر احمد کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ ہر روز چھ بجے ٹاون ہال جاتے تھے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے ان کی اس عادت میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ ان کی وقت کی پابندی کی اس عادت سے فرحت اللہ بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ ایک واقعہ کے حوالے سے ان کی شخصیت کی اس خصوصیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ’’جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے۔ بعض یورپ پرست اس کی پابندی اوقات کو یوروپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو خیال کریں، میں تو یہ کہتا ہوں کہ صرف دہلی میں، میں نے تین ایسے شخص دیکھے ہیں جو آندھی آئے، مینہ آئے، روزانہ چھے بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے۔ ادھر انھوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اور ادھر گھنٹا گھر نے ٹن ٹن چھے بجائے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے ایک مشرق میں رہتا تھا۔ تو دوسرا مغرب میں یہ تین شخص کون تھے۔ ایک منشی ذکا اللہ صاحب، دوسرے رائے بہادر پیارے لال صاحب اور تیسرے کھاری باولی سے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آ کر دوسرے کا انتظار کیا ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک نہ آتا، تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا اور چھے بجے سے ذرا پہلے لائبریری کے کسی ملازم سے جا کر دریافت کرتا، تو یہی جواب ملتا کہ اب آتے ہی ہوں گے

، پیچھے میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں''۔ 16

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولوی نذیر احمد وقت کے پابند تھے۔ وہ ہر کام وقت پر کرتے تھے۔ ان کی عادتوں کے علاوہ ان کی شخصیت کی مختلف خصوصیات پر بھی فرحت اللہ بیگ نے روشنی ڈالی ہے۔

مولوی نذیر احمد کی شخصیت مختلف خصوصیات کی حامل تھی۔ مثلاً وہ مسلمانوں کو تجارت میں آگے بڑھتے دیکھنا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے بہت سے لوگوں کو مالی امداد بھی کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ بڑی بڑی رقمیں بھی دی ہیں۔ مگر ان سے کچھ لوگ ایمانداری سے پیسہ واپس کر دیتے تھے تو کچھ لوگ نہیں دیتے تھے خود مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ 'اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپئے کھو بیٹھا ہوں۔ پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دکان داروں سے فائدہ پہنچا ہے۔ اس نے میرے نقصان کی تلافی نہیں کر دی، بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے''۔ ایک اور بات یہ ہے کہ نذیر احمد جس طرح دل کھول کر کسی کو مالی امداد کرتے تھے۔ اتنی ہی سختی سے اس کا حساب بھی لیتے تھے۔ اس کے لیے وہ ہر روز قرض داروں کی دکانوں کے چکر کاٹتے تھے۔ لحاظہ فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں ان کو مالی امداد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا۔ بے دریگ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے۔ کہا کرتے تھے:

''مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں ان کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا۔ بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی رقمیں ڈبو دیتے تھے۔ کہا کرتے تھے: ''میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپے کھو بیٹھا ہوں، پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دکان داروں سے فائدہ پہنچا ہے۔ اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی، بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے۔ بیٹا! تم بھی تجارت کرو،

روپیہ میں دیتا ہوں۔نوکری کی کھیکھر اٹھاؤ گے تو مزا معلوم ہوگا۔جسطرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے،اسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے تھے۔گرمی ہو یا جاڑا،دھوپ ہو یا مینہ،قرض داروں کے ہاں ان کا روزانہ چکر نہیں چھوٹتا تھا۔گئے اور جاتے ہی پہلے خلق پر قبضہ کیا۔اس کے بعد کھاتا دیکھا،کردی دیکھی،سامان دیکھ کر بکری کا اندازہ کیا،روپیہ جیب میں ڈالا،سلام علیکم وعلیکم السلام کیا اور چل دیئے''۔17؎

فرحت اللہ بیگ نے موضوع خاکہ کی کمزوریوں کا ذکر بھی اپنے خاکوں میں کیا ہے۔مثلاً مولوی وحید الدین سلیم ایک نڈر انسان تھے۔وہ دنیا میں کسی سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔مگر وہ صرف ایک شخص سے ڈرتے تھے وہ مولوی عبدالحق تھے۔فرحت اللہ بیگ ان کی اس کمزوری کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں۔مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا''۔18؎

اسی طرح انھوں نے نذیر احمد کی کمزوریوں کا بیان بھی کیا ہے۔مثلاً مولوی نذیر احمد سود الینا جائز سمجھتے تھے اگر کوئی اس بات پر اختلاف کرتے تو وہ اپنے بچاؤ کے دلیلیں ڈھونڈتے تھے۔ فرحت اللہ بیگ کا کہنا ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب ان سے بھی سود لینے کے تیار ہو گئے تھے لحاظہ ان کی اس خصوصیت کا ذکر ایک واقعہ کے ذریعہ بیان کرتے ہیں:

''سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے۔اگر کوئی حجت کرتا،تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے۔ایک تو حافظہ،دوسرے عالم،تیسرے لسان، بھلا ان سے کون ور آ سکتا تھا۔اور تو اور،خود مجھ سے سود لینے تیار ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر

متفرق قرضے تھے۔ خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے۔ قرضہ کس سے لیا جائے، یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ پھر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا۔ کہنے لگے: کتنا روپیہ چاہیے۔ میں نے کہا: بارہ ہزار۔ بولے: ضمانت۔ میں نے کہا: چوڑی والوں والا مکان۔ پوچھا: کتنی مالیت کا ہے۔ میں نے کہا کوئی ساٹھ ستر ہزار روپے کا۔ فرمایا کل قبالہ لیتے آنا۔ میں نے دل میں سوچا: چلو چھٹی ہوئی، بڑی جلدی معالہ پٹ گیا۔

دوسرے دن قبالہ لے کر پہنچا۔ پڑھ کر کہا: ٹھیک ہے، مگر بیٹا سود کیا دو گے؟ میں نے کہا: مولوی صاحب آپ اور سود! کہنے لگے کیوں اس میں کیا حرج ہے۔ میں نہ دوں گا، تو کسی ساہوکار سے لو گے اس کو خوشی سے سود دو گے۔ ارے میاں! مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین دنیا دونوں میں بھلا ہوگا۔ آخر میں تمہارا استاد ہوں یا نہیں۔ میرا ابھی کچھ حق تم پر ہے یا نہیں۔ جاؤ شاباش بیٹا! اپنے چچا سے جا کر تصفیہ کر آؤ۔ کل ہی چیک بنگال بینک کے نام لکھے دیتا ہوں۔ میں نے کہا مولوی صاحب! لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں اور لیتے ہیں کس سے اپنے شاگردوں سے۔ کہنے لگے اسکی پروا نہ کرو۔ جب مجھ پر کفر کا فتوی لگ چکا ہے۔ تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا۔ جاؤ تمہارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑا لیتا ہوں۔ تم سے چودہ آنے لوں گا۔ میں نے آ کر گھر میں ذکر کیا۔ ہم کو دوسری جگہ سے آٹھ آنے سیکڑے پر روپیہ مل گیا اس لیے یہ معاملہ یوں کا یوں ہی رہ گیا''۔ 19

اس اقتباس سے نذیر احمد کی شخصیت کے اس تاریک پہلو پر سے پردہ اٹھتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے ان کی شخصیت کی اس کمزوری کو غیر جانبداری سے بیان کر دیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ لوگ انھیں کسی چیز کا لالچ دے کر بہت جلد بے وقوف بنا دیتے تھے اور ان

سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

اس طرح سے لوگوں نے تجارت میں ان سے خوب منافع کمایا۔ ایک واقعہ سے ان کی شخصیت کے اسی پہلو کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"ایک صاحب، جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں، مولوی ساحب کے پاس آئے، تجارت کا ذکر چھیڑا اور مولوی صاحب کو ولایتی جوتوں کے فائدے کے وہ سبز باغ دکھائے کہ تیسرے روز بلا کسی طمانیت کے گیارہ ہزار روپے کا چک مولوی صاحب نے ان کے نام لکھ دیا۔ بڑے ٹھاٹھ سے سنہری مسجد کے قریب دوکان کھولی گئی۔ مولوی صاحب جاتے گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے، دکان دار صاحب کی لچھے دار باتیں سنتے چلتے ہر وقت کچھ روپے جیب میں ڈالنے کو مل جاتے۔ اس لیے خوش خوش۔ بغیر حساب کئے گھر آجاتے۔ یہی ٹھوکر تھی جس نے مولوی ساحب کو چوکنا کر دیا تھا اور وہ بغیر حساب کتاب دیکھے روپئے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔ قصہ مختصر اصل میں سے دوڈھائی ہزار روپئے مولوی صاحب کو تھما، اس نے دوسروں کے ذریعہ سے خود خرید لیا۔ مولوی صاحب کو اس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس کے بعد آیا۔ بہت رویا بہت ٹسوے بہائے۔ مولوی صاحب سمجھے بچارے کو بڑا رنج ہوا۔ کہا جاؤ بھئی جاؤ۔ تجارت میں یہی ہوتا ہے۔ یا اس پار، یا اس پار۔ چلو گئی گذری بات ہوئی'۔ 20"

اوپر بیان کئے واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب رحم دل انسان تھے اور ان سے کسی کی پریشانی دیکھا نہیں جاتا تھا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد نے نذیر احمد کے خاکے میں منظر نگاری پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ انھوں نے مولوی صاحب کے گھر کا منظر اور چوڑی والوں کے محلے سے لے کر نذیر احمد کے گھر تک کے منظر کا بیان بڑی دلکشی سے کیا ہے کہ سارا منظر ہماری نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ چنانچہ

فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

''آیئے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلیے ۔ چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آیئے ۔ الٹے ہاتھ کو مڑ کر، قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے سرکی والوں پر سے گذر کر لال کنویں پہنچے ۔ آگے بڑھیئے تو بڑیوں کا کٹرا ہے ۔ وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آیئے ۔ یہ سیدھا رستہ کھاری باولی کو نکل گیا ۔ نکڑ سے ذرا ادھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے ۔ یہ بتاشئے والوں کی گلی ہے ۔ بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے یہاں آچار، چٹنیوں والوں کی بیسیوں دکانیں ہیں ۔ انھیں دکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے ۔ تھوڑی ہی دور جاکر بائیں طرف ایک پتلی گلی اس میں سے کٹ گئے ۔ اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی ساحب کا ہے ۔ مکان دومنزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے ۔ صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا ہوا نظرنہیں آتا ۔ دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دوسنگین چوکیاں ہیں ۔ دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحت میں آتے ہیں، صحن کسی قدر چھوٹا ہے ۔ سیدھی طرف دفتر ہے ۔ جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے کلام مجید پڑھا کیا کرتے ہیں ۔ اس کے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے ۔ چولھے بنے ہوئے ہیں ۔ آگ جل رہی ہے مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ جو باورچی خانے کا جزولاینفک ہیں سرے سے ندارد ہیں ۔ آگ صرف حقے کے لیے سلگائی جاتی ہے، کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے ۔ دروازے سے کئے بالکل سامنے اکہرادالان ہے اور اندر ایک لمبا کمرا، گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں''۔21؎

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے فرحت اللہ بیگ نے چوڑی والے کے راستے سے نذیر احمد کے گھر تک کے منظر کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کی ہے کہ سارا نظارہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے وحیدالدین سلیم کے مکان کی بھی بڑی حسین منظر کشی کی ہے۔ تھا۔ ان کا گھر بہت بڑا تھا۔ ان کے گھر کی تصویر کشی انھوں نے جزئیات نگاری کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا۔ مگر خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینہ کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال بچے نہ نوکر میں گیا باہر کا دروازہ کھٹکھٹا، آواز آئی کون۔ میں نے کہا ''فرحت'' اسی وقت کرتا پہنتے ہوئے آئے، دروازہ کھولا اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چار پائی پڑی ہے۔ دو تین تختے جڑی ٹوٹی، پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذراسی دری بچھی ہے۔ اس پر میلی چاندی ہے۔ دو چار چوہا چکسٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کنداٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے مولوی صاحب کے گھر بار کا یہ خلاصہ ہے''۔22

غیر جانبداری فرحت اللہ بیگ کے خاکوں کا خاص وصف ہے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اسے جوں کا توں پیش کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی منظر نگاری کی وجہ سے وحیدالدین سلیم اور نذیر احمد کے مکان کا نقشہ نظروں میں گھوم جاتا ہے۔

انھوں نے نہ صرف منظر کشی میں حقیقت پسندی سے کام لیا بلکہ شخصیات کی عادات واطوار اور صفات و کردار کے بیان میں بھی غیر جانبداری وایمانداری کا مظاہرہ کیا ہے۔

مولوی نذیر احمد خوش خوراک تھے۔ انھیں پھل بہت پسند تھے۔ فرحت اللہ بیگ کو ان کے

ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملا وہ مزے لے کر کھایا کرتے تھے۔لیکن ان کی عادت یہی تھی کہ وہ خود کھاتے تھے۔دوسروں کو جھوٹے منہ ہی کھانے کونہیں کہتے تھے۔ان کی اسی عادت کا بیان لطیف انداز میں کیا ہے۔

> ''خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے۔ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے۔سیوے کا بڑا شوق تھا۔ناشتے اور کھانے کے ساتھ میوے کا ہونا لازمی تھا۔پڑھاتے جاتے اور کھاتے جاتے تھے۔مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہوسکا۔ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلا کرتے۔ان کے لیے تو مولوی ساحب کا ناشتہ،اونٹ کے منہ میں زیرہ ہوجاتا، البتہ ہم دونوں کی صلا نہ کرنا غضب تھا۔کہتے بھی جاتے تھے۔بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے امیاں کیا مزے کا آم ہے! مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا! ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے۔میں نے تو تہیہ کرلیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں) لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منہ بھی شریک ہونے کو کہیں،تو ہم سچ مچ شریک ہوجائیں گے'' ۔23

فرحت اللہ بیگ نے وحیدالدین سلیم کی کمیوں کا ذکر بھی غیر جانبداری سے کیا ہے۔خاکہ نگاری کی یہی خصوصیت ہے کہ حقیقت پسندی سے حقائق کا بیان کردیا جائے چنانچہ وحیدالدین سلیم کی خامیوں پر غیر جانبدارانہ انداز میں نگاہ ڈالی ہے۔وحیدالدین سلیم پیسے کے معاملے میں کفایت شعار تھا لیکن یہ کفایت شعاری کنجوسی کی حدتک تھی اس لیے ان کی کنجوسی کی وجہ سے ان کے پاس دولت جمع ہوگئی تھی۔جسے مرتے وقت وہ چھوڑ گئے تھے۔ان کی شخصیت کی اس خامی کا ذکر انھوں نے غیر جانبداری سے یوں کیا ہے مثلاً لکھتے ہیں:

> زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہوگیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی،اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا۔جتنی ان کے قلم میں روانی

پیدا ہوئی، اتنی ہی ان کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا، جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ تو اب لکھتے کیوں ڈروں۔ واقعی بڑے کنجوسی تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے، دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا۔ مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اس کی صراحت میں آگے چل کر کروں گا۔ ہاں ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیئے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھیتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے''۔ 24

ان مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فرحت اللہ بیگ نے اپنے خاکوں میں غیر جانبداری برتی ہے۔ اس زمانے میں جبکہ صنعت خاکہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ انھوں نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔ موضوع خاکہ کی شخصیت کی صحیح تصویرکشی کے لیے انھوں نے اپنے بزرگوں کی خامیوں کے بیان سے بھی گریز نہیں کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ اساتذہ کا احترام عقیدت مندی کی حد تک کیا جاتا تھا لیکن انھوں نے بڑی بے باکی سے حقائق کو جوں کا توں بیان کر دیا جس کی وجہ سے شخصیات اپنی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ آپ کے سانے آجائیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ ایک مزاح نگار ہیں۔ ان کے خاکوں میں بھی مزاح کی جھلکیاں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں جان بوجھ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی خاصیت یہی تھی کہ وہ شخصیات سے متعلق واقعات کو اس طرح سے ترتیب دیتے تھے کہ پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی ان کے اسلوب کا کمال تھا۔ چنانچہ رشید حسن خان ان کے اسلوب کی شگفتگی پر اظہار

خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ دیکھیں گے کہ مرزا صاحب نے اپنی طرف سے کوئی ایسا جملہ نہیں لکھا جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ مزاح پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یا یہ کہ اس منظر کو غیر معمولی بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے واقعات کو اس طرح سے ترتیب دیا ہے کہ مزاح خود بخود ابھر آتا ہے اور یہ پڑھنے والا ایک خاص طرح کی شگفتگی محسوس کرنے لگتا ہے اور جب رات کے مٹکے میں سفر کرنے کا جملہ سامنے آتا ہے تو شگفتگی کا وہ احساس بے ساختہ ہنسی میں بدل جاتا ہے''۔25؎

نذیر احمد کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کے ذریعے سے ان کی شخصیت میں شامل شوخی کا بیان وہ اتنے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں کہ اس سے مزاح کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مثلاً فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے حالات کا بیان لطافت کی صورت میں کیا ہے مولوی نذیر احمد ایک جلسے میں لارڈ کچز سے ملاقات کی۔ وہ نڈر انسان تھے انھوں نے بڑی بے باکی سے لارڈ کچز پر طنز کیا تھا۔ اسی واقعہ کو فرحت اللہ بیگ یوں بیان کرتے ہیں:

''لارڈ کچز آہی گئے۔ نواب محسن الملک نے سب کا تعارف کرایا۔ مولوی ساحب نے خود اپنا تعارف کرلیا۔ لارڈ کچز کہنے لگے۔ مولوی صاحب ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، آج آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ مولوی صاحب نے کہا۔ لاٹ صاحب! مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور سب سے بڑی یہ خوشی ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک معما حل ہوگیا۔ لارڈ کچز نے کہا، وہ کیا معما تھا! مولوی صاحب نے کہا کہ ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ایسا تہلکہ ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسی کیا مصیبت ہوگئی کہ حمل گرادے گی۔ مگر آج یقین آ گیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے جب آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے

بڈھوں کے حمل گرادیے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد، عورتوں کے حمل گرادے۔تمام پنڈال میں سناٹا ہو گیا،مگر مولوی صاحب کو جو کہنا تھا کہہ گئے اور اس طرح اپنے دل کا بخارا نکال لیا''۔26؎

مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کے خاکے میں ایک سپہ سالار بہادر خان صاحب کی شادی کا ذکر کیا تھا۔اس واقعہ کا ذکر لطیفے کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''غرض خدائی فوج داروں کا یہ لشکر غل مچاتا، دین دین کے نعرے مارتا میرے سامنے سے گذرا۔اس جم غفیر کے بیچوں بیچ دولہا میاں تھے۔یہ کون تھے عالی جناب بہادر خان صاحب سپہ سالار۔لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولھا معلوم ہوتے تھے، جڑاؤ زیور میں لدے ہوئے تھے۔پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ۔صانے پر بجائے طرے کے، سراسر گائی تھی جیسے خود زیور سے آراستہ تھے،اسی طرح ان کا گھوڑا بھی زیور سے لدا ہوا تھا۔معاش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے۔معلوم ہوتا تھا،نعوذ باللہ خدا کی خدائی اب ان کے ہی ہاتھ آ گئی ہے''۔27؎

انھوں نے نذیر احمد کے خاکے اور مولوی ضیاالدین کی شخصیت کی بھی عکاسی کی ہے۔ان کی نورانی شخصیت کو سمندر کے کنارے جہاز سے دکھائی دینے کے منظر سے تشبیہ دی ہے۔مثلاً لکھتے ہیں:

''ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔اس لیے دروازے میں سے پہلے قندیل نظر آئی، اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے، اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ، سرگیں آنکھیں، سفید ریش مبارک، سفید جُبّہ اور سب سے آخر زرد بانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں''۔28؎

فرحت اللہ بیگ نے اپنے خاکوں میں خاکہ نگاری کے تمام فنی لوازم کا عمدہ اہتمام کیا ہے وہ اپنی پُر لطف اور شگفتہ تحریر کے ذریعے کسی بھی واقعہ کو غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔انھوں نے اپنے خاکوں میں مزاح پیدا کرنے کے لئے واقعات کو اس طرح سے ترتیب دیا ہے کہ مزاح خود بہ خود ابھر آتا ہے ان کی تحریر کی اسی خصوصیت کی نشاندہی کرتے ہوئے رشید حسن خان لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب کسی منظر کو غیر معمولی نہیں بناتے ،مگر ان کی تحریر کا انداز اور بات کہنے کا ڈھنگ کچھ ایسا سادہ و پُر کار ہے کہ منظر خود بخود غیر معمولی بن جاتا ہے،اس غیر معمولی پن میں ہلکی سی مزاح کی چاشنی ضرور شامل رہتی ہے''۔29

فرحت اللہ بیگ اگرچیکہ اردو ادب کے پہلے خاکہ نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں لیکن ان کے خاکوں میں کسی قسم کی کمی یا خامی کا احساس نہیں ہوتا انھوں نے خاکہ نگاری کی خصوصیات کا اپنے خاکوں میں بدرجہ اتم استعمال کیا ہے۔حقیقت نگاری اور غیر جانبداری ان کے خاکوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔شخصیات کے حلیے ،عادات واطوار اوران کی خامیوں اور خوبیوں کے بیان میں پوری ایمانداری سے کام لیا ہے۔ان کے خاکوں کا اسلوب پرکشش اور جاندار ہے۔مزاح کی چاشنی سے وہ اپنی تحریر کو دلکش وشگفتہ بنا دیتے ہیں۔سچے واقعات کی تصویر کشی کے ذریعہ شخصیات کی عکاسی اس عمدگی سے کرتے ہیں کہ ہمیں موضوع خاکہ سے مکمل تعارف ہوتا ہے غرض اردو خاکہ نگاروں میں فرحت اللہ بیگ اپنی دلچسپ اور پرلطف اسلوب کی بدولت ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

☆☆☆

حواشی

1۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ، نذیراحمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی،انجمن ترقی اردو ،نئی ہلی ،
1992 ص22

2۔مرزافرحت اللہ بیگ،ایک وصیت کی تعمیل میں،ماہنامہ شگوفہ،حیدرآباد،اپریل،2011،ص:22

3۔ مرزا فرحت اللہ بیگ،ڈاکٹر نذیراحمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی،انجمن ترقی ادونئی
دہلی،1992،ص:28

4۔مرزافرحت اللہ بیگ،ایک وصیت کی تعمیل میں،ماہنامہ شگوفہ،حیدرآباد،اپریل،2011 ص:26

5۔ مرزا فرحت اللہ بیگ،نذیراحمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی،انجمن ترقی اردو،نئی دہلی،
1992،ص:30

6 مرزا فرحت اللہ بیگ،نذیراحمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو ، نئی
دہلی،1992،ص:31

7۔مرزافرحت اللہ بیگ،ایک وصیت کی تعمیل میں،ماہنامہ شگوفہ،اپریل،2011،ص:28

8۔ مرزا فرحت اللہ بیگ،نذیراحمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی،انجمن ترقی اردو،نئی دہلی
1992 ص:31

9۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ،نذیراحمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی،انجمن ترقی اردو ،نئی
دہلی،1992 ص:32

10۔مرزا فرحت اللہ بیگ،نذیراحمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردونئی دہلی
1992 ص:33

11۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ایک وصیت کی تعمیل میں، ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، اپریل 2011، ص:28

12۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی 1992 ص:38

13۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، 1992، ص:34

14۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ایک وصیت کی تعمیل میں، ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد، اپریل، 2011، ص:30

15۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، 1992، ص:77

16۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، 1992 ص:36

17۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، 1992، ص:39

18۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ایک وصیت کی تعمیل میں، ماہنامہ شگوفہ، حیدآباد، اپریل، 2011، ص،30

19۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجم ترقی اردو نئی دہلی، 1992، ص:41

20۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، 1992، ص:39

21۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، ، انجمن ترقی اردو، 1992، ص:33

22۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ایک وصیت کی تعمیل میں، ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، اپریل، 2011، ص:29

23۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو، 1992، ص:38

24۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ایک وصیت کی تعمیل میں، ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، اپریل، 2011، ص:27

25۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، 1992، ص:14

26۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، 1992، ص:70

27۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، 1992، ص:52

28۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی ارو، نئی دہلی، 1992، ص:25

29۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، 1992 ، ص:14

☆☆☆

خواجہ حسن نظامی (پیدائش1878۔وفات1908)

خواجہ حسن نظامی کی تاریخ پیدائش 27 ؍دسمبر 1878ء کوبستی حضرت نظام الدین اولیاء دہلی میں ہوئی۔ ان کے والدین نے ان کا نام ''قاسم علی'' رکھا تھا لیکن ان کے ماموں نے انھیں ''علی حسن'' کے نام سے پکارا،مگر وہ علی کوترک کر کےخواجہ حن نظامی کے نام سے مشہور ہوئے۔

خواجہ حسن نظامی کے والد کا نام عاشق علی تھا۔ وہ حافظ قرآن تھے۔ اردو اور فارسی ہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔انھوں نے اپنی محنت کی کمائی ہی پر اکتفا کیا۔خواجہ صاحب کی والدہ کا نام چہیتی بیگم تھا۔ خواجہ صاحب بچپن ہی میں والدین کی سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ ایسے وقت میں ان کے بڑے بھائی سید حسن علی شاہ نے ان کی دیکھ بھال کی۔

خواجہ حسن نظامی کی تعلیم کا آغاز بستی نظام الدین میں بنگلے والے مسجد میں قائم مدرسے سے ہوا۔ جہاں زمانے کی رواج کے مطابق پہلے قرآن شریف کی تعلیم دی جاتی ہےاوراس کے بعد دوسرے علوم پڑھائے جاتے تھے۔اسی طرح خواجہ صاحب نے پہلے قرآن مجید پڑھااوراس کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں۔

خواجہ حسن نظامی نے دوشادیاں کیں۔ان کی پہلی شادی ان کے چچا سید معشوق علی نظامی کی چھوٹی بیٹی حبیب بانو سے 1898ء میں ہوئی تھی۔ 1908ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ان سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں لیکن دونوں بیٹیوں کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی دوسری شادی محمودہ خواجہ بانو سے ہوئی تھی۔ان سے پانچ بیٹے ہوئے۔

خواجہ احمد حسن نظامی نے ابتداء میں کئی کام کئے۔ بستی نظام الدین سے کتابوں کی گٹھری اٹھا کر دلی شہر کے مختلف علاقوں میں بیچتے پھرتے تھے۔ اس طرح ان کی ادبی زندگی آغاز کتابیں بیچنے سے ہوا۔ اسی کاروبار نے ان میں مطالعے کا شوق پیدا کیا اور کتابیں بچتے بیچتے وہ کتابیں لکھنے بھی لگے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی رسائل بھی شائع کئے اور انھوں نے کتابوں کی تصنیف و تالیف کے علاوہ پبلشنگ کا کاروبار بھی کیا۔

خواجہ حسن نظامی نے لا تعداد مضامین لکھے ہیں جن میں بہت سے چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں۔ بچوں کی کہانیوں، بیگمات کے آنسو، چٹکیاں اور گدگدیاں، سی پارہ دل (دو حصے)، غدر دہلی کے افسانے (بارہ حصے) وغیرہ ہیں۔ ابھی ایسے کئی مضامین ہیں جن تک رسائی نہیں ہو سکی۔ اس کے علاوہ انھوں نے قلمی چہرے اور روزنامچے بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے قلمی چہروں کی وجہ سے خاکہ نگاری میں ایک خاص مقام پیدا کیا۔ حسن نظامی نے کئی ہفتہ وار اخبار اور رسالے جاری کئے۔ جن کے ذریعہ سے ان کی تحریریں مقبول ہوئیں۔ جن میں نظام المشائخ، عادل، توحید اور منادی کو مقبولیت حاصل ہے۔

خواجہ صاحب نے 1908ء میں ''حلقہ نظام المشائخ'' کا قیام عمل میں لایا۔ جس میں درگاہوں، خانقاہوں کی اصلاح اور تعلیمات تصوف کی ترویج و اشاعت کے لیے اس کو قائم کیا گیا تھا۔ اس حلقے میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی اور حضرت شاہ سلیمان پھلواری جیسے بہت سے مشاہیر ممبر تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے 31 جولائی 1955ء کو رحلت پائی۔ انھوں نے بہت پہلے ہی بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دہلی میں اپنی قبر تیار کروا کر رکھی تھی اور اسی میں وہ مدفون ہوئے۔

خواجہ حسن نظامی کا شمار اردو کے چند نامور خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے تقریباً ایک ہزار کے قریب خاکے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف انسانوں کے خاکے لکھے بلکہ حیوانات، نباتات، جمادات، مظاہر قدرت کے بھی خاکے لکھے ہیں۔ انھوں نے چھوٹی سے چھوٹی اشیاء کو بھی اپنے خاکوں کا موضوع

بنایا ہے۔ مثلاً گھاس کے تنکے، دیا سلائی، مکھی، مچھر، وغیرہ۔ ان کے خاکوں کے مجموعہ کو ''حسن نظامی کے خاکے اور خاکہ نگاری'' کے عنوان سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے اسلام آباد پاکستان نے شائع کیا ہے۔

''خواجہ حسن نظام خاکے اور خاکہ نگاری'' اس کتاب میں ادیب وشاعر اردو کے ظرافت نگار، ڈاکٹر و، کیل، تاریخی وسیاسی شخصیات، ممبران اسمبلی وکونسل آف اسٹیٹ، دہلی عدلیہ کے نمائندے ودیگر شخصیات کے عنوانات سے خاکے شامل ہیں۔ ان کے کئی خاکے عام طور پر ایک صفحے ہی میں ختم ہو جاتے ہیں اور کئی خاکے اس سے بھی مختصر ہیں۔ ان کے خاکوں میں شخصیات کی حلیہ نگاری، گفتار، عادات و اطوار اور سیرت و کردار پر مختصراً مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً وہ مسٹر آصف علی کا حلیہ بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مثال دیکھئے:

> ''میانہ قد، کامنی بدن، اس بھری آنکھیں، نمکیں رنگ، عمر جوان ڈاڑھی مونچھ صاف، آواز میں لطافت وشیرینی''۔ 1ؔ

انھوں نے مسٹر آصف علی کے ساتھ ساتھ بیگم آصف علی کا خاکہ بھی تصنیف کیا ہے۔ ان کا حلیہ بھی مختلف دلچسپ تشبیہات کے ذریعہ بڑی عمدگی سے کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''میانہ قد، گل اندام، رخ زیبا، گورا رنگ، قوم ہند، مذہب اطاعت شوہر اور خدمت ملک اور ہمدرد نسواں۔ دیکھنے میں اٹلی کے کسی ماہر بت بنانے والی کی صناعی کی ساختہ معلوم ہوتی ہیں۔ مگر جب بولتی ہیں تو سیتا دیوی کی بولتی ہوئی مورت سامنے آجاتی ہے اور کسی بڑے ہندوستانی بت خانے کی ہندوستانی بت سازوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہیں۔'' 2ؔ

اس اقتباس سے خواجہ حسن نظامی کی زبان و بیان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے عورت کی نزاکت اور شرافت کے اعتبار سے تشبیہات کا بڑا اچھا استعمال کیا ہے۔ جس سے بیگم آصف علی

کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

انھوں نے نہ صرف حلیہ نگاری میں کمال دکھایا ہے بلکہ شخصیت کے لب و لہجے اور تقریر کی خصوصیت کا بھی ذکر عمدگی سے کیا ہے۔مثلاً لکھتے ہیں:

> ’’ان کی تقریر میں بھی جادو ہے اور تحریر میں بھی سحر ہے۔بولتے ہیں تو چہرے کے اعصاب کی حرکات میں موسیقی کے پردوں کی جنبش پیدا ہوجاتی ہے اور دل کا مطلب ایک عمدہ شعر کی صورت بن کر ان کے چہرے پر آجاتا ہے۔انگریزی پڑھنے والوں کا خط خراب ہوتا ہے مگر ان کا خط بھی ایک جمال رکھتا ہے۔بہت اچھے شاعر ہیں۔بہت اچھے پالیٹیشن ہیں۔بہت اچھے مقرر ہیں‘‘۔3؎

بیگم آصف علی کی شخصیت کی اتنی دلکش انداز میں عکاسی کی ہے کہ ان کی شخصیت آئینہ کی طرح صاف وشفاف تصویر کی صورت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ’’عورت کا غرور،عورت کی ضد،عورت کی خود پسندی،عورت کی نازک مزاجی سے کوسوں دور ہیں۔اس لیے عورتوں کے روپ میں مرد ہیں۔مرد کی بے وفائی۔مرد کی خودغرضی۔مرد کی حاکمیت۔مرد کی تلون مزاجی نہیں ہے۔اس لیے اصلی اور خالص عورت ہیں۔تقریر میں مردانہ ہمت ہوتی ہے۔پاک لوگوں کی سی بیبا کی سے بولتی ہیں۔جب کسی سے مخاطب ہوتی ہیں تو ہندوستانی شرافت و شائستگی موہنی بن کر سامنے آجاتی ہے‘‘۔4؎

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی کے سامنے الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور وہ ان کا عمدہ استعمال کر رہے ہیں اور اس اقتباس میں انھوں نے جس عمدگی سے مرد اور عورت کی خصوصیات کا موازنہ کرتے ہوئے بیگم آصف کی شخصیت کی تصویر کشی کی ہے اس سے وہ اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ایسے ہی پر لطف اور دلکش اسلوب سے آصف علی کی شخصیت کا بیان کرتے ہیں کہ ان کے اسلوب کا مزہ قاری کو بڑا لطف دیتا ہے۔مثلاً لکھتے ہیں:

نام کے آصف، مزاج کے سلیمان، عزم کے اکبر۔ دل کے شاہجہاں ارادے میں اورنگ زیبی ضد ہے۔ فرشتوں نے پیرس کی مٹی سے ان کا پتلا بنایا ہوگا اور دہلی اور لکھنو کی خاک سے رنگ آمیزی کی ہوگی۔ اس لیے بہت نفاست پسند اور نازک مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ کئی بار جیل کی سیاحت کر چکے ہیں اور ہندوستان کی آئندہ تاریخ کے کئی بابوں میں ان کا تذکرہ درج ہوگا''۔5

خواجہ حسن نظامی کے خاکوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے جن شخصیات کے خاکے لکھے ہیں ان کے ظاہر کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے باطن کا بھی بیان کر دیا ہے۔ ان کے خاکوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شخصیتوں کے چہرے کے نقوش اور خدوخال کے بیان پر زیادہ زور دیا ہے اسی طرح ان کی باطنی خصوصیات کا بیان بھی مختصراً مگر عمدہ تشبیہات واستعارات کے ذریعہ اتنی عمدگی سے کیا ہے کہ وہ شخصیات اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ متحرک ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ یہی ان کے خاکوں کا خاص اسلوب ہے۔

☆☆☆

حواشی

1۔ مسٹر آصف علی، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:23

2۔ بیگم آصف علی، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:23

3۔ مسٹر آصف علی، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:23

4۔ بیگم آصف علی، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:24

5۔ مسٹر آصف علی، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:23

☆☆☆

رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری (پیدائش 1892۔وفات 1977)

رشید احمد صدیقی کے آبا و اجداد ترکستان سے ترک وطن کر کے مڑیاہوں آئے تھے۔ان کے اجداد میں حضرت پیر زکریا شاہ، خدا بخش، روشن علی، اور رمضان علی کا آبائی پیشہ سپہ گری اور زمینداری تھا۔اس کے بعد انھوں نے سرکاری ملازمتیں بھی اختیار کیں۔ان کے والد کا نام عبدالقدیر تھا۔ان کی والدہ ضلع بنارس کے سید باسط علی کی صاحبزادی تھیں۔وہ بے حد نیک اور کم گو خاتون تھیں۔شاید انھیں کے زیر اثر رشید احمد صدیقی کی شخصیت میں بھی کم گوئی در آتی ہو۔

رشید احمد صدیقی 24 ردسمبر 1892ء میں جون پور کے قبضہ مڑیاہوں میں پیدا ہوئے۔بچپن ہی سے صحت خراب رہنے کی وجہ سے ان کی تعلیم تھوڑی دیر بعد شروع ہوئی۔انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔زمانے کے دستور کے مطابق دینیات ،عربی، اور فارسی کی کتابیں اور عربی کے چند رسالے اور قرآن شریف پڑھا تھا۔انھوں نے اردو اور ریاضی سیکھنے کی غرض سے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔1914ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔1917ء میں ایم۔اے۔او کالج میں انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایر میں داخلہ لیا۔1919ء میں بی۔اے، 1921ء میں ایم اے کے امتحانات اول درجے میں کامیاب کئے۔1923ء میں ان کی شادی جمیلہ خاتون سے ہوئی۔ان کی 9اولاد ہوئی۔جن میں پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔

ان کے گھریلو حالات اور معاشی تنگدستی کی وجہ سے انھوں نے اسکول کی تعلیم کے بعد ہی

ملازمت اختیار کرلی تھی۔ لہٰذا 1926ء میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ 1935ء میں ریڈر مقرر ہوئے اور اس طرح سے انھوں نے ترقی کر کے 1954ء میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے علی گڑھ یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں۔ 1958ء میں وہ شعبے کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

رشید احمد صدیقی نے اسلول کے زمانے ہی سے لکھنا شروع کردیا تھا۔ ان کے مضامین اس زمانے کے رسالوں اور اخباروں میں بھی شائع ہوئے تھے۔ ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ 'گل منزل' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کی تصانیف میں طنزیات ومضحکات، مضامین رشید، خنداں، گنج ہائے گراں مایہ، آشفتہ بیانی میری، جدید غزل، ذاکر صاحب، ہم نفساں رفتہ، شیخ نیازی، اقبال کی شاعری اور شخصیت، غالب کی شخصیت اور شاعری اور علی گڑھ کی مسجد قرطبہ وغیرہ اہم ہیں۔

رشید احمد صدیقی کو اپنی زندگی ہی میں شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں 1974ء میں اردو اکیڈمی اتر پردیش سے پانچ ہزار روپئے کا انعام ملا۔ 1971ء میں ان کی تنقیدی تصنیف غالب کی شخصیت اور شاعری کے لئے انھیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ عطا ہوا۔ انھیں 1976ء میں دستور ادب کا انعام اور 1963ء میں پدم شری سے نوازا۔

رشید احمد صدیقی کو بچپن ہی سے گردے کی بیماری کی شکایت تھی۔ 1930ء میں ان کے گردے کا آپریشن ہوا۔ انھیں دل کا دورہ بھی پڑا تھا۔ ان کا انتقال 15 جنوری 1977ء میں ہوا۔

رشید احمد صدیقی نے مزاح نگاری کے علاوہ خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تصانیف میں گنج ہائے گراں مایہ 1937ء اور ہم نفسان رفتہ 1966ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ 'ہمارے ذاکر صاحب' جس میں ذاکر صاحب سے متعلق چار خاکے شامل ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے جن شخصیات کے خاکے لکھے ہیں ان میں سیاسی میدان سے تعلق رکھنے

والی شخصیات میں ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا محمد علی جوہر شامل ہیں اور ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والوں میں مولوی عبد الحق، اصغر گونڈوی، محمد اقبال، جگر مرادآبادی، سجاد حیدر یلدرم، مولانا سید سلیمان ندوی اور پروفیسر احمد شاہ بخاری، جیسی اہم شخصیات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر انصاری بھی اہم شخصیت ہیں جن کا تعلق شعبہ طب سے ہے۔

پہلی ملاقات

رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں کو شخصیات سے دیرپا ملاقات کے بعد ہی قلم بند کیا ہے۔ ان کے تمام خاکے شخصیت سے بھرپور واقفیت کے بعد ہی تحریر میں لائے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیت سے اپنی پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے شیر شاہ سلیمان کے خاکے میں ان سے پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے آس پاس کے ماحول کا منظر بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان سے پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کا بیان یوں کیا ہے:

> ''بہت دنوں کی بات ہے جب چھوٹے شہروں یا بستیوں میں معمولی واقعے پر غیر معمولی دھوم یا ہلچل مچ جاتی۔ پینتیس سال گذرے ایک صبح جونپور کے چھوٹے سے شہر میں غیر معمولی ہماہمی کے آثار پیدا ہوگئے۔ میں اسکول کے ابتدائی درجوں میں پڑھتا تھا اور گورنمنٹ اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں جو شہر کے عین وسط میں واقع ہے رہتا تھا۔ سامنے لوہے کی مضبوط سلاخوں کا جنگلا بورڈنگ ہاؤس اور شاہراہ کے درمیان حد فاصل تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک جلوس گزرنے لگا۔ بورڈنگ کے سامنے لڑکے جنگلے پر آ گئے۔ جنگلے یا جالی کے پیچھے سے کسی منظر کے دیکھنے کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جس کو چھوٹے بچے اور اچھے شاعر ہی سمجھ سکتے ہیں۔
>
> پھولوں سے لدی اور سجی ہوئی اور گھوڑوں کی ایک پر تکلف گاڑی گزر رہی تھی

جس میں چند بزرگوں عزیزوں کے ساتھ ایک معمولی سا جسامت لیکن نمایاں ذکاوت کا ایک خوشرو نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔کبھی جھک کر دائیں دیکھتا کبھی ہار پھولوں سے الجھ جاتا کبھی پاس والوں سے جلد جلد باتیں کرنے لگتا۔کبھی گاڑی کے تکیہ سے پیٹھ لگا لیتا۔لیکن فوراً ہی آگے جھک کر کچھ دیکھنے لگتا اور کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے اکتا کر جلوس کو چیرتا پھاڑتا کودتا پھاندتا سب سے آگے نکل جائے گا۔ہر چھوٹا بڑا جوان بوڑھا یہ سمجھتا تھا کہ یہ خوشی اسی کے گھر اتری ہے اور خوشی کے اظہار میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتا تھا۔یہ جونپور کے مشہور گھرانے اور سب سے مشہور وکیل حافظ محمد عثمان صاحب کے بڑے لڑکے شاہ محمد سلیمان تھے جو ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وطن واپس ہوئے تھے''۔1؎

رشید احمد صدیقی علی گڑھ کے پرستار تھے اور وہ زیادہ تر عظیم شخصیتوں سے علی گڑھ ہی میں ملے تھے۔اسی طرح بابائے اردو مولوی عبدالحق سے بھی ان کی ملاقات علی گڑھ ہی میں ہوئی تھی۔ان سے پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر مثلاً سن رسیدگی کے باوجود بچوں جیسی توانائی کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے:

30-35 سال ادھر سب سے پہلے علی گڑھ میں مولوی صاحب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔اس وقت بھی سن رسیدہ ہی معلوم ہوتے تھے لیکن ذہانت، زندہ دلی، محنت و مستعدی کا جو عالم اس وقت تھا وہ ان میں آخر دم تک قائم رہا۔توانائی کا معلوم نہیں کیسا لازوال خزانہ ان میں ودیعت تھا۔تھکنا، مایوس ہونا، ہار ماننا تو جیسے جانتے ہی نہ ہوں۔چھوٹے بچوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں انرجی (توانائی) پیدا زیادہ، خرچ کم ہو پاتی ہے۔اس لئے نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ ہر کام میں بلند آہنگی، تیزی اور قوت آزمائی کا مظاہرہ نہ خود چین سے بیٹھیں گے،

نہ دوسروں کو بیٹھنے دیں گے۔ اس کے بعد بھی توانائی کا پورا کوٹا خرچ نہیں کر پاتے! مولوی صاحب کا بھی کچھ اس طرح کا حال تھا۔ بچوں ہی کی مانند ان میں شوخی و شگفتگی تھی۔ کسی بات کا کیسا ہی ردعمل ہو فی الفور اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ بچوں ہی کی طرح جلد خفا اور جلد خوش ہوجاتے۔ بچپن ہی نعمتوں کا کیسا اور کتنا عجیب و قیمتی اندوختہ مولوی صاحب کے حصّہ میں آیا تھا کہ اس نے ان کو اکیانوے (91) سال تک بوڑھا نہ ہونے دیا!''۔2ے

اس مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ رشید احمد نے عبدالحق کی انتھک محنت اور بچوں جیسی شوخی اور شگفتگی اور جلد خفا اور جلد خوش ہونے جیسے صفات کی عکاسی بڑی عمدگی سے کی ہے۔

رشید احمد صدیقی نے مولوی عبدالحق کے علاوہ اصغر گونڈی سے بھی علی گڑھ ہی میں ملاقات کی تھی۔ انھوں نے اصغر سے 1925ء میں مدرسۃ العلوم کے پچاس سالہ جوبلی فنکشن میں ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں ایک اتفاق یہ بھی ہوا تھا کہ مولانا اقبال احمد سہیل جو انھیں 1915ء میں ذاکر صاحب سے ملاقات کروائے تھے۔ انھوں نے ہی اصغر گونڈوی سے بھی ملاقات کروائی تھی۔ ان دونوں سے ان کی ملاقات بھی ان ہی کے گھر پر ہوئی تھی۔ اصغر گونڈوی سے ان کی ملاقات اور ان کی محبت اور شفقت سے متاثر ہونے کا ذکر بڑے شگفتہ اور دلچسپ انداز میں کرتے ہیں:

اصغر صاحب کسی قدر جھکے ہوئے تھے جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی بڑائی اور جھلمساہٹ سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضا کا نہیں انداز کا تھا۔ مسکرانا ایسا جیسا کسی واقعے پر نہیں مسکرا رہے ہیں بلکہ تبسم ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ ان کے چہرے کی فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولانا سہیل سے میں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا۔ بولے، ملو ایک انسان لایا ہوں کہا شکر ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے ملو اصغر صاحب ہیں۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغل گیر ہوگئے کچھ ایسا

محسوس ہوا جیسے محبت اور مرحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل سے آزاد کردیا ہو''۔3

رشید احمد صدیقی نے جن شخصیات کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ان میں سے ان کے گہرے اور قریبی تعلقات بھی تھے۔ایک موقع پر انھوں نے ذاکر صاحب سے اپنی دیرپا ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''ایک موقع پر مجھے ذاکر صاحب کے اعزاز میں تقریر کرنی پڑی میں نے تھوڑی دیر تک یہ سوچا کہ اس پچیس تیس سال میں ذاکر صاحب کی کون سی بات مجھے سب سے زیادہ ممتاز نظر آئی۔ فی الفور میرے ذہن میں یہ آیا کہ ذاکر صاحب نے طالب علمی کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی کام ایسا نہیں کیا جو دوسرے درجہ کا ہو،تیسرے درجہ کا تو سوال ہی نہیں!''4

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی اور ذاکر صاحب کے تعلقات کم از کم 25 یا 30 سال رہے ہیں۔اس عرصے میں انھوں نے ذاکر صاحب کو ہر زاویہ سے دیکھا اور پرکھا ہے۔یہ خاکہ رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں سب سے طویل ہے۔

مولانا احسن مارہروی صاحب سے بھی رشید احمد صدیقی کی دیرپا ملاقات تھی۔ وہ دونوں ساتھ میں کام کرتے تھے اور ان دونوں میں جذباتی لگاؤ بھی تھا۔رشید احمد صدیقی احسن مارہروی کی شخصیت میں جو خوبیاں نظر آئیں ان میں ان کی عظمت وعزت وتوقیر تھی۔ان کی شخصیت کی ان خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

مولانا سید علی احسن مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبہ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔شعبہ کو ان سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر ان کا نام بڑی عزت ومحبت سے لیا جاتا تھا۔ان کے خاندان کی بزرگی کا دور ونزدیک شہرہ

تھا۔ اردوداں طبقے میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ خاص میں ان کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چوں و چرا تسلیم کیے جاتے تھے''۔5

جگر مرادآبادی سے بھی ان کے مراسم 35۔30 سال پرانے رہے ہیں۔ وہ ہر حال میں ان کے ساتھ رہے ہیں۔ جگر مرادآبادی سے ان کے قریبی تعلقات کی وجہ سے وہ ان کی شخصیت سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ جگر کی طبیعت میں صلح جوئی، ثابت قدمی اور قناعت پسندی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ ہر حال میں خوش رہتے تھے۔ لیکن جگر کی شخصیت میں جو عیب تھا وہ ان کی کثرت شراب نوشی تھا۔ رشید احمد صدیقی نے ان کی شخصیت کی قناعت پسندی کا جہاں ذکر کیا وہاں ان کی شراب نوشی کے اس عیب کا ذکر بھی بڑی شائستگی سے کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''یہ یادیں ماضی کے 35-30 سال کی وسیع دھوپ چھاؤں پر محیط ہیں۔ جگر صاحب کو میں نے ہر حال میں پایا ہے، لیکن کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ اس کے بیان کرنے میں مصلحت شامل کرے۔ غفلت میں چاہے وہ بیماری سے ہو چاہے شراب سے۔ تنگدستی و درماندگی کا سابقہ ہو یا ثروت مشہوت کا نشہ، انسان کی زبان سے بعض ان غیر مستحسن جذبات اور خیالات کا اظہار ہو ہی جاتا ہے جو اس کے تحت شعور میں پیدا ہوتے ہیں جگر صاحب ان تمام مراحل سے ثابت قدم گزرے۔ ادنا لوگوں میں ادنا درجے کی تیز و تند شراب کثرت سے پی کر مدہوش ہو جانا لیکن زبان سے کسی ناساز کلمے کا نہ نکلنا معمولی بات نہیں ہے۔ جگر صاحب پر تھوڑی سی اور ہلکی شراب پی لینے کا اثر بہت جلد اور معمولی سے زیادہ ہوتا تھا''۔6

ان کے دوست و احباب میں ڈاکٹر انصاری کو بھی وہ بہت عزیز رکھتے تھے کیوں کہ رشید احمد صدیقی کو بچپن ہی سے گردے کی بیماری تھی اس لیے انھیں ہر وقت ڈاکٹر سے ملنا پڑتا تھا۔ اس

طرح رشید احمد صدیقی ڈاکٹر انصاری کے بہت قریب ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر انصاری سے ملاقات کے بارے میں نہایت شگفتہ اور پر لطف اسلوب بیان میں ذکر کیا ہے:

> ''میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے رجوع کرتا رہا۔ جانتا تھا کہ مرض معمولی نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی تاریک اور ویران ہوجاتی جس کو میں اس طرح چھوسکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپھوندی کو اس وقت ان کے مطب کا رخ کرتا، انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا۔ ان کے انتظار میں کمرے میں بیٹھا، فتح پوری کی دکانوں، گزرنے والوں کی تگ و دو گاڑیوں اور پھیری والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل یہ لہرلہریہ مشغولیت، یہ خلفشار زندگی ہے جس نے ہمیشہ کے لیے محروم کردیا جاؤں گا۔ زندگی ہی وہ کل ہے جو اپنے جزو سے مستغنی ہے تو مجھ پر براس مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہوجاتا اور زیادہ بے تابی کے ساتھ ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگتا''۔7

رشید احمد صدیقی نے جن شخصیات کے مرقعے لکھے ہیں ان میں ایسے اشخاص بھی ہیں جن سے انھوں نے بہت کم ملاقات کی ہے یا پھر جن سے بس دو ایک مرتبہ خط و کتابت ہوئی تھی۔ ان شخصیات میں مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ اس طرح ایک دو کو چھوڑ کر تمام شخصیات سے رشید احمد صدیقی کی دیرپا ملاقاتیں رہی ہیں اور ان ہی دیرپا ملاقاتوں کے نتیجہ میں ان لوگوں سے متاثر ہوکر ہی انھوں نے یہ خاکے قلم بند کیے ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں میں خاکے تمام اجزاء کا بخوبی خیال رکھا ہے۔ مثلاً خاکہ نگاری میں حلیہ نگاری بھی اہم جز کی حیثیت رکھتا ہے، رشید احمد صدیقی شخصیات کی حلیہ نگاری عمدگی سے کی ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا حلیہ بھی رشید احمد صدیقی نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان سے پہلی بار لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے حلیہ کا بیان اس طرح

سے کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے بذات خود علامہ اقبال سے ملاقات کی ہو، مثال دیکھئے:

> '' غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے ۔ لاہور مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا۔ کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کے لیے تیار ہورہے تھے۔ سیاہ عقدہ (تو) باندھتے کالردرست کرتے ہوئے برآمد ہوئے۔ گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں، مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کس قدر تو رانیوں جیسی سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت ومحبت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا''۔8

رشید احمد صدیقی نے اپنے کالج کے چپراسی کندن کا بھی خاکہ لکھا ہے۔ یہ درمیانہ قد کا آدمی تھا۔ رنگ گندمی تھا، جسم مضبوط، اس کی آواز گھنٹے ہی کی طرح پائیدار آواز تھی۔ چنانچہ کندن کا حلیہ انھوں نے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> '' درمیانہ قد، گندمی رنگ ، پتلا نقشہ، معمولی حبشہ، مضبوط جسم ، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پائیدار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ جنس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا نہ دن دیکھا نہ رات ، نہ سردی ، نہ گرمی ، نہ بارش، کبھی کوئی کہتا، کندن بوڑھا ہو، اتنی محنت نہ کیا کر۔ تو وہی کلمہ دہرادیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا۔ یعنی ہجور کالج کا نمک کھایا ہے''۔9

رشید احمد صدیقی، محمد ایوب عباسی کی خوبیوں سے بہت متاثر تھے۔ ان کا چہرہ نا قابل دید تھا، لیکن ان کی صفات ہر کسی کو مرعوب کرتی تھیں یہی وجہ تھی کہ رشید احمد صدیقی بھی ان کی شخصی خوبیوں کے معترف تھے، چنانچہ ان کی حلیہ نگاری کرتے ہوئے ان کی شخصیت کی کشش کا اظہار کتنی عمدگی سے کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

> '' سیاہ فام ، چیچک رو، پستہ قد، نحیف الجثہ ، پہلے پہل کوئی دیکھے تو منہ

پھیر لے، برت لے تو غلام بن جائے، یہ بتا نہیں سکتا کہ ایوب عباسی کی خوبیوں نے ان کی بد ہیئتی کو کس درجہ دل کش بنا دیا تھا''۔10؎

رشید احمد صدیقی نے ان کے چہرے کی خامیوں کے بیان میں غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ ایوب عباسی کے حلیہ کا بیان کرتے ہوئے ان کی شخصیت کی خامیوں پر ہمدردی سے نگاہ ڈالی ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

''وہ معمولی ملگجی شیروانی پہنے، ٹوٹا پھوٹا جوتا، میلا سا مفلر گلے میں لپٹے جلدی جلدی چلے آرہے ہیں،۔ہائے ان کا وہ چھوٹا سا قد مشکل سے پانچ فٹ کا، کسی فکر یا مہم میں مبتلا، مفلر جلد جلد کھولتے لپٹتے راستے میں ہر ایک سے کچھ کہتے سنتے، گرتے پڑتے چلے آرہے ہیں''۔11؎

اصغر گونڈوی کو ہم نہ دیکھا لیکن رشید احمد صدیقی نے جس طرح سے ان کے حلیہ کا بیان کیا۔لگتا ہے کہ اصغر خود ہمارے سامنے موجود ہیں اور ہم انھیں اپنی آنکھوں سے خود دیکھ رہے ہیں۔یہی خوبی رشید احمد صدیقی کی حلیہ نگاری میں نظر آتی ہے، مثال دیکھئے:

''دراز قد، بھرا بھرا جسم ستھری وخوش قطع پوشاک سر پر پٹے۔سڈول فرنچ کٹ ڈاڑھی، اونچی ٹوپی، چہرہ پر اُجالا، آنکھوں میں خلوص کی گہرائی، اور ذہانت کی شگفتگی، تیور میں شرافت، متوسط عمر، انداز میں خود اعتمادی و دل آسائی دل نے گواہی دی کی اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی، یہ اصغر مرحوم تھے''۔12؎

رشید احمد صدیقی کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ پر لطف اور دلچسپ انداز میں موضوع خاکہ کی حلیہ نگاری کرتے ہیں۔جس سے نہ صرف ان کے ظاہری اوصاف بیان کیے جاتے ہیں بلکہ بعض باطنی خصوصیات بھی اجاگر ہوتی ہیں۔

ذاکر صاحب ہمیشہ صاف ستھرے لباس پہنا کرتے تھے۔انھوں نے کبھی بھی داغ لگے ہوئے کپڑے نہیں پہنے تھے۔رشید احمد صدیقی ان کے لباس کی نفاست پسندی کے بارے میں

لکھتے ہیں:

''پوشاک ہمیشہ دیسی کپڑے کی سادہ، سجل، ستھری بیشتر سپید پہنی، ان کے جسم پر کسی نے کالا داغ، ملگجا بوسیدہ یا داغدار لباس نہیں دیکھا''۔13

رشید احمد صدیقی نے جن شخصیات کے خاکے قلم بند کئے ہیں ان کی بہترین حلیہ نگاری کی ہے۔ ان شخصیات کی حلیہ میں ان کے آنکھ، انگلیاں، ڈاڑھی، مونچھ، قد اور ان کی جسامت کو دلچسپ تشبیہات کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ ان کے حلیہ ہی کے بیان میں ان کی شخصیت کے چند باطنی پہلو بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں، انھوں نے شخصیتوں کے ایسی حلیہ نگاری کی ہے کہ تمام شخصیات ہمارے سامنے چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔۔ جس میں رشید احمد صدیقی کا اسلوب اہم رول ادا کرتا ہے۔

خاکہ نگاری کا پورا دائرہ شخصیت کے اطراف واکناف ہی گھومتا رہتا ہے کیوں کہ خاکہ نگاری کا موضوع ہی شخصیت ہے۔ اس لیے اس میں کسی بھی فرد کی شخصیت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے شخصیتوں کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کر دیا ہے، چاہے وہ اچھے ہوں یا برے، انھوں نے شخصیت کے بیان میں غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت میں قناعت پسندی تھی اور کم سے کم زیادہ سے زیادہ کا تصور کرنے کی صلاحیت تھی یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی ان کی اس خصوصیت کو بڑی نعمت سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''فطرتاً خاموش، قناعت پسند اور عافیت جو تھے اپنے بچوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پا لیتے تھے اور خوش ہونے کے لیے کسی بڑی تقریب کے منتظر نہ رہتے۔ چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈ لیتے۔ یہ بہت بڑی صفت اور نعمت ہے اور کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے''۔14

اس اقتباس کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سید سلیمان ندوی بڑی بڑی خوشیوں کی تلاش

نہیں کرتے تھے بلکہ چھوٹی سی خوشی میں بڑی بڑی خوشیوں کی ڈھونڈ لیتے تھے۔

حسن عبداللہ کی شخصیت ایسی ہے کہ وہ بہت جلد خفا ہو جاتے تھے اور جلد ہی مان بھی جاتے تھے۔اس طرح وہ ایک جذباتی انسان تھے۔شخصیت کی خامیوں کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''حسن عبداللہ جذباتی تھے۔ جتنا جلد چڑھ جاتے اتنا ہی جلد من جاتے ہمیشہ چڑھتے پہلے تھے منتے بعد میں تھے، اور جب من جاتے تو پھر آپ کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے، مولوی نذیر احمد نے (Explosive) کا ترجمہ بھک سے اڑ جانے والا مادہ لکھا ہے اس سے بڑھ کر شاید خود انگریزی کا لفظ بھی مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا۔حسن عبداللہ کے بارے میں بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھک سے اڑ جانے والے شخص تھے۔اس جلالی صفت کے بعد ان کی جمالی صفت آتی۔ جب وہ ہم کو آپ کو منانے کے لیے پاؤں پکڑ لیتے معذرت کے سارے کلمات استعمال کر جاتے اور کام کر دیتے''۔15

اس اقتباس میں رشید احمد صدیقی نے غیر جانبداری سے حسن عبداللہ کی شخصیت کی اس کمزوری کے طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ جلد چڑ جاتے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ مخالف کو اپنا بنانے تک دم نہ لیتے تھے۔غرض رشید احمد صدیقی نے ان کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کا بیان بڑی غیر جانبداری سے کیا ہے۔جس سے ان کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کی شخصیت مرعوب کن ہوتی ہے۔ایسے لوگ اکثر دوسروں کو خوش رکھنے کے لئے ہمیشہ رہتے ہیں اور ملنساری، خوش مزاجی سے جس محفل میں ہوتے زعفران زار بنا دیتے ہیں، ایسی ہی شخصیت کے مالک شفیق الرحمٰن قدوائی تھے چنانچہ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''ان کی طبیعت میں بڑی زندہ دلی تھی، شاید ہی کسی نے ان کو دل گرفتار پایا ہو کبھی کبھی تو میں نے یہاں تک محسوس کیا کہ وہ اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے

اپنے کو خوش رکھتے تھے۔ وہ یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے لئے کوئی متفکر یا مضطرب ہو۔ شفیق صاحب کبھی ہار نہیں مانتے تھے کہتے تھے کہ نیت بخیر ہو تو جیت ہمیشہ اپنی ہوگی۔ اس کا تعلق نہ نصیبے سے ہے، نہ فتح وشکست سے، وہ دوستوں کی ہر تفریح میں اس طرح دلچسپی لیتے جیسے وہ تفریح دوست کے لیے نہیں بلکہ خود ان کے لیے تھی، دوستوں کا بیان ہے کہ ہر تفریح نامکمل رہ جاتی اگر شفیق صاحب کی شرکت نہ ہو، سیر، شکار، کھیل کود، سفر وحضر، ہنسی مذاق، رزم و بزم سب میں شفیق صاحب اس طرح حصہ لیتے جیسے اسی کے لیے بنے تھے۔ یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ طبیعت کا یہ رنگ ان کے خلوص و خدمات کا نتیجہ تھا یا ان کے خلوص و خدمات نے طبیعت کا یہ انداز ہ اختیار کر لیا تھا''۔16؂

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اچھے کام کرنے کے سلسلے میں کبھی کسی بھی شخص کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ بہت مقبول بھی تھے اور بدنام بھی تھے۔ ان کی اسی خصوصیت کو اجاگر کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''اچھے مقصد کی حمایت کرنے میں مولوی صاحب بڑے سے بڑے آدمی کے جبر وقہر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس صفت میں بہتوں سے بہت ممتاز بھی تھے اور بدنام بھی۔ یہ سب اس لیے ممکن تھا کہ مولوی صاحب کے خلوص نیت اور حسن عمل کا ہر شخص قائل تھا۔ کسی کے دل میں یہ وسوسہ نہیں گزرتا تھا کہ عملی و تعلیمی مشاغل کے علاوہ ان کا کسی مشتبہ سرگرمی یا ذات گرامی سے تعلق تھا''۔17؂

رشید احمد صدیقی نے جن شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں ان سے وہ نہ صرف ان کی دیرپا ملاقاتیں اور قریبی تعلقات تھے بلکہ جذباتی طور پر بھی ان سے وہ وابستہ رہے ہیں، رشید احمد صدیقی کا ان سے ایسا لگاؤ رہا کہ ان کے گذرنے پر ان کے کیا جذبات وتاثرات رہے ہیں اس کا ذکر بھی ان کے خاکوں میں ملتا ہے۔ اس سے خود رشید احمد صدیقی کی شخصیت سے ہمیں واقفیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے

دوست واحباب سے کتنی قربت رکھتے اوران کے بچھڑنے کے خیال سے کس قدر بے قابو ہوجاتے تھے مثلاً ذاکرحسین کے انتقال کی خبرسن کران پر کیا گذری اس کا حال رشید احمد صدیقی کی زبانی سنیئے:

''حادثے کی خبر سنتے ہی وہ ہوا جو بے اختیاری میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ جیسے اپنا وجود رہ گیا ہو نہ شعور۔ درد و درماندگی اور گذرے ہوئے دنوں کی یادوں کا اجزا ہوا قافلہ مرحوم کی تکریم و تعاقب میں رواں دواں ہوگیا۔ آواز سے بے اختیار رونے لگتا وہ بھی نوکروں بچوں اور عورتوں کے سامنے بڑھاپے میں زیب تن نہیں دیتا۔ لیکن کیا کروں حادثہ سخت ہوتو آداب محفل کوملحوظ رکھنا میرے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگا اور کیا عجیب یہ احساس تھا کہ اس حادثے کے بعد اپنی تمام خوبیاں متاع کا سدا اپنے تمام کارنامے بے نور، وہ تمام تعمیریں سماروہ سبز وشاداب باغ جھلس گیا، اور نہریں خشک ہوگئی ہوں اور امید وحوصلے کے وہ سفینے غرق ہونے لگے ہوں جن سے کبھی ذہن اور تخیل کی فضاء معمور منور اور معطر تھی، جیسے کسی جدید ترین ہولناک بم کے پھٹنے سے آدمی، جانور، ہوا، پانی، نباتات و جمادات اور ہر وہ چیز جو دیکھی یا محسوس کی جا سکتی تھی مسخ معدوم پاش ہونے لگی ہو''۔18

مذکورہ بالا اقتباس کو پڑھ کر رشید احمد صدیقی کے ذاکر صاحب سے قریبی تعلقات کا نہ صرف علم ہوتا ہے بلکہ ان کے جذبات وتاثرات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کا اسلوب اس قدر جاندار ہے کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ ان کے دلکش اسلوب کی ہی خصوصیت ہے کہ قاری بھی خاکہ نگار کے احساسات و جذباتی کیفیات سے خود گذرنے لگتا ہے۔ ذاکر حسین ہی کی طرح محمد اقبال سے بھی ان کے تعلقات بڑے گہرے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر رشید احمد صدیقی جس دلی کیفیت سے دوچار ہوئے اس کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''بڑی گرمی پڑھ رہی تھی دور دراز کے سفر سے واپس آرہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن

کے پلیٹ فارم پر اترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے بہت تھوڑی دیر کے لیے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت، یہ بات صرف ایک آن کے لیے تھی ''آسیائے گردش ایام' ایک آن کے لیے رک سی گئی لیکن فوراً ہی پھر رواں ہو گئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کو جی ہوا۔ ہر چیز ہر شخص اجنبی سا معلوم ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرہ بند کر کے لیٹا رہا۔'' 19ؔ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی اقبال کے انتقال کی خبر سن کر بہت جذباتی ہو گئے تھے۔ ہر چیز میں دلچسپی ختم ہو گئی تھی وہ تنہا رہنا پسند کرنے لگے تھے۔ اس سے ہمیں ان کی اقبال سے گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

خاکہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت غیر جانبداری بھی ہے۔ یعنی اس میں شخصیت کی صفات کے بیان میں غیر جانبداری سے کام لینا ضروری ہے کیوں کہ شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کا بیان غیر جانبداری سے کرتا ہے تو شخصیت کی سچی اور حقیقی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اگر کسی تعصب کی بناء پر یا پھر عقیدت کی بناء پر کرے گا تو اسے مبالغہ سے کام لینا ہوگا۔ جس سے شخصیت کی بھرپور عکاسی ممکن نہیں لیکن خامیوں کے بیان میں بھی ان کا ہمدردانہ لہجہ واضح طور پر جھلکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شخصیات کی صفات کے بیان میں غیر جانبداری سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کی اس خامی کی طرف اشارہ کیا کہ:

''مولانا کی رہبری میں پیغمبرانہ طریق دعوت کے بجائے آمرانہ شان اور گہرائی کی ادا تھی وہ اتنے پبلک کے نہیں جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ مولانا اپنے آپ کو عوام سے زیادہ خواص کی رہنمائی پر مامور سمجھتے تھے''۔ 20ؔ

رشید احمد صدیقی نے جگر مرادآبادی کے حلیہ کے بیان میں غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔

خامیوں کا بیان بھی اس ہمدردانہ نقطہ نظر سے کرتے ہیں کہ شخصیت کی خامی بھی ہمیں بھلی لگنے لگتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> جگر صاحب شکل وصورت کے اچھے نہ تھے لیکن اس وقت ان کا مسکراتا اور کبھی رہ رہ کر ہنس پڑتا اور جلد ہی کچھ کہنے لگنا تاکہ میں ان کے اس اضطراب و انبساط کو جان نہ سکوں ایسا دل نشین اور قابل فخر واحترام محسوس ہوتا کہ میں اس وقت اس کو کسی تشبیہہ واستعارے سے بھی واضح نہیں کرسکتا۔ یہاں تک کہ اس کو کسی حسین دوشیزہ یا معصوم سے معصوم تندرست بچے کے مسکرانے اور ہنسنے سے بھی تشبیہہ دینا کافی سمجھتا ہوں! جگر صاحب اچھی صورت کے ہوتے تو شاید اتنے اچھے نہ معلوم ہوتے''۔21؎

یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب کے چہرے کی بدنمائی کے بیان میں رشید احمد صدیقی نے جس مخلصانہ اور ہمدردان رویہ کا اظہار کیا ہے اس سے جگر کی شکل وصورت کا عیب سے زیادہ ان کے دلنشین انداز اور مسکراہٹ مرعوب کن بن گئی۔ جگر ہی نہیں بلکہ انھوں نے جن شخصیات میں کوئی عیب پایا اس کا بیان نہایت خلوص کے ساتھ کیا ہے۔

سید نصیر الدین علوی کی کمیوں اور خامیوں کے بیان میں بھی ہمدردانہ اور مخلصانہ رویہ اختیار کیا کہ اگر وہ خود اپنا خاکہ پڑھ لیں تو ان کی دل شکنی بھی نہ ہو، اور وہ اپنی اس خامی کا بہ خوشی اعتراف بھی کرلیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اور نہ امتحان میں فیل پاس ہونے کو کچھ زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ شوخی، شرارت اور اس نوع کی معرکہ آرائیوں سے دلچسپی تھی، کالج میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ یا معرکہ تصنیف کرتے رہتے۔ لیکن اس طرح کے معرکے کبھی منتظمین کالج یا اساتذہ کے خلاف نہ ہوتے نہ اس کا تعلق سیاسی یا جماعتی منافشوں سے ہوتا۔ ان باتوں سے وہ بالکل ہی بے تعلق

تھے''۔22

رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں میں ایسے واقعات کا انتخاب کیا ہے، جس سے ان کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے۔انھوں نے ایسے ایسے معمولی واقعات کا انتخاب کیا ہے جس کا ہمیں علم نہیں ہے۔اس طرح کے کئی واقعے ان کے خاکوں میں شامل ہیں۔مثلاً ذاکر حسین کو ہم صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے جانتے ہیں، مگر رشید احمد صدیقی نے ایک واقعہ کے حوالے ان کی شخصیت کے اس پہلو سے ہمیں روشناس کرایا کہ وہ کسی نئی بات یا نئی چیز کو دریافت کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے اور چھوٹی چھوٹی معلومات بھی بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ حاصل کر لیتے ہیں۔اس میں کسی طرح کی جھجھک نہیں کرتے تھے۔ان کی شخصیت کے اسی خاص پہلو کو ایک واقعہ کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

''ڈاکٹر اصغر کے ہاں پہنچے تو میاں بیوی دونوں باغ باغ ہو گئے۔ان کی اہلیہ ایک جرمن خاتون ہیں۔ان کو نفیس کیک، بسکٹ اور انگریزی مٹھائی بنانے، اس سے زیادہ کھلانے اور مکان کو سجانے اور ستھرا رکھنے کا شوق اور مریض کی تیمار داری کرنے میں کمال حاصل ہے ذاکر صاحب کے پہنچتے ہی انھوں نے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں لاکر رکھ دیں ہم سب نے کھایا اور ذاکر صاحب نے پوچھنے اور سیکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔کیک اور بسکٹ کے بنانے کا کیا طریقہ ہے اس کے لیے مخصوص چولھے اور تنور کیسے بن سکتے ہیں۔مرغیاں پالنے کی کیا تدابیر ہیں اور یہ تمام باتیں محض لطف سخن یا عدائد رسمیہ کے طور پر نہیں بلکہ یہ سب اس لیے کہ جامعہ میں ان کو کس طرح نافذ کیا جائے۔ باورچی خانے میں جا کر چولھے کا نقشہ دیکھا اور سمجھا، مرغی اور بطخ کے ڈربے دیکھے۔ایک بطخ پر ذرا زیادہ توجہ ڈال دی وہ بیگم اصغر نے دوسرے دن ذاکر صاحب کے اعزاز میں میز پر چُن دی''۔23

رشید احمد صدیقی نے نہ صرف کسی شخصیت کی صفات کی عکاسی واقعات کے ذریعہ کی ہے بلکہ شیخ حسن عبداللہ نماز بڑی پابندی سے پڑھتے تھے۔ان کی نماز پڑھنے کی عادت کو رشید احمد صدیقی ایک واقعہ کے ذریعہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''امور شریعہ میں بڑے جھپک اور بے لچک تھے۔انگلستان میں ٹیوب کے اسٹیشن پر اترے،سامنے زینہ،زینہ کے موڑ پر تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی آتے جانے والوں کا ریلا تھا۔نماز کا وقت یاد آ گیا۔وہیں نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ادھر کا مجمع اُدھر اور اُدھر کا اِدھر گڑ بڑ مچ گئی۔پولیس سارجنٹ بلا لیا گیا اس نے پہلے تو کچھ غور کیا پھر کہا یہ رکوع میں چلے گئے تو اس نے سیٹی بجائی،یہ اُٹھ کر کھڑے ہوئے تو اس نے ان کے دونوں شانوں کو جھنجھوڑا،یہ نیت توڑ کر اس سے گتھ گئے،سالہ پولیس کمشنر تک پہنچا،اس نے ان کو فہمایش کی کہ مشارع عام راستہ چلنے کے لیے ہے،عبادت کے لئے نہیں اور سارجنٹ کو تاکید کی کہ غیر ملکیوں کا بہر حال احترام کرنا چاہئے۔یہ واقعہ آج کہیں ہندوستان میں ہو جاتا تو اللہ ہی جانتا ہے کیا کچھ نہ ہو جاتا۔۔۔۔!''۔24

رشید احمد صدیقی نے شخصیتوں کی عادات واطوار کی عکاسی بھی کی ہے،مثلاً ان کی چائے پینے،حقہ پینے اور مشاعرہ سننے کی عادات کے علاوہ بعض دوسری عادتوں کا تذکرہ بھی دلچسپ انداز میں کیا ہے،جس سے اس کی مکمل تصویر ہماری نظروں میں گھوم جاتی ہے۔اسی طرح کی ایک عادت مولانا احسن مارہروی کی ہے،ان کو چائے بہت پسند تھی،اس کے علاوہ وہ آم کے بھی شوقین تھے۔ان کی اس عادت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''چائے سے عشق تھا،بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا۔نصف پیالی شکر اور نصف پیالی چائے۔اس طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے۔برسات میں پھنسیوں سے لد جاتے تھے۔لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو

در کنار، کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ اس وضع داری نے کارنیل سے دو چار کیا اور کارنیل نے انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا''۔ 25ے

مولانا سلیمان اشرف کی ایک عجیب عادت تھی کہ وہ سردی کے مہینے میں باہر صحن میں سوتے تھے اور گرمی کے موسم میں کمرے کے اندر اچھی طرح چادر اوڑھ کر سوتے تھے۔ ان کی اس عادت سے متاثر ہوکر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''مرحوم کے معمولات بھی غیر معمولی تھے۔ سردیوں میں باہر سوتے تھے۔ ابتداء تو بالکل صحن میں لیکن ادھر چند سال سے برآمدے میں آرام کرنے لگے تھے، گرمیوں میں اندر رضائی اوڑھ کر، بستر گداز، چادریں ستھری، تکیے متعدد، پنکھے کا کوئی دستور نا تھا۔ گرمی میں نہ صرف برف کا پانی مل سکتا تھا نہ سردی میں گرم پانی، شام کا نہانا اور دھوپ میں بیٹھنا منع کرتے تھے۔ دوسرے کے تولیے یا رومال سے ہاتھ نہیں پونچھتے تھے۔ ننگے سر بمشکل دیکھے گئے۔ گفتگو بلند آواز سے کرتے تھے۔ کانا پھوسی گوارا نہ تھی۔ عمامہ اکثر ہلکے زعفرانی رنگ کا ہوتا، اور جوتی دلی کی پرزہ ململ کا لمبا بڑی کشادہ آستینوں کا کرتا پہنتے جس کے نیچے ہمیشہ ململ کی جشن دار صدری ہوتی۔ کپڑا قیمتی اور شریفانہ رنگ اور وضع کا ہوتا۔ اچھا کپڑا پہنتے دیکھتے تو خوش ہوتے اور تعریف کرتے، ناپسند ہوتا تو کہہ دیتے، سالن تیز مرچوں کا پسند تھا، ہمیشہ چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کھاتے، لکھنے میں سطر بھی نہیں سیدھی ہوتی تھی۔ جیسے دوست رکھتے اس سے نہایت خوش ہوکر آگے بڑھ کر جی کھول کر ملتے اور کوئی نہ کوئی خوش دلی کا فقرہ ضرور کہتے۔ مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے، کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے، نہ کسی کے اقتدار سے، مذہبی عقائد میں کٹر سلوک میں بےلوث، جو جتنا چھوٹا ہوتا اس سے اتنا ہی فروتنی سے ملتے۔ بڑا ہوتا اس سے کہیں بڑا ہوکر ملتے۔ علم کا وقار ان کے دم سے تھا، معزز و محبوب مولوی میں ان ہی کو پایا''۔ 26ے

اس اقتباس سے ہمیں نہ صرف سلیمان اشرف کی شخصیت سے بھرپور واقفیت ہوتی ہے بلکہ ان کی شخصیت جیتی جاگتی، چلتی پھرتی ہماری نظروں میں گھوم جاتی ہے۔

خاکہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ خاکہ نگار شخصیت کے خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے خود اپنے صفات کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہمیں رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں بھی ملتی ہے، مثلاً رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں میں اپنی بعض کمزوریوں کا ذکر بھی کیا ہے چنانچہ شیرہ شاہ سلیمان کو ریاضی میں اچھی مہارت حاصل تھی، جبکہ رشید احمد صدیقی کو نہیں تھی، اس کا بیان وہ یوں کرتے ہیں:

> ''طبیعاتی ریاضی سے شغف تھا اور اس فن میں ان کی حیثیت مانی جاتی تھی،
> مجھے ریاضی سے اور ریاضی کو مجھ سے عناد ہے''۔ 27ؔ

رشید احمد صدیقی نے سید نصیر الدین علوی کا حافظہ بلا کا پایا جبکہ خود ان کا حافظہ کمزور تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''مرحوم کا حافظہ بڑا قوی تھا، غیر موزوں اور مہمل اشعار بھی سالہا سال جوں کے توں یاد رہتے ۔ اسے میں بڑا کمال سمجھتا ہوں کیوں کہ میں خود ان لوگوں میں ہوں جن کو موزوں اشعار بھی اس وقت تک یاد نہیں ہوتے جب تک انھیں ناموزوں نہ بنالیا جائے''۔ 28ؔ

ان اقتباسات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں میں شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ خود اپنی شخصیت کے بعض نیم تاریک گوشوں کو بھی واضح کرنے کی سعی کی ہے۔

خاکوں میں اسلوب کی اہمیت ہوتی ہے، جتنے بھی مزاح نگار ہیں ان کے خاکوں میں شگفتگی و تازگی، لطافت اور دلکشی کے عناصر کے علاوہ فنی محاسن کا بھی احساس ہوتا ہے رشید احمد صدیقی کے خاکوں

میں اسلوب کا خاص خیال رکھا ہے۔ان کے خاکوں میں بات سے بات پیدا کرنے اور الفاظ کی الٹ پھیر سے لطف پیدا کرنے کی خصوصیت ملتی ہے۔ ان کے خاکوں میں انشائیہ کا لطف آتا ہے ، مثلاً وہ شخصیت کا بیان کرتے ہوئے خیالات کی رو میں بہتے چلے جاتے تھے کہ دیگر اشخاص کا ذکر بھی کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ذاکر صاحب کے خاکے ذاکر حسین کی شخصیت کے بیان میں شفیق الرحمٰن کا ذکر کرنے لگتے اور دیگر اشخاص اور پھر علی گڑھ کا بیان کرنے لگتے یعنی بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور وہ اپنے خیالات کی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں، اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''ذاکر صاحب شفقت اور بچوں کی شگفتگی کے ساتھ معلوم نہیں کیوں کہ اس وقت شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کی یاد آتی، کتنی حزیں اور دلنشین! لیکن جلد ہی ذاکر صاحب شفیق صاحب اور جامعہ کے اکٹھا تصور سے تسکین بھی ملی، اعلیٰ یادیں اور عظیم یادگاریں چھوڑ جانا بھی انسان کا کتنا بڑا امتیاز ہے۔ جیسے خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں یہ لوگ اضافہ کرتے جاتے ہوں''۔29

رشید احمد صدیقی کے خاکوں کی ایک اہم خصوصیت الفاظ کی الٹ پھیر سے بھی وہ اپنے اسلوب کو دلکش بناتے ہیں۔ انھوں نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہوئے الفاظ کی الٹ پھیر سے اسلوب کو پرلطف بنانے کی کوشش کی ہے، مثال دیکھئے:

> ''ایسے لوگ کم دیکھے گئے ہیں جو اس کم عمری میں اپنے آپ کو دنیا کے راستوں پر نہیں بلکہ دنیا کو اپنے راستے پر چلنے کے لئے تیار کر لیتے ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایسے ہی تھے۔ دنیا کے راستے پر چلنے والے دنیا کے اشارے کے محتاج ہوتے ہیں۔ مرداں ن کار آگاہ بنائے ہوئے راستے پر چلنے کے لئے خود دنیا ان کے اشارے کی محتاج و منتظر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا تمام عمر خود کے مشورے یا مدد کے خواستگار نہیں ہوئے۔ ان کی مدد اور مشورے کے محتاج و منتظر دوسرے رہے۔ وہ صرف اپنے بنائے ہوئے معیار خوب و زشت کی

پابندی کر سکتے تھے''۔30

اس مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلتے تھے اور دوسروں کے لیے بھی راستہ بناتے تھے۔ مگر وہ دوسروں کے بنائے ہوئے راستے پر نہیں چلتے تھے۔ اسی طرح سے ذاکر صاحب کی شخصیت کے ایک پہلو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ذاکر صاحب کا ماضی ان کے حال سے اور ان کا حال ان کے ماضی سے کم شاندار نہیں رہا ہے لیکن اس کا تذکرہ انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ ہر بڑے آدمی کی طرح ان کو اس امر کا احساس تھا کہ حال کو ماضی پر فخر کرنے کے بجائے ماضی کو حال پر فخر کرنا چاہئے''۔31

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کی الٹ پھیر کے ذریعہ کسی شخصیت کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ یہ ان کے اسلوب کا کمال ہے کہ وہ الفاظ کو بڑی فنی چابکدستی سے استعمال کر کے اپنے اسلوب کو دلکش و دلچسپ بنا دیتے تھے۔

ایک اقتباس ملاحظہ ہو جہاں انھوں نے شفیق الرحمٰن کی شخصیت کی عکاسی ایک واقعہ کے حوالے سے کی ہے، جس سے رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری کا اندازہ ہوتا ہے:

''بہت دنوں بعد ملاقات ہونے پر میں نے پوچھا شفیق صاحب! آپ کو سبھوں نے چھوڑ کیسے دیا۔ آپ کا حلیہ اور جسم تو ایسا تھا کہ مارنے والے کو ایک کے بجائے دس کا ثواب ملتا تو حسب معمول زور سے ہنسے اور بولے ثواب اتنا کما چکے تھے کہ اس کا بازار بھاؤ بالکل گر گیا تھا''۔32

رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں محاوروں کا استعمال بھی بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ مثلاً سید سلیمان ندوی کی تصنیف کی تعریف کرتے ہوئے محاوروں کا بخوبی استعمال کیا ہے مثلاً:

''خیام کے بارے میں مغربی مصنفین نے جو کچھ لکھا تھا اور ان کی دیکھا

دیکھی یا سنی سنائی، ہم ہندوستانی جو کچھ کہنے لگے تھے، وہ میرے نظر تھا، لیکن خیام
پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو۔ باغ باغ ہو گیا کہ معرکہ کی ایک تصنیف
اردو میں دیکھنے میں آئی''۔33

نواب محمد اسمٰعیل خاں کی زندگی میں انھیں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ شروع سے آخر تک مشکلات ہی میں رہے۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی نے ان کی شخصیت کے حالات کے بیان میں محاوروں کا بڑا عمدہ استعمال کیا ہے اقتباس دیکھئے:

''نواب صاحب شروع سے آخر تک مالی دشواریوں میں مبتلا رہے۔۔۔
جوں جوں دن گزرتے گئے یہ دشواریاں بڑھتی گئیں، آخر میں نوبت یہاں تک
پہنچ گئی تھی کہ کسی وقت بھی پانی سر سے اونچا ہو سکتا تھا لیکن حیرت اس پر ہے کہ
نواب صاحب کی کسی بات سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ان پر کیا گذری ہے، تنگ
حال ہوتا اور اس کا اظہار نہ ہونے دینا اتنا ہی مشکل ہے یقیناً اقتدار کو پہنچنا اور
آپے میں رہنا''۔34

یہاں پانی سر سے اونچا ہونا، آپے میں رہنا محاوروں کا استعمال ہوا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کی عکاسی کرتے وقت تشبیہہ کا اچھا استعمال کیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد عوام کے آدمی نہ تھے، کتنے خواص کو بھی ان کے ہاں
عوام درجہ پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، شاید انھوں نے اقبال کے عقاب کی طرح
چٹانوں کی بلند و یران تنہائیوں میں اپنی دنیا بنا رکھی تھی''۔35

رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں میں تشبیہات کا استعمال بھی عمدگی سے کیا ہے۔ جس سے ان کے اسلوب کا حسن دوبالا ہو گیا ہے مثلاً مولوی عبدالحق کے خاکے میں تشبیہات کا استعمال بھی جگہ جگہ کیا ہے اس خاکے میں ڈاکر صاحب کی خوب صورت نواسی کو نیلوفر سے تشبیہ دی ہے پھر آگے ڈاکر

صاحب کو قدیم اوران کی نواسی کو جدید سے تشبیہ دی ہے:

''ایک طرف نیلوفر جیسی خوبصورت چنچل ذہین بچی تھی، دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کی نورانی شکل اور لطف ومرحمت سے لبریز آزمودہ محکم شخصیت میں جب کبھی بچی کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں یا ان کی انگلی پکڑے لان میں ٹہلتے دیکھتا تو محسوس کرتا جیسے کوئی قدیم، جدید کو زندگی اور زمانے سے روشناس کرار ہاہو''۔36

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہ صرف الفاظ کے الٹ پھیر سے نئے معنی ومفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ بات سے بات پیدا کرنے اور تشبیہات اور محاورات کے عمدہ استعمال کے ذریعہ اسلوب کی تازگی و شگفتگی کو برقرار رکھنے کی سعی ملتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔

غرض رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں میں شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کو بڑے دلکش و پر لطف اسلوب کے ساتھ اس عمدگی سے عکاسی کی ہے وہ شخص جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا آپ کے سامنے موجود نظر آتا ہے، یہ رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔

انھوں نے اپنے خاکوں میں تشبیہات واستعارات اور عمدہ محاوروں اور بذلہ سنجی کے ذریعہ اپنے اسلوب کو جاندار اور پرلطف بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے خاکوں میں خاکہ نگاری کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم ملتی ہیں مثلاً حلیہ نگاری، پہلی ملاقات پر ابھرنے والے تاثرات، عادات واطوار، پسند ناپسند، اخلاق وکردار اور شخصیت سے اپنی گہری وابستگی کے علاوہ شخصیت سے متعلق مختلف واقعات کے ذریعہ سے بھی انھوں نے سیرت وکردار پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔

☆☆☆

حواشی:

1۔ شیر شاہ سلیمان، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، س:181

2۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:243

3۔ اصغر حسین اصغر گونڈی، مشمولہ، گنجہائے گراں مایہ، ص:83

4۔ ذاکر صاحب، مشمولہ، ہمارے ذاکر صاحب، ص:13

5۔ مولانا احسن مارہروی، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:135

6۔ تیری یاد کا عالم، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:196

7۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مشولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:12

8۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال، مشمولہ، گنج ہالے گراں مایہ، ص:122

9۔ کندن، مشمولہ، ہم نفساں رفتہ، ص:171

10۔ محمد ایوب عباسی، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:104

11۔ محمد ایوب عباسی، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:105

12۔ اصغر حسین اصغر گوندوی، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:83

13۔ موجِ گل سے چراغاں ہے گزرگاہ خیال، مشمولہ، ہمارے ذاکر صاحب، ص:121

14۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مشمولہ، ہم نفساں رفتہ، ص:39

15۔ شیخ حسن عبداللہ، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:190

16۔ شفیق الرحمٰن قدوائی، مشمولہ، ہم نفساں رفتہ، ص:13

17۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:230

18۔ ایسا کہاں سے لاؤں تجھ سا کہیں جسے، مشمولہ، ہمارے ذاکر صاحب، ص:120

19۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:120
20۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مشمولہ، ہم نفساں رفتہ، ص:115
21۔ تری یاد کا عالم، مشمولہ، گنجہائے گراں مایہ، ص:202
22۔ سید نصیر الدین علوی، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:162
23۔ ذاکر صاحب، مشمولہ، ہمارے ذاکر صاحب، ص:19
24۔ شیخ حسن عبداللہ، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:191
25۔ مولانا احسن مارہروی، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص،148
26۔ مولانا سید سلیمان اشرف، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:50
27۔ سر شاہ سلیمان، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:182
28۔ سید نصیر الدین علوی، مشمولہ، گنج ہائے گراں مایہ، ص:167
۲۹۔ ایسا کہاں سے لاؤں تجھ سا کہیں جسے، مشمولہ، ہمارے ذاکر صاحب، ص:137
۳۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مشمولہ، ہم نفساں رفتہ، ص:114
۳۱۔ ایسا کہاں لاؤں تجھ سا کہیں جسے، مشمولہ، ہمارے ذاکر صاحب، ص:135
۳۲۔ شفیق الرحمٰن قدوائی، مشمولہ، ہم نفساں رفتہ، ص:15
۳۳۔ سید سلمان ندوی، مشمولہ، ہم نفساں رفتہ، ص:29
۳۴۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں، مشمولہ، ہم نفساں رفتہ، ص:96
۳۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مشمولہ، ہم نفسان رفتہ، ص۔113
۳۶۔ ہم نفساں رفتہ، ص:63

☆☆☆

شوکت تھانوی (پیدائش1963۔وفات1904)

شوکت تھانوی کا شمار اردو ادب کے ان مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے ادب کی بہت سی اصناف میں طبع آسمائی کی ہے۔ بنیادی طور پر وہ اردو کے اہم مزاح نگار ہیں۔ان کا اصلی نام محمد عمر تھا۔ مگرادب میں شوکت تھانوی کے نام سے شہرت حاصل کی ۔وہ فروری 1904ء کو بندرا بن میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام صدیق احمد ہے۔وہ لکھنو کے محکمہ پولس میں لازم تھے۔

شوکت تھانوی کی تعلیم کا سلسلہ دیر سے شروع ہوا۔ کیوں کہ وہ بچپن میں بیمار رہتے تھے۔ ابتداء میں ماسٹر صاحب گھر پر آکر تعلیم دیتے تھے۔انہوں نے ابدتائی تعلیم بھوپال میں حاصل کی۔ جیسے ہی ان کے والد بھوپال کی ملازمت ترک کر کے لکھنو چلے گئے۔شوکت تھانوی بھی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لکھنو کے چرچ مشن ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور پھر ہائی اسکول کی تعلیم کے لئے گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں داخلہ لیا۔اور خالی اوقات میں انھوں نے اپنی والدہ سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔

والد کے انتقال کے بعد معاش کی فکر میں انھوں نے مشہور اخبار 'ہمدم' میں بطور مترجم ملازمت اختیار کی۔اس کے علاوہ وہ اودھ اخبار کی ادارت بھی کر چکے ہیں۔انھوں نے خود کا روز نامہ 'طوفان' بھی نکالا۔تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے اور وہاں روز نامہ 'جنگ' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔4رمئی 1963ء کو ان کا انتقال لاہور میں ہوا۔

شوکت تھانوی نے کسی ایک صنف میں طبع آزمائی نہیں کی بلکہ جس صنف میں بھی قلم اٹھایا اس کو اپنی مزاح نگاری سے دلچسپ بنا دیا۔ انھوں نے شاعری، ناول، ڈرامے، مضامین، افسانہ اور خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ خاص طور پر انھوں نے اپنے مضامین، ناول، اور افسانوں کے موضوعات کے انتخاب میں توجہ دی ہے۔ جس کی وجہ سے قاری ان کے مضامین پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے مضامین کے 6 مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ ہیں ''موج تبسم''، ''بحر تبسم''، ''طوفان تبسم''، ''سیلاب تبسم''، ''دنیائے تبسم'' وغیرہ۔

شوکت تھانوی کے ناولوں میں دل پھینک، سودیشی ریل، بکواس، بیوی، کتیا، غزالیہ، سسرال، چارسوبیس، بقراط، بیگ صاحبہ، نیلوفر اور بھابھی وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے ڈرامہ نگاری کی طرف بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے ڈراموں کے مجموعوں میں منشی جی، قاضی جی، (جلد اول، دوم، سوم، چہارم) وغیرہ ہیں۔ یہ تمام ان کے ریڈیائی ڈرامے ہیں۔ انھیں کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اور ''گہرستان'' کے نام سے ان کے شاعری کا مجموعہ 1934ء میں شائع ہوا۔ اس میں 93 غزلیں، دو نعتیں، اور دو نظمیں شامل ہیں۔

شوکت کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ ''شیش محل'' اور ''قاعدہ بے قاعدہ'' ہیں۔ ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''شیش محل'' ہے۔ یہ 1943ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ دوسرا اور آخری مجموعہ ''قاعدہ بے قاعدہ'' ہے۔ جو 1956ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں خاکے حرف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں اکتیس خاکے شامل ہیں۔ اس میں ان کا اپنا خاکہ بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، میراجی، جوش، حفیظ ہوشیار پوری، خدیجہ مستور، حاجرہ سرور، منٹو، ضیا، جالندھری، مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں، غلام عباس، فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، مجنوں گورکھپوری، ن۔م۔ راشد، وقار عظیم اور

یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ کے خاکے شامل ہیں۔

شوکت تھانوی کے خاکوں میں خاکہ نگاری کی خصوصیات بڑی عمدگی سے ملتی ہیں۔ خاکہ نگار اپنے خاکوں میں موضوع خاکہ سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ شوکت تھانوی نے شخصیات سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر بڑی دلچسپی سے کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی سے ان کی پہلی ملاقات لکھنو میڈیکل کالج میں ہوئی تھی۔ اصغر گونڈوی نے رشید احمد صدیقی سے ان کی ملاقات کروائی تھی۔ اس ملاقات کا تذکرہ انھوں نے بڑے لطیف انداز میں کیا ہے مثلاً لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے حضرت اصغر گونڈوی کے ساتھ آپ سے لکھنو میڈیکل کالج میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ جہاں یورپین وارڈ میں ایک گردہ نکلوانے کے بعد اس طرح اطمینان سے بستر علالت پر دراز تھے گویا مرگردہ کھوکر زندگی پالینے سے اپنے کو گھاٹے میں نہیں سمجھتے۔'' 1

احتشام حسین سے ان کی پہلی ملاقات الہ آباد میں احمد صاحب کے گھر پر ہوئی تھی۔ شوکت تھانوی نے ان سے ملاقات کا ذکر بھی بڑے شگفتہ اور لطیف انداز میں کیا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:

''الہ آباد میں اویس احمد صاحب ادیب کے یہاں صبح کی چائے ایک سبزہ زار پر پی رہے تھے کہ ایک نستعلیق ٹائپ کے نوجوان اپنے تجلی طور پر چمکانے والے دانتوں سے ہنستے ہوئے تشریف لائے اور ایک کرسی پر بیٹھنے والے ہی تھے کہ اویس صاحب نے احتشام حسین کا نعرہ بلند کر کے گرم گرم چائے ان کے پیروں پر گرادی وہ متانت سے کچھ تھوڑا سا اچک کر ایک طرف ہوگئے اویس صاحب نے بجائے مفردات کے فرمایا۔ آپ سے ملیے ''شوکت صاحب تھانوی ''وہ مصافحہ کی نیت سے اپنا ہاتھ لے کر بڑھے اور آخر وہی ہوا جس کو مصافحہ کہتے ہیں۔ یہ تھی احتشام حسین سے پہلی ملاقات''۔ 2

امتیاز علی تاج سے پہلی ملاقات پر ابھرنے والے تاثر کا بیان بھی کیا ہے۔ امتیاز علی تاج کے

لباس اور جوتے کا ذکر کرتے ہوئے ان سے پہلی ملاقات کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''لکھنو تراش کا کرتا، چوڑی دار پاجامہ، سلیم شاہی جوتا پہنے ہوئے انارکلی کے مصنف سے ملاقات ہوئی۔ خوبصورتی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر پان چبا رہے تھے۔ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پہلی ملاقات تھی۔ لہٰذا رسمی تکلفات ہی میں ختم ہوگئی''۔ 3

آغا حشر کاشمیری سے شوکت تھانوی کی ملاقات بچپن ہی میں ہو چکی تھی۔ جب آغا حشر کاشمیری تھیٹریکل کمپنی کے سلسلے میں لکھنو گئے تھے۔ ان کی ملاقات کے واقعہ کا بیان بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ جس سے آغا حشر کاشمیری کے حلیے اور شخصیت سے مکمل تعارف ہوتا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''بہر حال میں بہت چھوٹا تھا۔ جب لکھنو میں میرے مکان کے سامنے ہی میدان میں ایک تھیٹریکل کمپنی نے اپنا منڈوا بنا کر تماشے شروع کئے اس کمپنی کے کرتا دھرتا ایک صاحب تھے۔ جو ریشمی تہبند باندھے، دیکھتے کسی اور طرف تھے اور نگاہیں کسی اور طرف ہوتی تھیں۔ کبھی اس کو ڈانٹ کبھی اس کو ڈپٹ، گالم گلوچ میں بھی کوئی عذر نہیں مگر خود نہایت پھرتیلے، نہایت محنتی اور بظاہر نہایت چلتے ہوئے معلوم ہوا کہ ان صاحب کا نام ہے'' آغا حشر کاشمیری'' اس وقت تو کہا تھا کہ ہوں گے کوئی۔ مگر ادبی شعور کے ساتھ ہی ساتھ اس ملاقات کا نقش گہرا ہوتا گیا جو بدستور تہبند باندھے نہایت بے تکلفی کے ساتھ کچھ درویشانہ شان لیے ہوئے تشریف لائے تھے۔ خود ہی فرمایا'' بھئی میں ہوں آغا حشر اور تم ہو شوکت آؤ ہاتھ ملاؤ۔ اور یہاں سے فارغ ہو کر میرے ساتھ چلو'' 4

آغا حشر کا خاکہ منٹو نے بھی لکھا تھا منٹو نے بھی لگ بھگ اسی طرح آغا سے اپنی پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کا ذکر کیا تھا۔

مولانا آسی سے شوکت تھانوی کی پہلی ملاقات ان کے دوست امین سلونوی صاحب نے کروائی تھی۔ مولانا آسی امین سلونوی کے استاد تھے۔ اس وقت وہ شطرنج کھیل رہے تھے۔ اور بڑے انہماک کے ساتھ ملے تھے۔ اور اس کے بعد رسمی گفتگو میں ابھرنے والے تاثر کا بیان بھی بڑے انوکھے پیرائے میں کیا ہے:

> ایک دن امین سلونوی صاحب نے باتوں ہی باتوں میں مشورہ دیا کہ تم شعر کہتے ہو تو کسی کے شاگرد ہو جاؤ۔ رائے تو مناسب تھی۔ مگر استاد بنانے کے لیے کوئی صاحب فوراً ذہن میں نہ آئے۔ امین صاحب نے اپنے استاد کا ذکر کیا ہم نے کہا کہ بس یہ ٹھیک ہے۔ اتنے بڑے ایڈیٹر کا استاد اگر ہمارا استاد بن گیا تو ہم کچھ فائدے ہی میں رہیں گے۔ امین صاحب کے ساتھ ان کے استاد کے یہاں پہنچے جہاں ایک ادھڑ عمر کے بزرگ ایک نہایت ضعیف العمر شخص سے بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ انتہائی انہماک کے ساتھ یعنی ایسا انہماک کہ بغیر چلم کا حقہ وہ ضعیف العمر صاحب مسلسل پی رہے تھے۔ شطرنج کی بازی کے بعد امین صاحب نے تعارف کی رسم ادا کی مولانا آپ میرے دوست شوکت تھانوی ساحب ہیں اور شوکت صاحب آپ میرے استاد مولانا عبدالباری آسی ہیں۔ دونوں طرف تبسم۔ دونوں طرف سے ''بڑی خوشی ہوئی'' والا رسمی جملہ۔ میں نے کہا ''میں برابر آپ کا کلام پڑھتا ہوں اور آپ کا ایک شعر میرے دل پر نقش ہے''۔ 5

شوکت تھانوی نے جن شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں۔ ان سے ان کے دیرانہ مراسم بھی رہے ہیں۔ اس طرح ملک حبیب احمد سے ان کے تعلقات بچپن ہی سے تھے۔ اتنے پرانے تعلقات کی وجہ سے بہت ہی یادیں ذہین سے محو ہو جاتی ہیں۔ اپنے انھیں تاثرات کا بیان وہ یوں کرتے ہیں:

> حبیب صاحب سے میرے مراسم کب سے شروع ہوئے یہ ایک داستان

ہے۔ جس کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم دونوں کے دودھ کے دانت نہ ٹوٹے تھے کہ بھوپال میں ہم دونوں آپس میں کبڈی کی قسم کا کوئی غیر منظّم کھیل کھیلا کرتے تھے جو نہ اب ان کو یاد ہے نہ مجھے''۔6

شوکت تھانوی کے اسلوب میں عجیب رعنائی ہے وہ موضوع خاکہ سے ہوئی اپنی پہلی ملاقات کا ذکر بڑے ہی دلچسپ اور شگفتہ اسلوب میں کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف پہلی ملاقات کا بیان کیا بلکہ شخصیت کے حلیے، صفات اور عادات و اطوار کا ذکر بھی بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے شخصیات کا حلیہ بیان کیا ہے وہاں مزاحیہ اسلوب سے کام لیا ہے۔ مثلاً اثر لکھنوی کے متعلق لکھتے وقت وہ ان کی شکل وصورت کے بیان کے علاوہ ان کی شرافت اور شرمیلا انداز اور بال اور مونچھوں کی تعریف بھی بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں مثلاً:

''میں اگر مصور ہوتا تو شرافت کی تصویر کسی نمائش میں بھیجنے کے لیے اثر صاحب کی تصویر بناتا۔ وہی ان کی شرمیلی سی تصویر، بڑھاپے میں اس بلا کی دوشیزگی میرے بھائی صاحب میں ہے کہ قربان ہوجانے کو دل چاہتا ہے باتیں کیجئے تو معلوم ہو کہ نسائی لب ولہجہ میں جو لوچ ہوتا ہے وہ نسائیت کی کوئی ذاتی چیز نہیں ہے نرم نرم الفاظ، میٹھی میٹھی آواز، لوچدار انداز بیان، جھکی جھکی آنکھیں اور ان سب پر سفید سفید مونچھیں مگر مجھے تو ان بے موقع مونچھوں پر بھی غصہ نہیں آتا۔ پیار ہی پیار آتا ہے۔ شکل وصورت شریفوں جیسی کسی رذیل سے بات کریں تو وہ بھی شریف ہوجاتے جامہ زیب واقع ہوئے ہیں''۔7

شوکت تھانوی کرشن چندر کے بارے میں پہلے ہی سن چکے تھے مگر دیکھا نہیں تھا۔ جب دیکھا تو انھیں تعجب ہوا کہ یہ کرشن چندر ہیں۔ کیونکہ شوکت تھانوی کے تصور میں کرشن چندر کی الگ تصویر تھی مگر کرشن چندر اس تصویر سے ایک دم مختلف نکلے۔ کرشن چندر حقیقت میں ایک پستہ قد، اور خاموش آدمی تھے۔ صورت پر داڑھی اور مونچھ کا نام ونشان نہیں لحاظہ کرشن چندر کے حلیہ کا ذکر کرتے

ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جب ریڈیو کے افسران اعلیٰ نے آپ کا تبادلہ لکھنو کیا اور آپ لکھنو تشریف لائے اور صورت دیکھی تو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ یہی وہ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر ہوسکتا ہے۔ جس کو کم سے کم مولانا شوکت علی کے ڈیل ڈول، مالوی کے رکھ رکھاؤ اور کچھ نہیں تو نانا فریس کی عمر کا آدمی ہونا چاہئے تھا۔ مگر یہ تو ایک پستہ قد، خاموش خاموش سا جوان العمر کالج سے تازہ وارد قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاڑھی مونچھ صاف۔ مگر داڑھی روز بنتی ہے اور مونچھ ہفتہ وار بلکہ اگر دونوں ہفتہ وار ہو جائیں تو بھی کوئی ہرج نہیں''۔ 8

کرشن چندر کم عمری ہی میں شہرت حاصل کر چکے تھے ان کی عظمت کے لحاظ سے کہنیا لا کپور انھیں بزرگ شخص تصور کرتے تھے اس کے علاوہ ہر ادیب کا حلیہ قاری کے ذہن میں مختلف ہوتا ہے، جتنی عظیم شخصیت ہوگی اتنا وجیہہ وضع قطع ہمارے خیالوں میں ابھرنے لگتا ہے۔ غالبًا یہی وجہ رہی ہوگی کہ کرشن چندر کنھیا لال کپور کے تصور سے مختلف نکلے۔ غالبًا اسی لئے عظیم بیگ چغتائی اتنے کمزور اور دبلے پتلے تھے کہ ان کا نام ان پر صادق نہیں آتا تھا۔ شوکت تھانوی نے ان کے حلیہ کا بیان کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

''نام تو عظیم بیگ چغتائی تھا۔ مگر اس قدر کمزور اور دبلے پتلے تھے کہ یہ نام پھبتی معلوم ہوتا تھا مرنے والے میں زندگی اس بلا کی تھی کہ موت کا گمان بھی نہ ہوتا تھا''۔ 9

خاکہ نگار کے لئے حقیقت نگاری ضروری ہوتی ہے کیوں کہ موضوع خاکہ کی سچی تصویر قاری کی نظروں میں گھوم سکے چنانچہ مولوی عبدالحق کے حلیے کا بیان کرتے وقت شوکت تھانوی نے ان کی حد سے زیادہ سفید داڑھی کو دودھ کی سفیدی کی مناسبت سے تشبیہہ دیتے ہوئے تعریف کی ہے۔ ان کے حلیے کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے خاص محبوں میں سے ایک ہیں ان کی دودھ سے زیادہ سفیدی گھنی ڈاڑھی آنکھوں میں رچی ہوئی ہے۔عمر کافی ہے۔مگر ابھی تک 'کرارے' ہیں۔ممکن ہے یہ خصوصیت 'ہاپوڑ' کے ہونے کی وجہ سے ہو۔بہر حال ہاپوڑ کی دو ہی چیزیں اب تک مشہور ہوئی ہیں۔ پاپڑ اور مولانا عبد الحق''۔10؎

سبط حسین کے حلیے کا بیان شوکت تھانوی نے انوکھی تشبیہات کے ذریعے کیا ہے۔ان کی نزاکت،حسن اور حوصلے کی ستائش عمدہ تشبیہات کے ذریعہ یوں کرتے ہیں:

''سبط حسن لکھنو کی ککڑیوں کی طرح نازک،کوکا بیلی کے باسی پھول کی طرح حسین اور تکلیفیں اٹھانے میں آہنی قسم کے مضبوط انسان ہیں''۔11؎

حلیے کا بیان ایسا ہو کہ شخصیت کی تصویر نظروں میں اتر جائے۔رحم علی الہاشمی کے حلیے کا بیان شوکت تھانوی نے اتنے دلچسپ انداز میں کیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بذات خود ہمارے سامنے موجود ہیں مثلاً لکھتے ہیں:

'' چھوٹی چھوٹی مونچھیں ہیں، جو لبوں پر چھپر کی طرح چھائی رہتی ہیں اور آپ کا ایک ہاتھ ان کو سنوارنے اور بگاڑنے میں مصروف رہتا ہے۔ترکی ٹوپی، شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور ڈوری دار جوتا پہن کر آپ ہر وقت ہنستے رہتے ہیں''۔12؎

منشی دیانارائن بہت دبلے پتلے تھے۔ان کے دبلے پن کو شوکت تھانوی نے مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے لحاظہ وہ لکھتے ہیں:

''دھان پان سینک سلائی قسم کے باوضع آدمی تھے۔ چوڑی دار پاجامے اور شیروانی میں بھی اتنے دبلے نظر آتے تھے کہ لباس کے اوپر سے ایک ایک پسلی گنی جا سکتی تھی''۔ 13؎

شوکت تھانوی نے حسرت موہانی کے حلیے کو بلا کسی جھجھک اور ہچکچاہٹ کے سچائی اور ایمانداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔حسرت موہانی اتنے بڑے شاعر، اور سیاسی لیڈر ہونے کے باوجود معمولی شکل و صورت کے آدمی تھے۔شوکت تھانوی نے ان کے حلیے کے بیان میں کسی طرح کی عقیدت سے کام نہیں لیا بلکہ غیر جانبداری سے کام لیا ہے لحاظہ وہ لکھتے ہیں:

''اُجاڑسی صورت، عینک میں ایک طرف دھجی بندھی ہوئی میلی سی ترکی ٹوپی اٹنگا سا چارخانہ کا پاجامہ، ڈھیلی ڈھالی اچکن، پیروں میں میلا سا کرچ کا جوتا چیں چیں کرتی ہوئی آواز اور عجیب بھدا سا نقشہ، ثاقب کانپوری نے تعارف کرایا کہ آپ مولانا حسرت موہانی ہیں، میں تو سکتہ کے عالم میں رہ گیا۔ یا اللہ ایسے ہوتے ہیں حسرت موہانی''۔ 14

غیر جانبداری اور حقیقت پسندی ان کے ہر خاکے میں ملتی ہے۔منشی پیارے لال شاکر میرٹھی، شوکت تھانوی کے بھائی کے دوست تھے۔ان کے حلیے کا بیان بھی بڑی حقیقت پسندی سے کیا ہے۔ان کا انداز بیان دلکش اور انوکھا ہوتا ہے۔مثال دیکھئے:

''بھائی جان کے دوستوں میں ایک صاحب تھے اسماً ہندو مذہباً عیسائی، تخلیصاً مسلمان، اور صورتاً کچھ بھی نہیں محض انسان۔ یہ تھے منشی پیارے لال شاکر میرٹھی''۔ 15

شوکت تھانوی مزاح کے بادشاہ معلوم ہوتے ہیں بات بات میں مزاح کا لطف ان کی تحریروں کا خاصہ ہے۔انھوں نے اپنے خاکوں کو بھی اپنی مزاح نگاری سے لطیف اور دلچسپ بنادیا ہے۔ جب اصغر گونڈوی سے ملاقات ہوئی تو اصغر کی شخصیت اور عظمت سے وہ مرعوب تھے لیکن ان کے تخلص کے ساتھ گونڈوی کا لاحقہ انھیں پسند نہ آیا۔ چنانچہ اس کا اظہار بھی انھوں نے ان کی حلیہ نگاری کے سلسلے میں کردیا۔مثلاً لکھتے ہیں:

''روز نامہ ہمدم میں عملہ ادارت کے ایک رکن قاضی محمد حامد صاحب حسرت بھی تھے۔ آدمی بااخلاق تھے۔یعنی اکثر دعوتیں کیا کرتے ایک مرتبہ آپ کے یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، روشن روشن صاف صاف ، نکھرے نکھرے ادھیڑ عمر کے وجیہہ آدمی خوب صورت فرنچ کٹ داڑھی ،سر پر پٹے ، ہنستی ہوئی آنکھیں ، اور دل کی سچائی چہرہ پر متبسم معلوم ہوا کہ آپ ہیں، اصغر گونڈوی ، اصغر تک تو خیر غنیمت تھا۔مگر یہ گونڈوی کیا بلا ہے۔ ایسے سنجیدہ آدمی کے نام کا ایک جز گونڈوی کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا''۔ 16؎

مولانا آسی کا لباس پر اکثر دھیان نہ رہتا تھا۔ ان کی شخصیت کی اس خصوصیت پر شوکت تھانوی نے لکھا ہے۔ کیونکہ مولانا آسی کی شخصیت میں یہ بات انھیں عجیب معلوم ہوتی کہ وہ ان کی شیروانی میلی ہوتی ہے تو یہ سوچ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کا پاجامہ تو اُجلا ہے۔شادی سے پہلے اور بچوں کے ہونے تک تو انھوں نے اپنے لباس کا تھوڑا بہت خیال رکھا تھا۔مگر جب سے وہ صاحب اولاد ہوئے ہیں تب سے تو بالکل لاپرواہ ہوگئے تھے۔ان کے اسی عیب پر نگاہ ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''فطرت ایسی ٹھس پائی ہے کہ عجیب بےخودی کا عالم طاری رہتا ہے شیروانی میلی ہے تو خوش ہیں کہ پاجامہ تو اجلا ہے پاجامہ میلا ہے تو دل مطمئن ہے کہ قمیص بالکل صاف ہے خط بڑھا ہوا ہے تو اطمینان یہ حاصل ہے کہ خضاب کا رنگ تو قائم ہے شوق ہے شطرنج کا اور قلمی کتابوں کا۔۔۔۔ بفضلہ صاحب اولاد بھی ہیں پہلے تو کہیں نہ کہیں جانے کی وجہ سے لباس کی طرف ایک آدھ دیدہ نظر ہو بھی جاتی تھی۔مگر اب تو بال بچوں میں ویسے بھی کپڑے میلے ہوتے ہی ہیں''۔17؎

ساغر نظامی کے حلیے کا بیان بھی بڑے دلکش اسلوب کے ساتھ کیا ہے کہ لطف آتا ہے۔ وہ عام طور پر شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔مگر ضرورت پڑنے پر وہ سوٹ بھی پہن لیتے تھے۔شوکت تھانوی ان کے لباس کے بارے میں استعاراتی انداز میں لکھتے ہیں:

''طبعاً نیشلسٹ اور وضع قطع میں پیرس کا دھلا ہوا کھدّ رواضح ہوئے ہیں۔
بوقتِ ضرورت سوٹ بھی پہن لیتے ہیں ورنہ عام طور پر شیروانی اور چوڑی دار
پاجامہ میں نظر آتے ہیں اور سچ پوچھئے تو ان کی رعنائیاں اسی لباس میں شباب پر
آتی ہیں۔ پہلے بال بہت خوبصورت تھے۔ اب بال دار ٹوپی میں خوبصورت
معلوم ہوتے ہیں''۔ 18؎

فراق گورکھپوری کے بات کرنے کا انداز انوکھا تھا وہ اس طرح ہے کہ وہ اپنی آنکھیں نکال نکال کر اور گردن منہ مٹکا مٹکا کر باتیں کرتے تھے، اور وہ بہت برا پڑھتے تھے۔ شوکت تھانوی نے فراق گورکھپوری کے اس انداز پر مزاحیہ لہجے میں یوں روشنی ڈالی ہے:

''فراق سے جب کبھی اس قسم کا وصل حاصل ہوا، اس وقت ان کی بے تکلف
باتوں کا لطف آتا ہے آنکھین نکال نکال کر، ہاتھ اور گردن منہ مٹکا مٹکا کر اور زبان
کو اینٹھا اینٹھا کر ہر لفظ پر ایسا زور دیں گے کہ یہ سمجھنا دشوار ہوجائے گا کہ اس
میں سے کون سا لفظ اہم ہے''۔ 19؎

خواجہ مسعود علی ذوقی کے شعر پڑھنے کا انداز دیگر شعرا سے مختلف تھا۔ ان کے اس انداز کا بیان بھی دلچسپ انداز میں انوکھی تشبیہہ کے ذیعہ کیا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

''شعر اس طرح پڑھتے ہیں گویا عدالت میں جرح کررہے ہیں۔ چہرہ پر ترنم
برستا ہے۔ مگر منہ سے نہیں چھوڑتا''۔ 20؎

دیوانہ گورکھپوری کی ذہانت بلا کی تھی۔ سب ان سے متاثر تھے۔ شوکت تھانوی بھی ان کے ٹھوس معلومات کے معترف تھے۔ اس لیے ان کے حلیے اور شخصیت کا بیان کرتے ہوئے انھیں ان کی ذہانت کی وجہ سے انسائیکلوپیڈیا کا پاکٹ ایڈیشن قرار دیا ہے اپنے انوکھے انداز میں لکھتے ہیں:

''اب دیوانہ صاحب سے گفتگو شروع ہوئی بے پروائی حیرت، حیرت
مسرت میں، مسرت محبت میں اور محبت عظمت میں گم ہوکر رہ گئی اللہ اکبر، اس قدر

مختصر سے جسم میں اس بلا کی ہمہ گیر ذہانت، صرف ذہانت ہی نہیں ٹھوس معلومات تھوڑی دیر تک تو معلوم ہوا کہ آدمی سے باتیں کر رہے ہیں۔ پھر محویت اتنی بڑھی کہ سمجھ بیٹھے کہ انسائیکلو پیڈیا کے کسی پاکیٹ ایڈیشن کا مطالعہ کر رہے، جس موضوع پر گفتگو کیجئے دیوانہ صاحب کوئی دور کی کوڑی ضرور لائیں گے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اپنی بساط کے مطابق ڈنڈا کندھے پر پڑا ہوا کمبل اور دماغ میں علوم وفنون کے خزانے جن کو زبان لاتی چلی جاتی ہے''۔21؎

شوکت تھانوی کا انداز بڑا لطیف اور دلچسپ ہوتا ہے۔ بات بات میں ایسی بات کر جاتے ہیں کہ ان کی ہر بات مزہ دے جاتی ہے۔ خصوصاً جن شخصیات کا حلیہ بیان کیا ہے ان کی جیتی جاگتی اور سچی تصویر پیش کردی۔ غیر جانبداری ان کی تحریر کی خوبی ہے۔ اپنی معلومات کا بڑے لطیف اور شگفتہ انداز میں بلا کسی مرعوبیت کے اظہار کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مزاح کا لطف تحریر کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ مثلاً حافظ محمد سالم ادبی گفتگو بہت کم کرتے تھے۔ ان کا بات کرنے کا انداز اس طرح سے ہوتا تھا کہ تفصیلی سوال کا جواب وہ مختصراً انداز میں دیتے تھے بات کرتے وقت ان کے چہرے پر گھبراہٹ ان کی گفتگو کے اس انداز کو ایسے مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری کو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''ادبی گفتگو بہت کم کرتے ہیں مفصل خط والی زبان میں گفتگو کیجئے تو تار والی زبان میں جواب دیتے ہیں اور چہرہ پر ایسی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ گویا گفتگو کرنے والے کے لئے دل سے دعائیں کر رہے ہیں کہ یا تو یہ مرجائے اسی وقت یا اس کی زبان پر فالج گرے تا کہ کسی طرح گفتگو تو ختم ہو''۔22؎

غرض حلیہ نگاری، لباس ہو یا وضع وقطع کا بیان ہو یا پھر شخصیت کی انداز گفتگو کا بیان وہ ہر جگہ اپنے لطیف، انوکھے اور دلچسپ انداز بیان کی وجہ سے قاری کو اپنی تحریر کو پورا پڑھے بغیر نہیں چھوڑتے ہیں یہی ان کی تحریر کا خاص وصف ہے۔

حلیہ نگاری، لباس، وضع وقطع اور انداز گفتگو کے علاوہ شوکت تھانوی نے اپنے خاکوں میں شخصیات کی عادات واطوار کا بیان بھی دلچسپ اسلوب کے ساتھ کیا ہے۔انھوں نے اپنے بڑے بھائی ارشد تھانوی کے عادت کا ذکر بھی مزاحیہ انداز میں کیا ہے۔مثلا اردش تھانوی کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔اگر وہ کتاب پڑتے وقت کوئی دلچسپ بات ان کے سامنے آجاتی ہے تو وہ اپنی بیگم کو ضرور سناتے تھے۔ان کی کتب بینی کے اس ذوق کا ذکر کرتے ہوئے شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> ''کتب بینی کا بے حد ذوق ہے۔کتاب پڑھتے پڑھتے ایک دم بستر سے اچھل کر باورچی خانے میں پہنچ جاتے ہیں اور بیگم کے سر پر سوار کہ'سن بیگم لاحول ولاقوۃ ذرا سن لوتو۔کس قدر لا جواب بات ظالم نے لکھ دی ہے۔پتیلی چھن من کر ہی ہے۔آپ بیگم کو سنا رہے ہیں''۔23؎

جالب دہلوی کو بھی کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔وہ کتابوں کو اکٹھا کرنے کے لئے ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوجاتے تھے۔اور پرانی کتابوں کو اکٹھا کرنے کے لیے ہر اتوار کو کباڑی کی دکان پر جاتے تھے۔اور کتابوں کے مطالعے میں اس طرح منہمک ہوجاتے تھے ان کو کوئی بھی چیز الگ نہیں کرسکتی تھی ان کی کتب بینی کے علاوہ ان کی دوسری ذوق کا ذکر بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

> ''میر صاحب کو شوق صرف دو تھے۔افیون اور کتابیں،افیون کھانے کو رندی کہتے تھے اور جہاں تک ہوتا تھا اس کھلی ہوئی حقیقت کو راز رکھنے کی کوشش کرتے تھے کتابیں جمع کرنے کے سلسلے میں ہر تکلیف گوارا تھی اتوار کے دن نخاس میں لب سڑک کسی کباڑیئے کی دکان پر بیٹھے ہوئے ہیں اور پرانی کتابوں میں دیمک کی طرح لگے ہیں کیا مجال کہ پھر کوئی ہنگامہ ان کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔مقرر بھی بہت اچھے تھے کاش تقریر کرنے میں کبھی کبھی سانس لے لیا کرتے۔
>
> کھانے کے شوقین تھے اور فطرتاً میٹھی چیزوں سے خاص رغبت تھی۔دعوتوں

میں جہاں تک ہوتا تھا خود ہی جاتے تھے اسٹاف کے کسی اور رکن کو تکلیف دینا
پسند نہ کرتے تھے''۔24ے

جگر مرادآبادی کو کثرت شراب کا شوق تھا شراب کے بغیر وہ بے چین ہو جاتے تھے۔ایک دن لکھنو میں شوکت تھانوی کے گھر پر آئے ساتھ میں شراب بھی لائے تھے اور ان سے پینے کی اجازت مانگ رہے تھے مگر شوکت تھانوی نے انکار کر دیا تو ان کی خفگی کے ڈر سے خاموش ہو گئے۔لیکن ان کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ان کی اس خصوصیت کی عکاسی اس عمدگی سے کی ہے کہ سارا واقعہ نظروں میں گھوم جاتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''سرمستی کے عالم میں بھی مجھ کو اپنے سے خفا نہ ہونے دیا لکھنو میں ہیں خوب پیئے ہوئے میرے یہاں آ گئے تقاضہ ہے اور پیئں گے ساتھ میں شراب بھی ہے۔یہ مطلب نہیں کہ منگا دو صرف اجازت طلب کی جارہی ہے منع کر دیا۔ہنس دیئے پھر تقاضا شروع ہوا ڈانٹ دیا۔زبردستی کی اور بوتل غائب کر دی اب تلملا رہے ہیں بے چین ہیں مگر ڈر بھی رہے ہیں کہ شوکت خفا ہو جائے گا یہاں تک کہ بہانے کر کے بھاگنا چاہا اس میں بھی کامیاب نہ ہوئے تو جھوم جھوم کر غزلیں سنانے لگے''۔ 25ے

خواجہ حسن نظامی کو پان کھانے کا بہت شوق تھا۔وہ پان کی ڈبیا ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے،وہ بھی کھاتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔شوکت تھانوی نے ان کے اس شوق کو ایک واقعہ کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے:

''کھانے کی چیز پر باقاعدہ تعارف کی رسم بشیر احمد علوی نے ادا کی۔خواجہ صاحب بہت محبت سے ملے اپنی ریلوے ٹرین نما پانوں کی ڈبیا سے پان نکال کر دیا۔دیر تک دلچسپ گفتگو فرماتے رہے اور پھر وہیں جا کر روزنامچے میں وہ تمام گفتگو درج کر دی۔

دوسری مرتبہ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ملا، پھر اسی قابل دست اندازی پولیس ڈبیا سے پان کھلایا"۔ 26ے

صفدر مرزا پوری کو کھانے کا بہت شوق تھا اور یہی ان کی کمزوری بھی تھی۔ سب لوگ ان کو کھلاتے بھی زیادہ تھے۔ ایک مرتبہ وصل بلگرامی نے اتنا کھلایا کہ وہ دن بھر کھاتے رہے اور وہ شام تک بیمار ہو گئے اسی واقعہ کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے:

"کھانا ان کی کمزوری تھا لوگ ان کو کھلاتے تھے۔ بے حد بے حساب کھلاتے تھے اور وہ کھائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو وصل بلگرامی مرحوم نے ان کو اس حد تک دن بھر کھلایا کہ شام ہوتے ہوتے کالرہ میں مبتلا ہو گئے اور اس ایک دن کے کھانے کے بدلے ایک ہفتہ تک مسلسل فاقہ کرنا پڑا"۔ 27ے

شوکت تھانوی نے موضوع خاکہ کی شخصیت کی اس عادت کا بیان دلچسپ اسلوب کے ذریعہ کیا ہے۔ اس ایک اقتباس میں تشبیہہ کا حسن بھی ہے، محاوروں کا لطف بھی ہے، صفت تکرار، تضاد، اور الفاظ کی الٹ پھیر سے معنی ومفہوم کی ادائیگی کا حسن بھی غرض انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیات کی عادات واطوار اور ان کی پسند ناپسند اور ذوق وشوق کا بیان فنی چابکدستی اور مزاحیہ ولطیف اسلوب کے ذریعہ کیا ہے کہ قاری موضوع خاکہ کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پایا۔

شوکت تھانوی نے اپنے خاکوں میں شخصیت کی عکاسی میں غیر جانبداری کو ملحوظ رکھا ہے۔ وہ کسی بھی شاعر ہو یا ادیب پر ان کی شخصیت و کردار کی جملہ خصوصیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر چہ کہ ان کے خاکے معروف شخصیتوں پر ہو یا غیر معروف ان کی خوبیاں اور خامیاں ان کی نگاہوں سے نہیں بچ پائی۔ شوکت تھانوی نے جہاں پر دوسروں کی شخصیت کی عکاسی کی ہے وہیں خود اپنا بھی خاکہ لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے خاکے میں خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''بچو! خدا کے لئے ان کو سمجھاؤ کہ یہ ترنم سے کلام سنانا چھوڑ دیں اور اگر شاعری ہی ترک کر دیں تو تم سب مل کر جشن مناؤ یہ بہت برسے آواز ہیں مگر شعر سنانے سے باز نہیں آتے۔ دعا کرو ان کی آواز خود ان کے کان میں بھی پہنچ جایا کرے بلکہ اگر صرف ان ہی کے کان میں پہنچا کرے تو بہت اچھا ہے''۔28

مجنوں گورکھپوری ایک منہ پھٹ انسان ہیں وہ ایک شعر سن کر داد دیتے ہیں تو دوسرا شعر سن کر مہمل بھی کہہ دیتے ہیں ان کی اس خصوصیت کو غیر جانبداری سے پیش کرتے ہوئے شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

''وہ شعر کہتے اور خطرناک حد تک سمجھتے ہیں گویا شعر و شاعری کے معاملہ میں سمجھدار اور خطرناک مجموعہ بن کر 'سمجھناک' ہو گئے ہیں۔ پھر طرۂ یہ کہ منہ پھٹ بھی غضب کے ہیں آپ کا ایک شعر سن کر داد دیں گے تو دوسرا شعر سن کر 'مہمل' بھی اس صفائی سے کہہ دیں گے کہ آپ منہ دیکھ کر رہ جائیں۔ کسی سے مرعوب ہونا تو جانتے ہی نہیں۔ البتہ اس آدھی چھٹانک کے آدمی سے بڑے بڑے پہاڑوں کو مرعوب ہوتے ہم نے خود دیکھا ہے''۔29

کتنی خوبصورتی سے مجنوں کی شخصیت کی صاف گوئی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی شخصیت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

تاجور نجیب آبادی بہت موٹے آدمی تھے۔ وہ سوتے وقت خراٹے لیتے تھے۔ ان کے خراٹے کی عادت کا ذکر شوکت تھانوی نے مزاحیہ انداز میں کیا ہے:

''نہایت بھاری بھرکم شاعر ہیں کلام بھی ٹھوس اور خود بھی تحت اللفاظ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ہانپتے جاتے ہیں۔ دوسری مرتبہ جب آپ سے ملنے گیا تو باہر ہی سے بھاگ آیا۔ کمرہ سے نہایت خوفناک آوازیں آرہی تھیں بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا سو رہے تھے اور یہ آوازیں خراٹوں کی تھیں''۔30

شوکت تھانوی نے شخصیت کی خامیوں کے بیان میں حقیقت پسندی سے کام یا ہے۔آنند نارائن ملا کی آواز شیریں نہیں تھی۔انھوں نے ان کی آواز کی خامی کو ایک تشبیہ کے ذریعے بڑے دلچسپ نداز میں سمجھانے کی کوشش کی کہ مزاح کا لطف پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

''وہ خوش گلو نہیں بلکہ بدنام پڑھنے والوں میں سے ہیں جس طرح بچوں کا ایک کھلونا ہوتا ہے جسے کوا کہتے ہیں۔چھوٹے سے تاشے میں گھوڑے کی دم کا ایک بال باندھ کر بچے اسے چاروں طرف گھماتے ہیں اور اس میں سے ایک دماغ پاش آواز آتی ہے 'غین غین غین' ملا صاحب پڑھتے اسی طرح ہیں مگر کہتے ہیں ایسا کہ کانوں کے علاوہ دل اور دماغ کی سماعتیں بھی بیدار ہو جاتی ہیں'' 31

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی شخصیتوں کے مرتبے سے مرعوب ہوئے بغیر ان کی عادات واطوار اور کمیوں اور خامیوں کی طرف غیر جانبدری سے اشارے کئے ہیں۔ انداز بیان دلچسپ اور پر مزاح ہے۔

شوکت تھانوی کے خاکوں کا اسلوب مزاحیہ ہے وہ جس طرح اپنی مزاح نگاری میں پر لطف اسلوب اختیار کیا وہی انداز ان کے خاکوں میں بھی ملتا ہے۔انھیں کسی بھی شخصیت کے شخصی پہلوؤں کو بیان کرنے کے لئے کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، بلکہ کسی بھی شخصیت سے متاثر ہونے کے بعد ہی خاکے تحریر کرتے ہیں۔شگفتہ بیانی، تازگی، دلکشی، روانی، برجستگی اور تشبیہات، استعارات ومحاوروں کے حسن سے اپنے اسلوب کو دلکش بنا کر پیش کرتے ہیں۔مولانا عبدالماجد دریابادی کے وہ بے حد متاثر تھے ۔الفاظ کے ہیر پھیر کے ذریعہ ان کی شخصیت کے عکاسی بڑے دلکش اسلوب کے ساتھ یوں کرتے ہیں:

''مولانا کی زندگی بھی عجیب معمہ ہے۔دیکھئے تو زاہد خشک۔پڑھیے تو ایک سرشار ادیب، مفہوم ٹھوس، عبارت رنگین، الفاظ سنجیدہ، بندشیں، ہنستی کھیلتی ہوئی لکھتے ہیں۔کرتے ہیں نثر میں شاعری لکھیں گے بڑی سے بری بات اور خط ہوگا

وہ جس سے چاول پر قل ہو اللہ لکھی جاتی ہے۔ خود عینک لگاتے اور اپنی تحریر سے
دوسروں کی آنکھیں پھوڑتے ہیں۔ مولانا محمد علی، اکبر الہ آبادی، مرزا رسوا اور
اقبال سے بے حد متاثر ہیں اور خود خدا جانے کتنوں کو متاثر کر چکے ہیں۔ ان میں
سے ایک یہ راقم بھی ہیں''۔32؎

عبدالماجد دریابادی کے علمی و ادبی کارناموں کو چند الفاظ کے ذریعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ان کی پوری شخصیت سامنے آ جائے گی۔ شوکت تھانوی کو الفاظ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، برجستگی کا یہ عالم ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ خود بخود ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی سنجید، کم گو مگر توانا شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کے لیے سمندر کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ جو بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی خاموشی سے معروف خدمت ہے۔ ان کی اس شخصیت کا بیان مزاحیہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

''مختصر یہ کہ شاہد احمد صاحب بحیثیت مجموعی عجیب چہل پہل کے آدمی ہیں مگر
ملیے تو نہایت خاموش، نہایت کم سخن اور کبھی کبھی خالص تاجر۔ لیکن سطح کے اس
سکون کے نیچے یہ سمندر طوفانی ہے جس میں خود بھی ڈوبے ہوئے ہیں اور جس کو
چاہیں ڈبو بھی سکتے ہیں''۔33؎

احسان دانش کی شخصیت کی عکاسی الفاظ کی الٹ پھیر سے کس خوبصورتی سے کی ہے ملاحظہ فرمایئے:

''احسان مزدوری اور مزدور کو اپنی شاعری کا محض موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ
مزدوری اس شاعری کو خود اپنا موضوع پہلے ہی بنا چکی ہے۔ ٹوکریاں ڈھونے کے
بعد اب دواوین ڈھو رہے ہیں۔ سر پر پہلے بوجھ رہا کرتے تھے۔ اب سر تو خالی
ہے مگر دماغ میں سوائے سخن آواز اچھی ہے اور ترنم میں کہیں کہیں پردہ ٹیس نمایاں
ہو جاتی ہے''۔34؎

خلیل احمد کی شخصیت کی عکاسی بھی بڑے پرلطف اور مزاحیہ انداز میں کی ہے کہ قاری شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''ان کی عجیب وغریب شخصیت کا اندازہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوا۔ مثلاً ان کا کوئی کوئی خط آیا۔ لفافہ پر ''برکار سرکار'' کی طرح لکھا ہوتا ہے۔ بکارا حکم لحاکمین خداوند تعالیٰ'' سمجھے کہ موت کا پروانہ آ گیا ہے۔ مگر ہوتا تھا وہ دعوت کا رقعہ یا چندے کا بل۔ آپ کے دفتر میں جہاں چھوٹے بڑے بہت سے سائن بورڈ ہیں وہاں پاخانہ پر بھی ایک سائن بورڈ لگا ہے۔ ''صحت خانہ'' لوگ اسپتال سمجھ کر جاتے ہیں۔ مگر حاجت پوری ہو جاتی ہے''۔ 35

دیوانہ بریلوی میں تضاد کا بیان بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''خاموش، لطیفہ گو، سنجیدہ، مضحک، سرمایہ دار غریب، نازک انداز پٹھان۔ مختصر یہ کہ آپ اسی قسم کی متضاد کیفیات کا مجموعہ واقع ہوئے ہیں اور یہی تضاد آپ کی کامیاب ناکامیوں کا راز ہے''۔ 36

شوکت تھانوی نے اگرچہ بہت زیادہ خاکے نہیں لکھے ہیں۔ مگر انھوں نے جو خاکے لکھے ہیں ان میں شخصیت کے تمام پہلوؤں کو چند جملوں میں محاوروں، تشبیہات اور تلمیحات کے ذریعہ سے اس عمدگی سے پیش کیا ہے کہ قاری ان کے اسلوب کی شگفتگی سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ الفاظ کی الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کے ہیر پھیر سے مزاح پیدا کرنے کے جتنے پیرائے ہوتے ہیں وہ سب ان کے پاس موجود ہیں یہ خصوصیت ان کے خاکوں میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ چنانچہ وہ امتیاز علی تاج کی شخصیت کی عکاسی کرتے وقت الفاظ کی الٹ پھر سے کس طرح مزاح پیدا کیا ملاحظہ کیجیے:

''بچو! یہ ثناء اللہ بن کر پیدا ہوئے اور میرا جی بن کر مرے۔ اب ان کو مرنے کے بعد زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور جب یہ زندہ تھے تو ان کے

دوست ان کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ہمارے دیس میں کوئی شخص بغیر مرے قابل قدر نہیں بن سکتا ہے''۔ 37؎

شوکت تھانوی نے اپنے خاکوں میں شخصیتوں کی خصوصیات کے بیان کرنے کے لیے تلمیحات کا بھی عمدہ استعمال کیا ہے۔ روشن صدیقی کے نظم نگاری کے متعلق مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

''نظم کے علمبرداروں میں اس طرح شامل ہیں جس طرح راجہ پورس کی فوج میں ہاتھی شامل تھے۔ یعنی بوقتِ ضرورت غزل بھی اسی طرح پڑھ دیتے ہیں کہ نظم کی تمام علمبرداری سرنگوں ہوکر رہ جاتی ہے''۔ 38؎

پہلی بار اثر لکھنوی سے ایک مشاعرے میں شاعر کی حیثیت سے ملاقات ہوئی۔ بعد میں پتہ چلا وہ ان کے بھائی ہیں۔ اثر لکھنوی کے کلام سنانے کی عادت کا ذکر بھی بڑے مزاحیہ انداز میں کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''ایک مشاعرے میں شاعر کی حیثیت سے مگر جب گھر پر ملنے آئے تو والد صاحب مرحوم نے کہا کہ ان کو بھائی صاحب کہا کرو یہ تمہارے بھائی ہیں۔ یعنی میرے بھتیجے۔ گویا مرکھپ کے ایک دوست ڈھونڈا اس کو بھی قسمت نے بھائی بنادیا ہے۔

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

مگر میرے بھائی صاحب اثر یوسف کے بھائیوں کی طرح نہیں ہیں۔ ڈبوتا تو کیا معنی یہ تو مجھ کو اگر ڈوبا ہوا دیکھ لیں تو شاید خود بھی کنویں میں پھاند کر اپنی کچھ تازہ غزلیں سنانا شروع کردیں۔ قوام لگا لگا کر اسی کنوئیں میں پان کھلائیں گے اور کلام سناتے رہیں گے چائے کا وقت آجائے گا تو وہیں سے پکاریں گے ''فیاض''۔ 39؎

اس اقتباس میں صفت تلمیح کا بھی استعمال ہوا ہے شعر کے حوالے سے۔

شوکت تھانوی نے کرشن چندر کی شخصیت کے بعض نمایاں پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ان کی انسانیت کو بچوں کی معصومیت سے اور ان کی شرافت کو فرشتوں کی شرافت سے تشبیہ دے کر کرشن چندر کی شخصیت کی عکاسی اس عمدگی سے کی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

''کرشن چندر کی ادبی خصوصیات کسی تعارف سے بہت بلند و بالا ہیں۔البتہ بحیثیت ایک انسان کے وہ عجیب وغریب خصوصیات کا مجموعہ ہیں۔بچوں کی طرح معصوم،فرشتوں کی طرح شریف اور شریفوں کی طرح ہر وقت نادار،ریڈیو کی ملازمت اس ہندوستان کے طفیل ہے۔جو اپنے بڑے سے بڑے ادیب کو بھی فارغ البالی نہیں دے سکتا''۔ 40

مولانا ابن الحسن خوش فکر شاعر تھے اور وہ فطرت کے حساب سے نہایت بے فکر تھے۔ان کی شخصیت کے اس پہلو کو شوکت تھانوی نے ان کے تخلص کی مناسبت سے فکر کا لاحقہ بڑی فنی چابکدستی سے استعمال کیا ہے ساتھ ہی صنعت،تضاد،صنعت تکرار اور محاورے کا عمدہ استعمال کیا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

فکر صاحب ایک اہل فکر شاعر ہیں مگر فطرت نہایت بے فکری پائی ہے۔ورنہ وہ تو خدا جانے اور کیا کیا ہو سکتے تھے ایک کہنہ مشق اخبار نویس،ایک مشاق ادیب اور ایک خوش گو شاعر ہونے کے علاوہ بہت دلچسپ دوست بھی ہیں۔دفتر میں نہایت بے رنگ اور دفتر کے باہر نہایت رنگیں یار باش اور ہر محفل میں سج جانے والے انسان جرنلزم نے بہت سے زندہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور ان ہی میں سے ایک فکر بھی ہیں''۔ 41

شوکت تھانوی نے اپنے خاکوں میں ایک آدھ لطیفوں کا بھی استعمال کیا ہے۔انھوں نے خود اپنی کی ہوئی شرارت کو لطیفہ کے طور پر یوں پیش کیا ہے:

ایک مرتبہ بھائی جان اپنی تمام بزرگی سمیت بھوپال سے لکھنؤ تشریف لائے نہایت لیے دیئے رہے اور ہم بھی سمٹے سمٹائے سوکھے سہمے بنے جب آپ واپس جانے کے لیے لکھنؤ اسٹیشن پر تشریف لاکر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے اور ہم از راہِ سعادت برت پر بستر لگانے چلے آئے تو یکا یک دوستی کی تقریب سوجھی گئی۔ قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے پوچھا

''آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں''۔

''بھیلسہ''

''بہت ہی اچھا ہوا۔اب مجھے پورا اطمینان ہوگیا۔بات یہ ہے کہ یہ صاحب جو جارہے ہیں جن کا میں بستر بچھا رہا ہوں یوں تو خیر اب اچھے علاج سے بہتر فائدہ ہوا ہے مگر آپ پھر راستہ میں ذرا خیال رکھیے گا۔ایک تو کھڑکی کی طرف نہ آنے دیجیے گا۔دوسرے ذرا منہ ہٹا کر بات کیجیے گا۔شاید حملہ کر بیٹھیں''۔

''کیا مطلب۔یعنی کچھ''

''جی ہاں دماغ بالکل خراب ہوگیا تھا۔مگر اب فائدہ ہے پھر بھی احتیاط شرط ہے۔''

ٹرین روانہ ہوگئی۔وہ بھوپال چلے گئے اور ہم گھر آگئے۔بھوپال بھی گئے کہ کیا ہوا تھا۔پانچویں روز والد صاحب کے نام ایک لمبا چوڑا خط آیا وہ پڑھتے جاتے تھے اور ہنستے جاتے تھے۔آخر وہ ہم کو دیا گیا کہ ملاحظہ فرمایئے اپنے کرتوت، خط میں پوری تفصیل ایک افسانہ کی صورت میں درج تھی کہ کیوں کہ اس مسافر نے آپ کو اور آپ نے اس کو پاگل سمجھا۔یہاں تک کہ جب کانپور کے قریب آپ گنگا کا نظارہ کرنے کے لیے کھڑکی کے طرف بڑھے تو اس مسافر نے اس بری طرح سے ڈانٹا کے بھائی جان کی طبیعت ہی خوش ہوگئی مگر صبح ہونے پر جب اس مسافر نے صحیح الدماغی کا پورا یقین کرلیا تو سارا قصہ سنا دیا کہ کس طرح

آپ کے برادر عزیز نے یہ گل کھلایا تھا دوستی تو خیر یہیں سے دوگنی تھی مگر اس کے بعد متعدد مرتبہ شرارتوں کی ضرورت بے تکلفی پیدا کرنے کے لیے پیش آئی اور الحمدللہ کہ اب بھائی جان صرف بڑے بھائی نہیں ہیں بلکہ بے تکلف دوست بھی۔ پہلے شعر کہتے تھے۔اب بچے فرماتے ہیں''۔42؎

یہ اقتباس قدرے طویل ہوگیا ہے، لیکن پورا واقعہ پیش کرنے کے لئے ضروری تھا۔شوکت تھانوی اپنی شرارتوں کے واقعات کے ذریعہ بھی اپنے اسلوب کو پرلطف بنادیے ہیں۔

مولوی محمد صدیق لکھنو کے مشہور بک ڈپو دارالاشاعت کے مالک تھے۔شوکت تھانوی نے ان کے دکان کے متعلق لطیفہ گوئی سے کام لیتے ہیں۔محمد صدیق کی کتابیں فروخت کرنے کے طریقے اور تقریر کی صلاحیت کا ذکر وہ استعارے، محاورں کے عمدہ استعمال کے ذریعہ یوں کرتے ہیں:

''مولوی محمد صدیق صاحب کی جو لکھنو کے مشہور دار الاشاعت صدیق بک ڈپو کے مالک ہیں اور اپنی درہ خیبر نما دوکان میں کچھ بدوی انداز سے بیٹھے ہوئے اپنے کسی گاہک کو سمجھا رہے ہوں گے کہ 'میاں راہ نجات کیا کروگے خرید کر، راہ نجات تو اپنے دل کو ڈھونڈنے دو، اور اگر راہ فرار اختیار کرنا نہیں چاہتے تو کچھ کام کی کتابیں خریدو'۔گاہک ان کا منہ دیکھ رہا ہوگا اور وہ اس کا منہ دیکھنے بغیر مسلسل تقریر فرما رہے ہوں گے نئے رجحانات اور نئے تقاضوں کے موضوع پر''۔ 43؎

مولوی عبدالرحیم صاحب شوکت تھانوی کے سب سے پہلے فارسی کے استاد تھے۔یہ ان کے والد کے عزیز دوستوں میں سے بھی تھے۔ان کی شکل اتنی کالی تھی کہ ان کو دیکھ کر شوکت تھانوی بہت ڈرتے تھے۔چنانچہ شوکت تھانوی نے اپنے آپ کو الہٰ دین سے اور اپنے استاد کو الہٰ دین کے چراغ کے جن سے تشبیہہ دی ہے مثلاً وہ مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

''میں ان کے گھر پر فارسی پڑھنے جایا کرتا تھا۔نہایت بھیانک کالے کالے

جسم پر صرف غرقی باندھ کر کھری چارپائی پر بیٹھے پڑھایا کرتے تھے۔ وہ ڈانٹیں یا نہ ڈانٹیں مگر خوف ہر وقت طاری رہتا تھا۔ شروع شروع میں خواب میں نظر آتے رہے، مگر بعد میں کچھ عادت سی پڑ گئی تھی۔ جس طرح الہٰ دین اپنے چراغ والے موکلوں کا بعد میں عادی ہو گیا تھا''۔ 44

شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی لفظ کے عمدہ استعمال کے ذریعے سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً مرزا سے اپنے تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے بڑی عمدگی سے لفظ عزیز کا استعمال کر کے مزاح پیدا کیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب میرے عزیزوں کے عزیز بھی ہیں مگر وہ کسی کو اتنے عزیز نہ ہوں گے جتنے مجھے عزیز ہیں ویسے تو خیر وہ عبدالعزیز روڈ پر رہتے ہی ہیں، مگر دراصل وکسب کمال کر کے عزیز جہاں ہو چکے ہیں''۔ 45

شوکت تھانوی نے اپنے خاکوں میں نہ صرف مزاح نگاری سے کام لیا بلکہ طنز نگاری سے بھی کام لیا ہے، مثلاً پطرس بخاری سے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''بچو! آج کل پطرس لیک سکس میں رہتے ہیں جہاں اقوام متحدہ نے کشمیر کا اچار ڈالا ہے۔ اقوام متحدہ کے اس مذاق کو سمجھنے کے لیے پاکستان کا سب سے بڑا مزاح نگار وہاں بھیجا گیا ہے''۔ 46

کرشن چندر کی شخصیت کا بیان طنزیہ انداز، لفظوں کے الٹ پھیر سے بخوبی کیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''کرشن چندر کی شخصیت بعض حیثیتوں سے معمہ بھی ہے۔ مثلاً بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ شادی شدہ ہیں یا نہیں وہ ترقی پسند ادیب ہیں۔ یا محض ادیب یا محض ترقی یا محض پسند میرے خیال میں وہ جیسے بھی ادیب ہوں مگر پسندیدہ ادیب ہیں''۔ 47

شوکت تھانوی نے رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کے انگریزی میں لکھنے پر طنز کیا ہے، لیکن ان کا یہ طنز بھی بڑا شگفتہ اور پرلطف ہوتا ہے مثال دیکھئے:

''آپ نے اردو کی ایک مبسوط تاریخ لکھی ہے مگر انگریزی میں گویا کھچڑی تو تناول فرمائی ہے، مگر چُھری کانٹے سے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ آپ نے یہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، راستہ غلط سہی مگر منزل ضرور سر کی ہے''۔48

ان تمام اقتباسات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی نے جن شخصیات پر لکھا ہے انہیں کے خاکوں میں اپنے مزاحیہ اسلوب سے زندگی بخشی ہے۔ ان کے یہاں عمدہ فقروں، چست جملوں کے علاوہ تشبیہوں اور استعاروں، محاورات کے استعمال کے علاوہ لفظوں کے الٹ پھیر سے تحریر میں حسن پیدا کیا گیا ہے۔ غرض شوکت تھانوی نے اپنے خاکوں کے لئے اہم اور غیر اہم دونوں طرح کی شخصیات کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے مختصر خاکے تصنیف کئے ہیں۔ ایک آدھ ایسے خاکے بھی لکھے ہیں سرف ایک دو جملوں ہی میں مکمل ہوتے ہیں۔ گویا انھوں نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خاکے مختصر ہونے کے باوجود ان میں خاکہ نگاری کے تمام لوازمات کا اہتمام ہوتا ہے۔ جیسے کہ حلیہ، پہلی ملاقات، عادات و اطوار، پسند نا پسند، وغیرہ سے متعلق بڑی اہم باتوں کو دلچسپ اسلوب کے ذریعہ بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے خاکوں کی اس خصوصیت سے متعلق صابرہ سعید نے جو رائے دی ہے وہ درست معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتی ہیں:

''شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری کا بنیادی محرک مزاح ہے اور مقصد ہنسنا ہنسانا ہے۔ شخصیتوں کے حلیے، حرکات وسکنات، گفتگو، طرز عمل اور واقعات زندگی کے مضحک پہلوؤں تک ان کی نظر فوراً جا پہنچتی ہے۔ جنھیں وہ اپنے مخصوص اسلوب میں لطف لے کر بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور اسی ضمن میں بڑی چابکدستی کے ساتھ شخصیت کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ شوکت تھانوی کے خاکے جوش، ساغر

نظامی، روش صدیقی، تبسم نظامی، جالب دہلوی، رفیع احمد خاں اور سہیل الہ آبادی
شخصی خاکہ نگاری کی صنف میں خوش گوار اضافہ ہیں''۔49

شوکت تھانوی کے خاکوں کے مطالعہ کے بعد یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیات کی حلیہ، گفتگو، عادات واطوار، پسند ناپسند کو مختلف واقعات کے ذریعہ دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے، ان کی طبیعت کی شوخی اور بذلہ سنجی ان کی تحریروں کا بھی امتیازی وصف ہے جوان خاکوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ وہ لفظوں کے استعمال میں قدرت رکھتے ہیں۔ صفتوں کے استعمال میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے، تشبیہہ، استعارہ، محاورہ یا پھر صفت تکرار، صفت تجنیس اور صفت تضاد یا رعایت لفظی کا استعمال ان کے خاکوں کے اسلوب کو ادبی چاشنی اور لطف سے ہمکنار کرتا ہے۔

غرض کسی شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کا بیان غیر جانبداری سے فنی کاریگری اور پُر لطف اسلوب کے ساتھ اس عمدگی سے کرتے ہیں کہ موضوع خاکہ کی شخصیت اپنی تمام تر محاسن و عیوب کے ساتھ آپ کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے اور یہی ان کے خاکوں کا امتیازی وصف ہے۔

☆☆☆

حواشی

1. رشید احمد صدیقی، مشمولہ شیش محل، عفیف پرنٹرس، دہلی 2015ء
2. احتشام حسین، مشمولہ شیش محل، ص39
3. تاج (سید امتیاز علی) مشمولہ شیش محل، ص71
4. آغا حشر، مشمولہ شیش محل، ص31
5. آسی، مشمولہ: شوکت تھانوی، ص:27
6. ملک حبیب احمد، مشمولہ، شوکت تھانوی، ص:191
7. اثر لکھنوی، مشمولہ شیش محل، ص:35
8. کرشن چندر، مشمولہ شیش محل، ص:173
9. عظیم بیگ چغتائی، مشمولہ شیش محل، ص:163
10. عبدالحق، مشمولہ، شیش محل، ص:154
11. سبط حسن، مشمولہ شیش محل، ص:154
12. رحم علی الہاشمی، مشمولہ شیش محل، ص:111
13. دیا نرائن نگم، مشمولہ شیش محل، ص:101
14. حسرت موہانی، مشمولہ شیش محل، ص:91
15. پیارے لال شاکر میرٹھی، مشمولہ شیش محل، ص:70
16. اصغر گونڈوی، مشمولہ شیش محل، ص:47
17. آسی الدنی، مشمولہ شیش محل، ص:28

18۔ ساغر نظامی، مشمولہ، شیش محل، ص:127

19۔ فراق گورکھپوری، مشمولہ محل، ص:170

20۔ ذوقی (خواجہ مسعود علی،) مشمولہ، شیش محل، ص:106

21۔ دیوانہ گورکھپوری، مشمولہ، شیش محل، ص:103

22۔ حافظ سالم، مشمولہ، شیش محل، ص:88

23۔ ارشد تھانوی، مشمولہ، شیش محل، ص:43

24۔ جالب دہلوی، مشمولہ، شیش محل، ص:80

25۔ جگر مراد آبادی، مشمولہ، شیش محل، ص:83

26۔ خواجہ حسن نظامی، مشمولہ، شیش محل، ص:93

27۔ صفدر مرزا پوری، مشمولہ، شیش محل، ص:148

28۔ شوکت تھانوی، مشمولہ، قاعدہ بے قاعدہ، ص:68

29۔ مجنوں گورکھپوری، مشمولہ، شیش محل، ص:182

30۔ تاجور نجیب آبادی، مشمولہ، شیش محل، ص، 73

31۔ آنند نرائن ملا، مشمولہ، شیش محل، ص:32

32۔ عبدالماجد دریابادی، مشمولہ، شیش محل، ص:158

33۔ شاہد احمد، مشمولہ، شیش محل، ص: 141)

34۔ احسان دانش، مشمولہ، شیش محل، ص:37)

35۔ خلیل احمد، مشمولہ شیش محل، ص:99)

36۔ دیوانہ بریلوی، مشمولہ، شیش محل، ص:102)

37 بحوالہ، اردو نثر میں طنز مزاح، اشتیاق احمد ورک، ص:405)
38 روش صدیقی، مشمولہ محل، ص:120)
39 اثر لکھنوی، مشمولہ شیش محل، ص:34)
40 کرشن چندر، مشمولہ شیش محل، ص:174)
41 فکر، مشمولہ شیش محل، ص:171)
42 ارشد تھانوی، مشمولہ شیش محل، ص:43)
43 ، مولوی محمد صدیق مالک صدیق بکڈ پو، مشمولہ شیش محل، ص:146
44 مولوی عبدالرحیم، مشمولہ شیشی محل، ص:175
45 مرزا محمد عسکری، مشمولہ شیش محل، ص:187
46 پطرس بخاری، مشمولہ، قاعدہ بے قاعدہ، ص:26
47 کرشن چندر، مشمولہ شیش محل، ص:174
48 رام بابو سکسینہ، مشمولہ شیش محل، ص:109
49 اردو ادب میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید، ص:162

☆☆☆

اشرف صبوحی (پیدائش 1905)

صبوحی کا پورا نام سید ولی اشرف ہے لیکن وہ ادبی دنیا میں اشرف صبوحی کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ 11 رمئی 1905ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتداء میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم اپنی والدہ کے زیرنگرانی حاصل کی۔ اس کے بعد اینگلو عربک ہائی اینگلو عربک ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ 1922ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ مسجد فتح پوری کے اسلامی مدرسہ میں منشی فاضل کے امتحان کی تیار کرنے کی غرض سے داخلہ لیا۔ اس کے بعد انھوں نے فاضل، منشی فاضل، ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔

1929ء میں اشرف صبوحی نے محکمہ ڈاک میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی پہلی تحریر ایک تقریظ تھی جس کو ان کے پھوپھا مولوی بشیر الدین کے مجموعۂ کلام ''دیوان بشیر'' کے لیے لکھی تھی۔

اشرف صبوحی نے 1929ء سے ادبی رسائل میں مضامین لکھنا شروع کیا۔ ان کے پھوپھی زاد بھائی شاہد احمد دہلوی کے رسالہ ''ساقی'' میں بھی وہ کافی عرصے تک مضامین لکھتے رہے انھوں نے ''ارمغان'' کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا۔ اس ماہنامے میں عام طور پر ہلکے پھلکے مضامین اور افسانے شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیو کے لیے تقریریں، ڈرامے، فیچر، عورتوں کے پروگرام، بچوں کی کہانیاں اور بچوں کے ڈرامے بھی لکھتے تھے۔ ان کے لکھنے کا یہ سلسلہ ان کے پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔

اشرف صبوحی نے مضامین اور افسانوں کے علاوہ تراجم بھی کیئے۔ ان میں دو انگریزی ناولوں کے تراجم ''بن باسی دیوی'' اور ''بغداد کا جوہری'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور میں امریکی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ اشرف صبوحی کی پانچ اولادیں ہیں۔ جن میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

اشرف صبوحی نے خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ خاکوں کے مجموعوں کے سلسلے میں ان کی تین تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ مثلاً ''غبار کارواں''، جھروکے، اور'' دلی کی چند عجیب ہستیاں''۔ ''دلی کی چند عجیب ہستیاں''، میں انھوں نے ایسی شخصیات پر قلم اٹھایا ہے جو دہلوی تہذیب کی جیتی جاگتی مثالیں تھیں جن کے ذریعہ دلی تہذیب وتمدن کا پتہ چلتا ہے اس مجموعے میں ایک معمولی کباب والا، چپاتی والا اور اسی قسم کے مختلف کرداروں سے متعلق معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

اشرف صبوحی کے خاکوں کا مجموعہ ''دلی کی چند عجیب ہستیاں'' ہے۔ یہ مجموعہ 1943ء میں منظر عام پر آیا۔ انھوں نے اس مجموعے میں ایسے کرداروں کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے جن کی وجہ سے دلی کی تاریخ زندہ نظر آتی ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے کسی ایسے شخص کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جو بہت مشہور ہو مگر انھوں نے بعض عام کرداروں کو بھی پیش کیا ہے۔ گھمی کبابی، میاں، بھٹیارہ، ملن بائی، جیسے معمولی کرداروں کو بھی اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ ان کے خاکون کا جائزہ لیتے ہوئے صابرہ سعید نے ان کے کرداروں پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''اشرف صبوحی نے دلی کی ٹھیٹ زبان میں تمدن کے مرکز اور تہذیب کے گہوارے یعنی شہر دلی کے ان پرانی وضع کے لوگوں کے خاکے کھینچے ہیں جو ایک تہذیب وتمدن کی علامات تھے۔ یہ گھی کبابی، ملن نائی، مٹھو بھٹیارہ، میر باقر علی وغیرہ جیسی ہستیاں ہیں۔ یہ وہ شخصیتں ہیں۔ جن میں دلی کی روح دوڑتی ہے۔ دلی کا رنگ وروغن ان پر چڑھا ہوا ہے۔ جتنی شخصتیں اس کتاب میں بیان کی گئی

ہیں وہ منفرد حیثیت کی مالک ہیں۔ نہ وہ کسی پیشے کی نمائندہ ہیں نہ خاص سیرت و کردار کی نمائندہ ہیں۔ ان کی منفرد حیثیت ایسی ہے کہ ان کے ختم ہو جانے کے بعد پھر ان جیسی کوئی دوسری شخصیت نہیں ابھر سکتی، ایسی شخصیتیں ہر شہر میں پائی جاتی ہیں اور اپنے اپنے فن میں ماہر ہوتی ہیں۔ یہ مختلف پیشوں اور شعبوں سے متعلق ہیں، عوامی متن کاروں کے نمائندے ہیں، یہ گوشت و پوست کے زندہ سانس لیتے ہوئے انسان ہیں''۔1

اس مجموعے میں شامل کرداروں کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی عجیب اور دلچسپ ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا خاکہ ''خواجہ انیس'' ہے اس خاکے میں مغلیہ سلطنت کے دور کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ماحول کو اشرف صبوحی نے خواجہ انیس اور ان کی بیگم کے مکالموں کے ذریعے سے پیش کیا ہے۔ اس کا بیان اس عمدگی سے کیا گیا ہے کہ اسلوب کا لطف مزہ دیتا ہے۔ اس مجموعہ کا دوسرا خاکہ ''میر باقر علی'' کا ہے۔ یہ میر کاظم علی کے دربار میں قصہ خواں تھا۔ اس کے علاوہ بعد میں داستان گوئی بھی کرنے لگا تھا۔ اس داستان گوئی کے ذریعے سے ان کو اتنی شہرت ملی کہ وہ بہت عرصے تک کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ اشرف صبوحی اس کردار کی اس طرح سے عکاسی کی ہے کہ اس کا کردار ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا۔ انھوں نے کردار کو نہ پیش کیا ہوتا تو یقیناً سلطنت کا ایک اہم فنکار گم نامی کے پردے میں دفن ہو کر رہ جاتا۔

میر باقر علی کی سیرت و کردار کی عکاسی کرتے ہوئے اشرف صبوحی نے ان کے داستان سنانے کے انداز پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''میر صاحب کے کئی ہم مشرب یعنی چنپا بیگم کے عاشق بھی تھے۔ میر صاحب کو گھولوے کی لت کب سے تھی اور کس طرح لگی اس کا تو علم نہیں مگر تھی اور اس حد تک تھی کہ بغیر نشہ گھٹے داستان نہیں کہہ سکتے تھے۔ البتہ اور باتیں افیمیوں کی سی نہ تھیں۔ مزاج صفائی پسند تھا۔ طبیعت میں بھی کثافت نہ تھی۔

جب پیالی چڑھا کر داستان کہنے بیٹھتے تو انجانوں کو افیمی ہونے کا شبہ بھی نہ ہوتا۔ میر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ سطحی نظر والے جانتے ہی نہیں کہ افیم کیا ہے۔ وہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ دیکھنے میں کالی اور مزے میں کڑوی ایک شئے ہے جسے اہل نظر نے مکروہ کہہ دیا ہے۔ انھیں کیا خبر کہ اس کے چوگے میں میں ایک زبردست فلسفہ، ایک اعلیٰ مذہب بند ہے۔ مردانے خدا سے پوچھو اس کا باطن کیسا لالوں لال ہے ''موتوا قبل ان تموتو'' کی مجسم تفسیر بن جاتے ہیں جہاں اسے گھولنا شروع کیا گیا اور درستی اخلاق و تزکیہ نفس کی بنیاد پڑی۔ سرکشی سے سرکش اور ظالم سے ظالم آدمی سے پیتے ہی رحم کا پتلا اور خداترس بن جاتا ہے۔ اس کے اثر سے بڑے بڑے مغرور اور خود پسند سرنگوں ہو گئے ہیں۔ ہزاروں سورما اس کی بدولت میدانوں سے زندہ آ گئے۔ سینکڑوں پیر ایک پانی میں ڈوبنے سے بچ گئے۔ اس کے صدقے سے بیسیوں صفتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان میں وہ شیرینی کی مکھیاں ہونٹ چاٹیں۔ خیال آفرینیاں اس بلا کی کہ بوستان خیال کو مات کر دیں۔ زبانی بہادری کے یہ ٹھاٹھ کہ رستم و اسفندیار تھرا جائیں اور منکسر المزاجی یہاں تک کہ اگر ایک لونڈا اچھا نپڑ مارے تو سر مقدس زمین کے بوسے لے کر بھی اونچا نہ ہو، زبان سے سوائے منمناہٹ کے کیا مقدور ہے کہ کوئی لفظ تو اخلاق سے گرا ہوا نکل جائے۔ تواضع کا یہ حال کہ ایک گنڈیری کے جب تک چار ٹکڑے کر کے بھائیوں کو نہ کھلائیں چین نہ آئے''۔2

اقتباس قدرے طویل ہو گیا ہے لیکن ان کی شخصیت کی عکاسی کے لیے پورا اقتباس دینا ضروری تھا۔ جس سے ان کی داستان گوئی اور سیرت پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔

مٹھو بٹھیارہ اس مجموعے کا تیسرا خاکہ ہے۔ مٹھو بٹھیارہ کا اصل نام کریم بخش تھا لیکن کسی نے اس کے اصل نام سے نہیں پکارا تھا۔ کیوں کہ دلی کی تہذیب میں زبان کا چٹخارہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے

زبان کے چٹخارے سے مراد پکوان ہیں۔ جو دلی اور دلی والوں کو دوسروں سے مختلف کرتے ہیں۔ میاں مٹھو بھی کھانوں کی لذت کی وجہ سے مشہور تھے۔شاہ نارا کی گلی میں شیش محل کے دروازے پر مٹھو کی دکان تھی اشرف صبوحی نے مٹھو بھٹیارہ کی شخصیت کا بیان اتنی دلکشی سے کیا ہے کہ پوری شخصیت نظروں میں گھوم جاتی ہے۔انھیں حلیہ نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔مٹھو بھٹیارے کی حلیہ نگاری بڑے پرلطف انداز میں کی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

> ''معمولی قد، چھریرا بدن، سر گھٹا ہوا، چندی آنکھیں، پلکیں اڑی ہوئیں۔ شاید دھوئیں اور آگ نے آنکھوں کا یہ درجہ بنادیا تھا۔ ڈاڑھی کیا بتاؤں، جب کبھی ہوگی تو بالکل خصی بکرے کی سی۔تندور میں جھک کر روٹی لگائی جاتی ہے۔ کوئی کیسا ہی چھپا کا کرے، آگ کی لپیٹ کہاں چھوڑے، جھلتے جھلتے لہسن کی پینڈی بن کر رہ گئی تھی۔ڈاڑھی کا یہ حال تو مونچھوں کا کیا ذکر''۔

مٹّھو بھٹیارہ ،مشمولہ ،اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد اول، کاک آفسٹ پرنٹرس ،دہلی 2004،ص:284'

مندرجہ بالا اقتباس سے اشرف صبوحی کے اسلوب کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے کیوں کہ انھوں نے تشبیہات کے استعمال سے مٹھو کی صورت کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ ان کی ڈاڑھی کو خصی بکرے کی ڈاڑھی سے تشبیہ دی ہے۔اور اس کی آنکھوں کو دھوئیں سے اور آگ میں جھلسنے سے ڈاڑھی کا جو حال ہوا تھا اسے لہسن کی پینڈی سے تشبیہ دی ہے یعنی آنکھوں کا ڈاڑھی کا نقشہ اس مزاحیہ انداز میں کیا ہے کہ قاری مٹھو بٹھیارے کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔اس خاکے میں انھوں نے مٹھو بھٹیارے کی زندگی پر کم ہی روشنی ڈالی ہے جب کہ اس خاکے کے ذریعہ اس وقت دلی کا حال اور تہذیب وتمدن پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔مثال کے طور پر مٹھو کی دکان شاہ تارا گلی میں شیش محل کے دروازے سے لگی ہوئی تھی مگر اب اس دروازے کا کوئی اتا پتہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس پرانی اور قدیم

دروازے کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''شاہ تارا کی گلی میں شیش محل کے دروازے سے لگی ہوئی میاں مٹھو کی دکان تھی۔شیش محلّہ کہاں؟ کبھی ہوگا۔اس وقت تک آثار میں آثار ایک دروازہ وہ بھی اصل معنوں میں پھوٹا ہوا باقی تھا۔نمونتہً یا بطور یادگار۔اب تو ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ بھی صاف ہوگیا۔اس کی جگہ دوسری عمارتیں بن گئیں۔دروازہ تو کیا رہتا دروازے کے دیکھنے والے بھی دو چار ہی ملیں گے''۔3

اس طرح اشرف صبوحی نے اپنے خاکوں کے ذریعہ سے نہ صرف شخصیات کو زندہ کردیا ہے بلکہ اس وقت کی تہذیب، ماحول کی بھی جیتی جاگتی تصویریں پیش کردی ہیں۔

اشرف صبوحی کے اسلوب کی ہی خاصیت ہے کہ وہ حلایہ نگاری میں زیادہ تر ایسی تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں کہ اس سے مزاح پیدا ہوجاتا ہے۔مثلاً گھمی کبابی کی حالیہ نگاری میں بھی ایسی ہی تشبیہات کے ذریعہ مزاح پیدا کردیا ہے۔مثلاً لکھتے ہیں:

''میاں گھمی کی صورت بھی ایسی گول مٹول تھی کہ گولے کا کباب معلوم ہوتے تھے''۔4

گھمی کبابی کے گول چہرے کو گولے اس کی مناسبت سے گول کے کباب سے تشبیہ دی ہے۔ گھمی کبابی چونکہ پیشے کے کبابی تھی اور پایہ سے لذیذ کبابوں میں ان کا نام مشہور تھا۔اس کی شہرت کا یہ حال تھا کہ سارا شہر اسے جانتا تھا۔کبابوں کی دنیا میں اس سے دلچسپ کوئی شخصیت نہ تھی۔اس کا لباس بھی بڑا دلچسپ تھا۔اس کے کام کرنے کے انداز کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کے لباس اور حلیے کا بیان یوں کیا ہے:

''اتنے میں وہ بھی لنگی باندھے تہبند سے اونچا بنیان پہنے بڑے ٹھسے سے تشریف لاتے۔سر پر پتیلا،بغل میں روٹیاں، دونوں ہاتھوں میں دو پوٹ''۔5

گھمی کبابی کی شخصیت میں خوب وضعداری تھی لوگوں نے لاکھ چاہا کہ گھر میں کسی تقریب یا شادی بیاہ کے موقعے پر گھمی ان کے گھر آ کر ہی کباب بنادے لیکن اس نے کبھی بھی اس کام کے لیے رضامندی ظاہر نہ کی۔ اسکی ایک اور خصوصیت یہ تھی جب کوئی اس کی دکان پر آتا تو ان کو نمبروں سے کباب دیتا تھا۔ مطلب جو پہلے آیا اسے پہلے اور جو بعد میں آیا اسے اس کے نمبر کے مطابق کباب ملتے اور اپنے اس اصول پر وہ سختی سے کاربند تھا۔ اشرف صبوحی کو اس کی یہ ایمانداری بہت متاثر کی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''دلی کے اکثر دکان داروں میں یہ بات پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے کہ وہ گاہکوں کے نمبر کا خیال رکھتے ہیں۔ وارے سوداد یتے اور تاہم خریدار کی مطابقت اور خریداری کی نوعیت سے ان کا یہ قاعدہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ لیکن گھمی کبابی اس اصول کا بڑی مضبوطی سے پابند تھا۔ اس کی نگاہ میں ایک پیسے کے اور ایک روپے کے کباب لینے والا برابر تھا۔ اب اس کو کوئی برا کہے یا اچھا۔ اس کے اس طریق کی کوئی مذمت کرے یا تعریف وہ بڑی سے بڑی موٹر میں بیٹھ کر آنے والے کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے کہ ''میاں ایسی جلدی ہے تو کہیں اور سے لے لو، میں تو نمبر سے دوں گا''۔ باوجود اس کے کہ میں اس کا لگا بندھا گاہک تھا۔ اس کو میری خاطر بھی منظور تھی۔ مجھے وہ خاص طور پر زیادہ ہی لگا کر دھیمی آگ پر سنکے ہوئے کباب دیا کرتا تھا۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ نمبر کے خلاف دیے ہوں۔ ذرا جلدی کی اور اس نے تیوری چڑھا کر کہہ دیا کہ ''حضرت گھمی کو اپنی جنٹلمینی سے نہ دبایئے۔ آپ سے پہلے کا یہ لونڈا کھڑا ہے۔ اس کی سیخ سینک دوں پھر آپ کا وار ہے۔ دیکھیے یہ آپ کے واسطے لگا رکھی ہے''۔

گھمی کی اس مستقل عادت سے دو چار دفعہ ہمیں تکلیف بھی ہوئی اور برا بھی

معلوم ہوا لیکن ایمان کی بات ہے کہ اس جاہل کبابی میں یہ خصلت ایسی تھی کہ ہزاروں پڑھوں لکھوں میں نہیں ہوتی۔ مساوات کا سبق میں نے اسی دکان پر پڑھا تھا''۔6

اقتباس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گھمی کبابی کی اصول پسند شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی بڑی شخصیت سامنے آجائے تو ہم اس کی چاپلوسی اور خوشامد کرنے کے لیے اپنی خودداری اور اصول بھی توڑ دیتے ہیں لیکن گھمی کبابی نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اس کی اس عادت کی عکاسی الشرف صبوحی نے بڑی عمدگی سے کی ہے۔ ہم اس کی شخصیت متاثر ہونے لگتے ہیں۔ یہی ان کی خاکہ نگاری کی خصوصیت ہے۔

اشرف صبوحی نے روزمرہ زندگی کے مشاہدات کو اپنے خاکوں میں اتنی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ زبان سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر میاں مٹھو بھٹیارہ کے دکان کھولنے اور گاہکوں کے منظر کی اتنی دلکش تصویر کشی کی ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مثال دیکھئے:

''سنا ہے جاڑے، گرمی برسات محلے بھر میں سب سے پہلے میاں مٹھو کی دکان کھلتی منہ اندھیرے بغل میں مصالحہ کی پوٹلی وغیرہ سر پر پتیلا، پیٹھ کے اوپر کچھ چھپٹیاں کچھ جھانگڑ لنگی میں بندھے ہوئے گنگناتے چلے آتے ہیں۔ آئے دکان کھولی، بہارو، بھارو کی تندور کھولا، ہڈیوں گڈیوں یا اوجھڑی کا ہنڈا نکالا، ہڈیاں جھاڑیں، اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں کئے یعنی گھر سے جو پتیلا لائے تھے۔ ہنڈے کا مال اس میں ڈالا، مصالحہ چھڑکا اور اپنے دھندے سے لگ گئے۔ سورج نکلتے نکلتے سالن، نہاری، شروا، جو کہو درست کرلیا۔ تندور میں ایندھن جھونکا۔ تندور گرم ہوتے ہوتے غریب غربا کام پر جانے والے روٹی پکوانے یا لگاون کے لیے شروا لینے آنے شروع ہو گئے۔ کسی کے ہاتھ میں آنے کا طباق ہے تو کوئی مٹی کا پیالہ لئے چلا آتا ہے اور میا مٹھو ہیں کہ جھپا جھپ روٹیاں بھی

پکاتے جاتے ہیں اور پتیلے میں کھٹا کھٹ چمچہ بھی چلا رہا ہے۔7

مندرجہ بالا اقتباس سے ان کی منظر کشی و جزئیات نگاری کا کمال تو نظر آتا ہے۔ساتھ ہی ان کے اسلوب کی دلکشی بھی ظاہر ہوتی ہے وہ صوتی تکرار کے ذریعہ مٹھو بھٹیارے کی دکان اور کام کے انداز کی تصویر کشی کی ہے کہ لطف آجاتا ہے۔دلّی اور دلّی والوں کی پسندیدہ ’چیز نہاری‘ ہے اور اس کو کھانا بھی دلی والے ہی جانتے ہیں۔اشرف صوفی نے’ گنجے نہاری والے‘ کے عنوان سے ایک خاکہ بھی قلم بند کیا اہے۔نہاری دلی کی تہذیب کا ایک حصہ ہے دور دور تک دلی کی نہاری مشہور ہے انھوں نے گنجے نہاری کی نہاری میں کی ستائش بڑی عمدگی سے کی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

’’نہاری کیا تھی بارہ مسالے کی چاٹ ہوتی تھی، امیر سے امیر اور غریب سے غریب اس کا عاشق تھا۔نہاری اب بھی ہوتی ہے اور آج بھی دلّی کے سوا نہ کہیں اس کا رواج ہے نہ اسکی تیاری کا کسی کو سلیقہ۔دلّی کا دلّی کا ہر نان بائی نہاری والا بن بیٹھا۔مگر نہ وہ ترکیب یاد ہے نہ وہ ہاتھ میں لذت۔کھانے والے نہ رہیں تو پکانے والے کہاں سے آئیں۔8

گنجے نہاری کی نہاری کے ساتھ ساتھ مٹھو بٹھیارہ کے اوجھڑی اور پراٹھے بھی لذیز ہوتے تھے۔ان کے پکوان کا ذکر بھی اس عمدگی سے کیا ہے کہ واقعی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے۔مثلاً لکھتے ہیں:

میاں مٹھو کی اوجھڑی مشہور تھی۔دور دور سے شوقین منگواتے۔آنتوں اور معدے کے جس مریض کو حکیم اوجھڑی کھانے کو بتاتے وہ یہیں دوڑا چلا آتا۔کہتے ہیں کہ پراٹھے بھی جیسے میاں مٹھو پکائے گا پوری دلی میں کسی کو نصیب نہ ہوئے۔ہاتھ کچھ ایسا منجھا ہوا تھا۔تندور کا تاؤ کچھ ایسا جانتے تھے کہ مجال ہے جو کچا رہے یا جل جائے۔سرخ جیسے باقر فرنی، سموسے کی طرح ہر پرت الگ نرم، بالکل ملائی۔کرارا کہو تو پاپڑوں کی تھی کجھلے کو مات کرے۔پھر گھی کھپانے میں وہ

کمال کے پاؤ سیر آٹے میں ڈیڑھ پاؤ گھی کھپا دیں۔ ہر نوالے میں گھی کا گھونٹ اور لطف یہ کہ دیکھنے میں روکھا۔غریبوں کے پراٹھے بھی ہم نے دیکھے۔ دو پیسے کے گھی میں تر بتر۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ ڈیڑھ پاؤ گھی والے سے دو پیسے والے پر زیادہ رونق ہے۔ اس ہنر کی بڑی داد یہ ملتی کہ غریب سے غریب بھی پراٹھا پکوا کر شرمندہ نہ ہوتا۔ پوسیری اور جھٹنکی پراٹھے دیکھنے والوں کو یکساں ہی دکھائی دیتے۔ مال دار مفلس کا بھید نہ کھلتا''۔9

اس اقتباس میں انھوں نے پراٹھوں کی مناسبت اور لذت کے اعتبار سے تشبیہات کا بڑا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ انھیں سموسوں سے تشبیہ دی ہے۔ اسکی نرمی کے اعتبار سے ملائی سے اور کرارے پن کے اعتبار سے پاپڑ سے تشبیہ دی ہے لیکن اشرف صبوحی کی منظر نگاری کی ہی خصوصیت ہے وہ شخصیات کی ہنرمندی اور طلبی کا بیان بھی عمدگی سے کرتے ہیں کہ اس کی ساری تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

اشرف صبوحی کے خاکوں کے مطالعے سے ہمیں یہ بھی علم ہو کہ انھوں اپنے خاکوں کے لیے عام اور معمولی کرداروں کا ہی انتخاب کیا ہے۔ اشرف صبوحی کو تاریخ تہذیب اور پرانی وضع داریوں سے نہایت دلچسپی تھی۔ اس لیے انھوں نے ایسے کرداروں کی مرقع کشی کی کہ جن کے ذریعے ایک عہد کی مٹی ہوئی تہذیب کے نقوش ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں۔ انھوں نے اپنے کردار کی مناسبت سے زبان کا استعمال کیا ہے ساتھ ہی جس پیشے کے کردار میں انھیں کی مناسبت سے وہ تمام اصطلاحیں اسعمال کی جو اس پیشے سے تعلق رکھتی میں گو کہ ان کے کردار معمولی حیثیت و درجے کے کردار ہیں لیکن انھوں نے ان کے اسلوب کی ستائش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ان کے کرداروں میں بذات خود دلچسپ بننے کی صلاحیت نہیں لیکن یہ اشرف صاحب کی زبان اور طرز تحریر کی خوبی ہے جن کی وجہ سے ان کے

موضوع انتہائی دلچسپ بن گئے ہیں۔ ان کا اسٹائل بے مثال ہے۔ سلیس بامحاورہ اور رواں دلی کی ٹکسالی زبان لکھتے ہیں۔ لب ولہجہ میں ایک خاص دل کشی ہے۔ گو انداز بیانیہ ہے لیکن شیرین وشگفتہ تیز وطرار ہونے کے ساتھ چست اور برجستہ بھی ہوتے ہیں۔'' 10ؕ

اپنے اسلوب کی چاشنی اور لب ولہجے کی شائستگی سے ان کرداروں میں زندگی کی حرارت بھردی۔ ان کے حلیہ اور لباس کا بیان، ان کے کام کرنے کے انداز، ان کی عادات واطوار ان کی اصول پسندی، ان کے پکوان کی لذت اور شہرت گو کہ تمام خصوصیات کا بیان اس قدر جاندار و دلکش اسلوب کے ذریعہ کیا کہ یہ کردار اردو ادب میں ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہو گئے۔

☆☆☆

حواشی

1۔اردو ادب میں خاکہ نگاری،صابرہ سعید،ص:279

2۔ بحوالہ،میر باقر علی،اردو ادب میں خاکہ نگاری،ص:280

3۔مٹّھو بھٹیارہ،مشمولہ،اردو کے بہترین شخصی خاکے،جلد اول،کاک آفسٹ پرنٹرس،دہلی،ص285

4۔ گھمی کبابی،مشمولہ،اردو کے منتخب خاکے،ص:25

5۔ گھمی کبابی،مشمولہ،اردو کے منتخب خاکے،ایچ۔ایس ۔آفسٹ پرنٹرس،نئی دہلی،2011،ص:30

6۔ اردو کے منتخب خاکے،یچ۔ایس۔آفسٹ پرنٹرس،نئی دہلی،2011/ص:29

7۔مٹھو بھٹیارہ،مشمولہ،اردو کے بہترین شخصی خاکے،جلد اول،2004 ،ص:285

8۔گنجے نہاری،مشمولہ،دلی کی چند عجیب ہستیاں،ص:104

9۔مٹھو بٹھیارہ،مشمولہ،اردو کے بہترین شخصی خاکے،جلد اول285

10۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری،ص:281

☆☆☆

شاہد احمد دہلوی (پیدائش 1906۔وفات 1967)

شاہد احمد دہلوی اردو کے پہلے خاکہ نگار ہیں وہ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے۔اور شاہد احمد دہلوی کے والد بشیر احمد دہلوی بھی ادیب تھے۔ان کی شہرت کی دو اہم وجوہ ہیں ایک ماہنامہ ''ساقی'' اور دوسری ان کی ''خاکہ نگاری''۔ان کو ساقی سے اس قدر وابستگی تھی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہوگئے،یعنی ساقی کے بغیر شاہد احمد دہلوی کا اور شاہد احمد دہلوی کے بغیر ''ساقی'' کا ذکر کرنا نامکمل معلوم ہونے لگتا ہے۔

شاہد احمد دہلوی 1906ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔اسی لئے ان کی ابتدائی تعلیم والد کے زیر نگرانی ہوئی تھی۔اس کے بعد کی تعلیم کے لئے نویڈا اسکول میں داخلہ دلایا گیا۔اس کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے مگر ان کا آگے کی تعلیم میں دل نہیں لگا۔یہاں پر تین سال گذارنے کے بعد وہ دہلی واپس آگئے اور یہاں اینگلو عربک اسکول میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔1928ء میں بے۔اے کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد ایم۔اے فارسی میں داخلہ لیا اور انھوں نے عربی کی تعلیم شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن سے حاصل کی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد اگر وہ چاہتے تو اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمت حاصل کرسکتے تھے۔مگر انھوں نے محکمہ ریلوے میں دو ماہ ملازمت کی اور اسکے بعد ملازمت ترک کردیا کیوں کہ انھوں نے ملازمت کی بجائے اس وقت علمی کارناموں کی تدوین اور اشاعت کے نام کو سنبھالنا زیادہ ضروری سمجھا۔

شاہد احمد دہلوی کی شادی 14 جنوری 1922ء میں عالیہ بیگم سے ہوئی۔انھوں نے دوسری شادی 1938ء عاصمہ بیگم سے کی تھی۔وہ 23 ستمبر 1947ء کو دہلی سے لاہور چلے گئے۔ان کی ادبی

خدمات پر ان کو 1963ء میں صدارتی انعام سے نوازا گیا۔ ان کی وفات 27 مئی 1967ء میں کراچی میں ہوئی۔ وہ کراچی ہی میں مدفن ہوئے۔

شاہد احمد دہلوی کا تعلق صحافت کے ساتھ ساتھ علم و ادب سے بھی تھا۔ وہ ایک اچھے صحافی کے علاوہ بہترین نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثری تصانیف جا بجا ساقی میں شائع ہوتے تھے۔ وہ مختلف زبانوں میں ناول، افسانے اور ڈراموں کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو خاکہ نگاری میں شاہد احمد دہلوی کے دادا نذیر احمد دہلوی کی شخصیت پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے خاکہ لکھا ہے اور شاہد احمد دہلوی نے خود ادیبوں اور شاعروں کے خاکے تصنیف کیے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''گنجینہ گوہر'' (1962ء) اور دوسرا مجموعہ ''بزم خوش نفسان'' 1985ء میں شائع ہوا۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے پہلے کس کا خاکہ لکھا ہے۔ چنانچہ ان کے خاکہ نگار یا آغاز کے متعلق جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''1950ء سے 1962ء کے دوران یعنی بارہ سال کے عرصہ میں شاہد صاحب نے کوئی سترہ نایاب و آبدار موتی صدف جیسے اوراق کے سینے میں مجتمع کیے جنھیں ترتیب وارلڑی کی شکل دے کر ''گنجینۂ گوہر'' میں داخل کیا گیا۔ اس کے علاوہ شاہد صاحب نے ''دلی کا ایک دور'' کے عنوان سے بارہ شخصیتوں کے نقوش بھی ''نقوش'' کے شخصیات نمبر کے لیے مختصر کینوس پر ابھارے ہیں۔ مرزا عظیم بیگم چغتائی کا خاکہ اور ''دلی کا ایک دور'' کی اشاعت 1955ء میں عمل میں آئی۔ اشاعت کا لحاظ کریں تو عظیم بیگ کے خاکہ کو ان کا پہلا خاکہ کہہ سکتے ہیں لیکن انھوں نے کس شخصیت پر پہلے قلم اٹھایا اس نقطہ نظر کو پیش نظر رکھیں تو اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ خود شاہد صاحب کی تحریر کی روشنی میں صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے پہلا مضمون ''ایم۔ اسلم'' پر لکھا ہے''۔ 1

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ 'گنجینہ گوہر'' میں سترہ خاکے شامل ہیں۔ان خاکوں میں ایک خاکہ شاہد احمد دہلوی کا بھی ہے۔اس مجموعے میں شامل خاکے 1950ء سے 1962ء کے درمیان میں لکھے گئے ہیں۔اس مجموعے میں دوخاکے باپ دادا کے ہیں تو چار خاکے بزرگوں کے،جن میں خواجہ حسن نظامی، بےخود دہلوی،مولوی عنایت اللہ وغیرہ اہم ہیں۔ایک خاکہ موسیقار کا ہےاور باقی تمام ان کے ہم عصر اور دوست احباب کے ہیں۔ان میں عظیم بیگ چغتائی،جگر مرادآبادی،ایم۔اسلم، کیف دہلوی،مرزا محمد سعید،میراجی،منٹو،جوش اور جمیل جالبی وغیرہ کے خاکے شامل ہیں۔

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''بزم خوش نفساں'' ہے۔اس مجموعے میں کل 26 خاکے شامل ہیں۔اس مجموعے کو ان کی وفات کے کافی عرصے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کر کے 1985ء میں شائع کر دیا تھا۔

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں خاکہ نگاری کے تمام لوازمات ملتے ہیں۔انھوں نے شخصیات سے پہلی ملاقات پر ابھرنے والے تاثر کا ذکر اپنے خاکوں میں کیا ہے۔مثلاً فیض احمد فیض سے شاہد احمد دہلوی کی پہلی ملاقات ڈاکٹر شوکت انصاری کے گھر پر ہوئی تھی۔اس سے پہلے انھوں نے کبھی کسی اخبار میں بھی ان کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ان کی ملاقات فیض سے ڈاکٹر انصاری ہی نے کروائی تھی۔ان سے پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

> ''ہاں تو ڈاکٹر شوکت انصاری کے ہاں جلسے میں جو ایک اجنبی شخص نظر آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے قریب جا کر پوچھا۔یہ کون ہے؟ ڈاکٹر صاحب کسی قدر حیراں اور شرمندہ ہو کر بولے۔آپ انھیں نہیں جانتے؟ یہ فیض احمد فیض ہیں۔اسلامیہ کالج امرت سر میں پروفیسر ہیں۔میں پھر بھی نہیں سمجھا اور اپنی لاعلمی چھپانے کے لیے خاموش ہو رہا۔جلسہ شروع ہوا۔ڈاکٹر صاحب نے صدارت کی۔مضامین پڑھے گئے۔ان پر گفتگو ہوئی۔نظمیں پڑھی گئیں۔واہ واہ

ہوئی۔آخر میں جناب صدر نے فیض صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ انھوں نے از راہِ انکساری نہیں نکڑ کی۔مگر جب انھوں نے اپنی نظم سنائی تو ہم سب کے کان کھڑے ہوئے اور دیدے پھٹے کہ پھٹے رہ گئے، یہ پر ہین شاعر اب تک کہاں چھپا رہا؟ پھر تو چاروں طرف سے ایک اور ایک اور کی آوازیں آنے لگیں۔ہم سب ان کا کلام سن کر بہت خوش ہوئے اور وقت رخصت میں نے فیض صاحب سے ہاتھ ملایا اوران کی تعریف کی یہ فیض احمد فیض سے میری پہلی ملاقات تھی''۔ 2

اس اقتباس میں شاہد احمد دہلوی نے فیض سے متعلق اپنی لاعلمی کا اعتراف بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

شاہد احمد دہلوی کے دادا نذیر احمد دہلوی تھے۔جن کی علمی شخصیت سے وہ بچپن میں ناواقف تھے۔ان کی علمی قدر و قیمت کا اندازہ انھیں بعد میں ہوا لیکن اپنے دادا سے وہ بچپن میں اس لیے دور رہتے تھے کیوں کہ ان کے والد حیدرآباد میں رہتے تھے۔والد کے ہمراہ وہ پہلی بار اپنے آبائی مکان جو دہلی میں تھا، گئے تو وہاں ان کے دادا سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔اس ملاقات سے ان پر جو تاثرات ابھرے اس کا ذکر انھوں نے اپنی منظرکشی کے ذریعہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے کہ پورا نقشہ نظروں میں گھوم جاتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

میں نے مولوی نذیر احمد صاحب کو پانچ برس کی عمر میں آخری بار دیکھا۔اس سے پہلے دیکھا تو ضرور ہوگا مگر مجھے بالکل یاد نہیں مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم تین بھائی ابا کے ساتھ حیدرآباد دکن سے دلی آئے تھے تو کھاری باولی کے مکان میں گئے تھے۔ڈیوڑھی کے آگے صحن میں سے گزر کر پیش دالان میں گئے، یہاں دو تین آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔پچھلے دالان کے دروں میں کیواڑوں کی چوڑیاں چڑھی ہوئی تھیں جن کے اوپر رنگ برنگ شیشوں کے بستے بنے ہوئے تھے۔یہ

تین دروازے تھے جن میں دو کھلے ہوئے تھے اور ایک دائیں جانب کا بند تھا۔ اس کمرے نما دالان میں ہم ابا کے ساتھ داخل ہوئے تو سامنے ایک پلنگ پر ایک بڑے میاں دکھائی دیئے۔ ان کی سفید داڑھی اور کنٹوپ صرف یاد ہے۔ ابا جلدی سے آگے بڑھ کر ان سے لپیٹ کر رونے لگے اور ہم حیران کھڑے رہے۔ جب ان کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو ہمیں حکم ہوا کہ دادا ابا کو سلام کرو ہم نے سلام کیا۔ انھوں نے پیار کیا۔ ایک ایک اشرفی سب کو دی اور ہم کمرے کے اندھیرے سے گھبرا کر باہر نکل آئے اور کھل کود میں لگ گئے۔ اس کے بعد انھیں پھر دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔'' 3

جگر مرادآبادی سے شاہد احمد دہلوی کی پہلی ملاقات بھوپال میں ہوئی تھی۔ شاہد احمد دہلوی نے 1931ء یا 1932ء میں حیدرآباد سے واپسی کے وقت بھوپال میں دو دن کے لیے ٹھہرے تھے۔ اسی وقت جگر مرادآبادی سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اس وقت جگر مرادآبادی نے ان سے بڑے خلوص سے ملے تھے شاہد احمد دہلوی ''ساقی'' کے ایڈیٹر تھے۔ اس حیثیت سے وہ خود ان سے ملنے آ گئے۔ ان سے پہلی ملاقات میں شاہد احمد دہلوی کا یہ تاثر رہا ملاحظہ کیجیے:

''میں 1931ء تا 1932ء میں حیدرآباد گیا تھا۔ واپسی میں دو دن کے لیے سید ابومحمد مرحوم کے ہاں بھوپال میں ٹھہرا تھا۔ سید صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ انھیں یوں پہچانے کہ سید ابوالاعلی مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ جگر صاحب اس زمانے بھوپال ہی میں تھے۔ خبر نہیں کہاں سے انھیں معلوم ہوا۔ تیسرے پہر کو مجھ سے ملنے چلے آئے۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بڑے خلوص و محبت سے گلے ملے۔ میری خیریت پوچھی۔ ساقی کی کیفیت دریافت کی۔ خود ہی ''ساقی'' کے لیے اپنا کلام بھیجنے کا وعدہ کیا''۔ 4

عظیم بیگ چغتائی سے شاہد احمد دہلوی کی پہلی ملاقات دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی۔ ان

کی اس ملاقات سے ان پر ابھرے تاثرات کا ذکر انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے:

پہلا خط بھیجنے کے دو تین مہینے بعد ان کا خط آیا کہ میں دلی آرہا ہوں اور رات کو فلاں گاڑی سے، بیوی بھی ساتھ ہوگی۔ مرزا صاحب کی تصویر ہم سب دیکھ چکے تھے۔ رات کو میں انصار ناصری اور فضل حق قریشی انھیں لینے اسٹیشن پہنچے۔ ریل آئی۔ ایک ایک ڈبہ چھان مارا۔ چغتائی صاحب کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب گاڑی بالکل خالی ہوگئی تو ہم اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ سامنے سڑک پر سے ایک تانگہ گزرا۔ اس میں ایک خاتون اور ایک صاحب دکھائی دیئے۔ فضل حق نے کہا۔ وہ جارہے ہیں چغتائی صاحب! میں نے اور انصار نے چونک کر انھیں دکھا کوئی بڈھا چرمرایا سا آدمی تھا۔ موٹی سی عینک لگائے۔ پھر ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ اگلے دن صبح میں گھر ہی میں تھا کہ اطلاع پہنچی۔ چغتائی صاحب مردانے میں آئے بیٹھے ہیں۔ میں لپک کر پہنچا تو دیکھا کہ بیٹھک میں وہی تانگے والا بڈھا بیٹھا ہے۔ غور سے دیکھا تو اسے تصویر سے کچھ مشابہ پایا۔ اس نے کہا آپ ہیں شاہد صاحب؟ میں نے کہا جی ہاں اور مجھ سے چمٹ گئے۔ بولے اماں میں تو سمجھا تھا کوئی خوفناک شکل کا مولوی ہوگا۔ مولوی شاہد احمد تم تو اچھے خاصے آدمی ہو''۔ 5

شاہد احمد دہلوی نے عظیم بیگ چغتائی سے پہلی ملاقات کا ذکر بڑے شگفتہ انداز سے کیا ہے۔ مولوی عنایت اللہ پر بھی انھوں نے خاکہ لکھا۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی سے پہلی بار حیدرآباد میں انھیں کے گھر پر ملاقات ہوئی اور وزیر حسن کے توسط سے یہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات کا ذکر انھوں نے ایک واقعہ کے حوالے سے دلچسپ انداز میں کی۔ جس سے نہ صرف ان کے تاثرات کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان کی حلیہ نگاری اور منظر نگاری پر قدرت کا بھی علم ہوتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''1932ء میں جب حیدرآباد گیا تو مولانا سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی شہر

کے باہر وہ ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے تھے۔کوٹھی میں نہایت نفیس فرنیچر لگا ہوا تھا اوراس کے سارے کمرے سجے ہوئے تھے۔ایک چھوٹے کمرے میں مولانا کی رہائش تھی۔چھٹی کا دن تھا اور مولانا سفید قمیض اور سفید ا کہرا پاجامہ پہنے کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔سر پر سرخ مخمل کی ملائم ٹوپی تھی۔عمر ساٹھ سے اوپر مگر چہرہ سرخ وسپید، گورارنگ، کشادہ پیشانی، آنکھوں پر سبز سے فریم کی عینک، جس میں آنکھیں ہیرے کی طرح چمکتی تھیں۔ پتلی ستوان ناک، موزوں دہانہ، اس پر سفید کترواں مونچھیں، اکہرا جسم، بڑے نازک سے آدمی دکھائی دیتے۔وزیرحسن صاحب نے مرا تعارف کرایا تو بڑی محبت سے ملے۔ سینچی اور ہلکی آواز میں بولتے رہے"۔ 6

اس اقتباس میں مولوی عنایت اللہ کی شخصیت سے نہ صرف تعارف ہوتا ہے کہ بلکہ شاہد احمد دہلوی کی زبان وبیان پر قدرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اس اقتباس میں انھوں نے مولوی عنایت اللہ کے آنکھوں کی چمک کو ہیرے کی چمک سے تشبیہ دی ہے۔

شوکت تھانوی اور نسیم انہونوی سے پہلی ملاقات شاہد احمد کے گھر ہی پر ہوئی۔شوکت تھانوی ان سے ملنے گھر آ گئے اور شرارتاً اپنا نام نہ بتایا جس سے شاہد احمد دہلوی کو برا لگا اور وہ چڑ گیا اور خود بھی ر شرارتاً دیر سے گئے۔اس ملاقات کا ذکر ایک واقعہ کے ذریعہ بڑے شگفتہ ولطیف انداز میں کیا۔جس سے حلیہ نگاری پر ان کی مکمل گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔اقتباس دیکھئے:

''چنانچہ منہ ہاتھ دھوکر ناشتہ کیا اور آدھ گھنٹے بعد مردانے میں آیا۔دونوں انتظار میں سوکھ گئے تھے۔میرے داخل ہوتے ہی وہ سروقد کھڑے ہو گئے۔یہ دونوں جواں تھے، جنھیں دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد کے مرزا ظاہر دار بیگ یاد آ گئے۔ دونوں چھیلا بنے ہوئے تھے۔ان میں سے ایک جوزیادہ چرباک تھے۔ذرا آگے بڑھ کر بولے۔ہمیں پہچانیئے۔

میں نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی۔ کسی قدر تنگ پیشانی، گول چہرہ، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، شریر بے قرار، آنکھیں موزوں بنی، لبوں پر پان کی ہلکی سرخی، ترشی ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی گھٹی ہوئی۔ بے شکن اچکن، چست پاجامہ وارنش کا پمپ۔ داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی۔ ان کی تصویر میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا ''شوکت تھانوی'' مسکرا کر بولے۔ آپ نے ٹھیک پہچانا۔ یہ کہہ کہ مصافحہ کیا۔ پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے بولے اور یہ وہ میں نے انھیں بھی سر سے پیر تک جانچا۔ تقریباً ایک ہی سا حلیہ تھا دونوں کا سوائے اس کے کہ ان کے چہرے پر عینک نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ یہ آپ کے نیس ناطقہ نسیم انہونوی ہو سکتے ہیں۔ شوکت نے کہا۔ بھئی خوب اندازہ لگایا۔ نسیم صاحب بھی آ گئے بڑھ کر گلے ملے''۔ 7

اقتباس ذرا طویل ہو گیا لیکن پورے واقعہ کا بیان ضروری تھا۔ اس لیے مجبوراً انتخاب کرنا پڑا۔ اس اقتباس کے مطالعے سے شاہد احمد دہلوی کے شگفتہ مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔

کرشن چندر کی علمی شخصیت سے وہ بہت متاثر تھے لیکن ان سے ملاقات کے بعد ان کے کیا تاثرات رہے اس کا اظہار انھوں نے ایک واقعہ کے حوالے سے یوں کیا:

''مجمع لگا ہوا ہے۔ مولانا فرداً فرداً سب کا مجھ سے تعارف کرایا۔ جب انھوں نے کرشن چندر کا نام لیا تو میرا دل زور سے ڈھڑکنے لگا اور میں نے بڑی گرم جوشی سے ان سے ہاتھ ملایا۔ یہ کرشن چندر میرے تصور کے کرشن چندر سے بہت مختلف نکلے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ چھ فٹ لمبے تڑنگے، بڑے چَرب زبان جوان ہوں گے۔ مگر وہ کسی قدر پستہ قد اور خاموش آدمی تھے۔ چہرے سے سنجیدگی اور بردباری ٹپکتی تھی۔ بولتے کم تھے مگر دوسروں کی باتوں پر مسکراتے اور ہنستے زیادہ تھے۔ پہلی ملاقات میں ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا''۔ 8

مولانا صلاح الدین احمد شاہد احمد دہلوی سے پانچ سال بڑھے تھے۔لیکن باوجود اس کے ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ان کی شخصیت ان کے نام کی مناسبت سے مختلف تھی۔ان کے حلیہ کا بیان نہایت دلکش اسلوب کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت ہماری نظروں کے سامنے ہو بہ ہو آ جاتی ہے۔مثلاً لکھتے ہیں:

''کوئی تیس سال پہلے مولانا سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو ٹوٹ کر گلے ملے۔کہلاتے مولانا تھے مگر نکلے اَپ ٹوڈیٹ جنٹلمین (Up-to-date gentleman)۔پورا سوٹ مع نکٹائی کے زیب تن تھا۔سرو قد،کھلی پیشانی، غلافی آنکھیں، سواسی ناک، کترواں موچھیں، منڈی ہوئی ڈاڑھی ، لبوں پر مسکراہٹ، چہرے پر ذہانت کا نور، بڑی دل کش شخصیت تھی مولانا کی۔اس پر اُن کا حسن اخلاق سونے پر سہاگہ۔مجھ سے پانچ سال بڑے تھے مگر پہلی ملاقات میں ہم عمروں کی طرح گھل مل گئے''۔ 9

حلیہ نگاری میں شاہد احمد دہلوی کو کمال حاصل تھا وہ انھوں نے نہال سیوہاروی کا حلیہ بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔نہال سیوہاروی بہت دبلے انسان تھے۔ان کا رنگ سانولا تھا۔ڈاڑھی اور مونچھیں صاف تھیں۔ناک قدرے لانبی تھی۔ان سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی حلیہ نگاری یوں کی ہے:

''ایک دن ایک صاحب ملنے آئے۔دبلے پتلے،سانولا رنگ،عمر تیس سال، ڈاڑھی مونچھ صاف، چہرے پر ناک ذرا ضرورت سے زیادہ نمایاں،شیروانی اور علی گڑھ فیشن کا پاجامہ،مسکراتے آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ نہال سیوہاروی ہیں''۔ 10

حکیم جاں کیف ایک نوجوان آدمی تھے۔ان کی شخصیت اتنی خوبرو تھی کہ جو بھی ان سے ملتا ان کی خوبروئی سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔شاہد احمد دہلوی نے پہلی بار دیکھا تو اس نوجوان کے ظاہری

خدوخال سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان سے پہلی ملاقات میں ابھرے تاثر کا بیان بڑے شگفتہ انداز میں کیا ہے:

''یادش بخیر، حکیم ہاشم جان کیف کو میں نے پہلی دفعہ 1930ء میں ایک مشاعرے میں دیکھا۔ کیف کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال کی تھی۔ عجیب طرح دار نوجوان تھا۔ چمپئی رنگ، کشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں، ستوان ناک، ہونٹ گلاب کی پتیاں، جن پر کثرت پان خوری کے باعث لاکھے کی ہلکی سی تحریر، بوٹا سا قد، سر پر ترکی ٹوپی، سیاہ فراک کوٹ، چست پاجامہ، نصف ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ چال میں البیلا پن باتوں میں لگاوٹ، سب کی نظریں اسی طرح دار نوجوان پر پڑ رہی تھیں میں نے بھی اسے دیکھا تو کسی سے پوچھا کہ یہ کون صاحب زادے ہیں؟ بتایا گیا کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے نواسے ہیں''۔ 11

جگر مرادآبادی کی شخصیت جس قدر عظمت والی ہے اسی طرح ان کے ظاہری خدوخال اتنے دلکش نہیں تھے۔ ان سے پہلی ملاقات میں شاہد احمد دہلوی کو مایوسی ہوئی۔ جگر کے حلیہ کا بیان حقیقت پسندی سے کرتے ہوئے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

''کالا گھٹا ہوا رنگ، اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر اُلجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ، چہرہ کے رقبے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور منہ کسی قدر بڑا، کثرت پان خوری کے باعث منہ اُگالدان، دانت شریفے کے بیج، اور لب کلیجی کی دو بوٹیاں، بھرواں کالی داڑھی، ایڈورڈ فیشن کی، سر پر ترکی ٹوپی، آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئی، بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قد وقامت کا اٹاچی کیس، کوئی تیس سال ادھر کا ذکر ہے۔ جھانسی میں ایک صاحب سر جھکائے قدم بڑھائے اپنے دھن میں جھومتے چلے جا رہے

تھے۔ میرے میزبان نے اشارے سے بتایا۔ 'یہ ہیں جگر صاحب' میں نے سنی ان سنی کر دی، ہوں گے کوئی، میں نے کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا تھا''۔12

اس اقتباس سے شاہد کے دلکش اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔ نادر تشبیہات کے حسن سے اپنے اسلوب کی چاشنی میں اضافہ کیا ہے اور حلیہ نگاری پر قدرت اتنی کہ شخصیت اپنے ظاہری خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

میر ناصر علی کی شخصیت سے شاہد احمد دہلوی متاثر تھے۔ ان کے حلیے کا بیان دلچسپ اور مزاحیہ اسلوب کے ذریعہ اس عمدگی سے کیا کہ ان کا حلیہ اپنے خدوخال، اور وضع قطع کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

اللہ بخشے میر ناصر علی دلی کے ان وضعدار شرفا میں سے تھے۔ جن پر دلی کو فخر تھا۔ عجب شان کے بزرگ تھے۔ ''بزرگ'' میں نے انھیں اس لیے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا۔ انھیں بزرگ ہی دیکھا۔ سوکھ کر چمرخ ہو گئے تھے۔ خش خشی ڈاڑھی پیلے تل چاولی تھی۔ پھر سفید ہوگئی تھی۔ کتری ہوئی لبین۔ پوپلا منہ، دہانہ پھیلا ہوا۔ بے قرار آنکھیں۔ ماتھا کھلا ہوا۔ بلکہ گدی تک ماتھا ہی ماتھا چلا گیا تھا۔ جوانی سرو قد ہوں گے۔ بڑھاپے میں کمان کی طرح جھک گئے تھے۔ چلتے تھے تو پیچھے ہاتھ باندھ لیتے تھے۔ مستانہ وار جھوم کے چلتے تھے۔ مزاج شاہانہ وضع قلندرانہ، ٹخنوں تک لمبا کرتا گرمیوں میں موٹی ململ یا گاڑھے کا، اور جاڑوں میں فلالین یا وائلہ کا۔ اس میں چار جیبیں لگی ہوئی تھیں۔ جنھیں میر صاحب کہتے تھے''۔ 13

مولانا عبدالسلام نیازی کی شخصیت کی عکاسی پوری حقیقت پسندی سے کیا ہے۔ ان کے جسمانی محاسن و معائب کا بیان بھی اتنی دلکشی وخوبصورتی کے ساتھ کیا ہے کہ ان کی شخصیت اور حلیہ ہمارے نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

مولانا اپنی وضع قطع سے ریٹائرڈ پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ میں نے انھیں اب سے چالیس سال پہلے قاضی کے حوض پر ایک گندھی کی دکان پر بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ گندھی صاحب بھی کچھ اس گست کے آدمی تھے کہ جو بھی ادھر سے گزرتا اس کی نظر خود بہ خود ان پر پڑتی تھی۔ لحیم شحیم، گوشت کا ایک کالا پہاڑ دکان کے تھڑے پر دھرا دکھائی دیتا تھا۔ رنگ سیاہ، سر خوب گھٹا ہوا، کالی گول ڈاڑھی، سفید سفید آنکھیں ایسی دکھائی دیتی تھیں جیسے تمباکو کے پنڈے میں کوڑیا جڑی ہوئی ہوں۔ کرتا پاجامہ اجلا براق پہنتے تھے۔ یوں ان کا کالا رنگ اور بھی چمک اٹھتا تھا۔ مولانا کا رنگ میدہ وشہاب تھا۔ سر گھٹا ہوا، اس پر چنی ہوئی دو پلی، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، جگر مگر کرتی آنکھیں، کتا راسی ناک، موزوں دہن، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کی سرخی جو پھیل کر باچھوں میں آ گئی تھی۔ داڑھی مونچھ صاف جیسے بھدار کر دیا ہو، گلے میں باریک ململ کا کرتا، آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ پاؤں میں سلیم شاہی، کندھے پر شالی رومال وضع قلندرانہ، مزاج شاہانہ"۔ 14

غرض انھوں نے جتنی شخصیات پر خاکے لکھے ان سے ہوئی اپنی پہلی ملاقات میں ابھرے اچھے برے تمام تاثرات کا ذکر نہایت حقیقت پسندی سے کیا ہے۔ خصوصاً شخصیات کے حلیہ نگاری میں انھوں نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ شخصیات کے ظاہری خدوخال اور وضع قطع کا بیان اس دلکش اسلوب کے ساتھ کیا ہے کہ وہ شخصیت اپنے تمام محاسن و معائب کے ساتھ ہماری نظروں کے امنے گھومنے لگتی ہے۔

شاہد احمد دہلوی نے جن شخصیات پر خاکے لکھے ہیں ان کی عادات واطوار کا ذکر بھی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ان کے پان کھانے کی عادت، موسیقی، شراب نویشی، تیزی سے لکھنا، چائے نوشی، مطالعے کی عادت اس کے علاوہ مشاغل میں کبوتر اڑانا، شکار کھیلنا، گھوڑ سواری وغیرہ عادات و مشاغل کا

بیان دلچسپ انداز میں کیا ہے جس کی وجہ سے شخصیت کی مکمل تصویر ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔میر ناصر علی کو چائے نوشی کی بڑی عادت تھی اوران کا حکم ہوتا تھا کہ تیسرے پہر کے چائے میں گھر کے سارے لوگ جمع ہوجائیں۔ چنانچہ ان کی چائے نوشی کا ذکر بڑے دلچسپ ولطیف انداز میں کیا ہے۔مثلاً لکھتے ہیں:

> ''میر صاحب چائے کے بڑے شوقین تھے۔جس زمانے میں چائے آٹھ آنے پونڈ بکتی تھی۔میر صاحب سر بند چائے پانچ روپے پونڈ سے کم کی نہیں پیتے تھے۔فرماتے تھے کہ اس سے زیادہ کی مجھ میں ہمت نہیں۔جب پیالیوں میں چائے ڈالی جاتی تو کہتے ''سونے کا پانی ہے۔سونے کا پانی'' اور جب اس میں دودھ ڈالا جاتا تو کہتے اوہوہوہو، بادل اٹھ رہے ہیں''۔15

شاہد احمد دہلوی کو واقعہ نگاری پر قدرت حاصل ہے۔واقعات کا بیان اس عمدگی سے کرتے کہ یوں محسوس ہوتا کہ ہم اپنی آنکھوں سے سارا نظارہ دیکھ رہے ہوں۔استاد بیخود دہلوی کو کبوتر اڑانے کا بہت شوق تھا۔اگر کوئی اس کام میں دخل دیں تو وہ آگ بگولہ ہوجاتے تھے۔وہ شاعر بھی بڑے اچھے تھے لیکن نامعقول اشعار پر بگڑ جاتے تھے۔ایک واقعہ کے حوالے سے ان کی بگڑ جانے کی عادت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''استاد کو کبوتر اڑانے کا بہت شوق تھا۔جال اور کابکیس اوپر چھت پر رہتی تھیں۔چھتری چھپکا سب کچھ موجود تھا۔اپنی ٹکڑی اُڑاتے اور دوسرے کبوتر بازوں کی ٹکڑیوں سے لڑاتے اور بڑھے اسکراہ سے ملاقات فرماتے، ایک مہربان اپنے صاحبزادے کو لے کر عین اس وقت پہنچے جب استاد کی جان کبوتروں میں لڑی ہوئی تھی۔بہت مکدر ہوتے، برا بھلا کہتے نیچے آئے۔مہربان نے مٹھائی کی ٹوکری پیش کیا ور بولے 'یہ میرا لڑکا ہے شعر کہتا ہے، اسے شاگردی میں قبول فرمالیجئے۔ٹوکری تو استاد کا پوتا لے کر فوراً اندر چلا گیا، اور استاد نے

فرمایا۔' اپنے کچھ شعر سناؤ' وہ شامت کا مارا نہ جانے کس سے لکھواتا تھا، لگانا موزوں شعر سنانے، بیخود صاحب ایک دم سے بکھر گئے۔' نکل میرے گھر سے۔ باہر نکل'۔ اور گالیوں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ کھڑے کھڑے اسے اور مہربان کو گھر سے نکالا اور کنڈی لگا اوپر جا کر پھر کبوتر اڑانے لگے''۔ 16؎

جمیل جالبی کو گلاب کی بہت پسند تھا، اور لال گلاب تو ان کی کمزوری تھا۔ اگر وہ کہیں لال گلاب دیکھ لیتے تو اس کو چرانا بھی غلط نہیں سمجھتے تھے۔ اگر وہ کبھی سوٹ پہنتے تو اس پر گلاب ضرور لگاتے تھے۔ چنانچہ شائد احمد دہلوی نے ان کی اس کمزوری کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کی ہے۔ فرماتے ہیں:

'' گلاب کا پھول سبھی کو اچھا لگتا ہے۔ خصوصاً کراچی میں کہ کمیاب ہے، ایک دفعہ ایک گل فروش سے سرخ گلاب کا پھول لیا تو اس نے چار آنے دیا۔ گلاب کا پھول جمیل صاحب کی کمزوری ہے۔ بے اجازت توڑ لینے یا اس کے چرا لینے میں مضائقہ نہں سمجھتے۔ جاڑوں میں جب آپ انہیں سوٹ پہنے دیکھیں گے تو دل کے اوپر گلاب لگا ہوا آپ کو ضرور دکھائی دے گا اور اگر کوٹ نہ ہو اور گلاب مل جائے تو اپنی کار کے اسٹیرنگ ہی پر لگا لیں گے''۔ 17؎

شاہد احمد دہلوی نے موضوع خاکہ کی کمزوریوں اور بُری عادتوں کا ذکر بھی بڑی ہمدردی سے کیا ہے۔ لیکن صداقت پسندی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ سعادت حسن منٹو کو شراب پینے کی عادت تھی۔ اس کے لیے ہر کام کرتے تھے۔ شراب ان کی کمزوری بن چکی تھی۔ جب وہ ممبئی میں موجود تھے، وہ خوب پیسہ کماتے تھے اور اس سے خوب شراب بھی پیتے تھے۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد وہ شراب کی ضرورت کو پوری کرنے کے لئے افسانے لکھتے تھے۔ اور پیسہ حاصل کرتے تھے۔ اگر ان کو پینے کے لیے پیسہ نہیں ملتا تو لوگوں کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بھی لے لیتے تھے۔ ان کی شراب نوشی کا ذکر کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

'' منٹو کو شراب پینے کی لت خدا جانے کب سے تھی۔ جب تک وہ دلّی میں

رہے، ان کی شراب بڑھنے نہیں پائی تھی، ممبئی جانے کے بعد انھوں نے پیسہ خوب کمایا اور شراب بھی خوب پی۔ جب پاکستان بنا تو وہ لاہور آگئے۔ یہاں فلموں کا کام نہیں تھا۔ اس لئے انھیں قلم کا سہارا لینا پڑا۔ ہمارے ادب جیسی بنجر زمین سے روزی پیدا کرنا منٹو ہی کا کام تھا۔ صحت پہلے ہی کون سی اچھی تھی۔ رہی سہی شراب نے غارت کردی، کئی دفعہ مرتے مرتے بچے۔ روٹی ملے یا نہ ملے بیس روپے روز انھیں شراب کے لئے ملنے چاہئیں۔ اس کے لئے انھوں نے اچھا بُرا سب کچھ لکھ ڈالا، روزانہ دو ایک افسانے لکھنا ان کا معمول ہوگیا تھا۔ انھیں لے کر وہ کسی جاشر کے پاس پہنچ جاتے۔ ناشروں نے پہلے ضرورت سے انھیں خریدا۔ پھر بے ضرورت۔ پھر منہ چھپانے لگے۔ دور سے دیکھتے کہ منٹو آرہا ہے تو دکان سے ٹل جاتے۔ منٹو کی اب بالکل وہی حالت ہوگئی تھی جو آخر آخر میں اختر شیرانی اور میراجی کی۔ بے تکلف لوگوں کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے اور جو کچھ جیب میں ہوتا نکالیتے۔ اس میں سے گھر کچھ نہیں پہنچتا تھا۔ شراب سے بچنے کی بہت کوشش کی گئی۔ خود منٹو نے اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو پاگل خانے میں داخل کرالیا''۔ 18؎

جگر مرادآبادی کی بری عادتوں کا تذکرہ کرتے وقت شاہد احمد دہلوی نے ان کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں پر روشنی ڈالے، کیونکہ برائی یا بری عادت انسان کو برا اور کمزور بنا دیتا ہے لیکن بری عادت کے باوجود بھی انسان میں مثبت پہلو ہوں تو اس کی شرافت اور انسانیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہی حال جگر کا تھا۔ جگر میں شراب نوشی کے باوجود جو شریف النفسی تھی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے بہت سے ذہین شاعروں کو شراب سے تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے۔ اختر شیرانی، میراجی اور مجاز کا تو آخر میں یہ حال ہوگیا تھا کہ اسٹیج پر نہ صرف قئے کردیتے تھے بلکہ پیشاب بھی کردیتے تھے اور لوگ انھیں اٹھا کر ان کے

ٹھکانوں پر پہنچایا کرتے تھے۔ جگر صاحب اتنے نہیں گرے تھے۔ انھیں پھر بھی ہوش رہتا تھا اور ان کی طرح اول فول بکنے نہیں لگتے تھے۔ ان لوگوں میں اور بہت سی اختلافی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ جن کی وجہ سے لوگ ان سےبھاگنے لگتے تھے جگر صاحب نے کسی کی بہو بیٹی کو نہیں تاکا، کسی سے بھیک نہیں مانگی، تانگے والوں اور چکلے والوں سے انھیں لڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اور پٹتے ہوئے کبھی نہیں پائے گئے۔ ان کی شراب خوری کے نقصانات ان ہی کی ذات تک محدود تھے۔ دوسروں کو ان کا خمیازہ بھگتنا نہیں پڑتا تھا''۔ 19

ایم۔ اسلم کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ وہ گراموفون کے ریکارڈوں کے ذریعے اپنا دل بہلاتے تھے۔ اور جب سے ریڈیو کا آغاز ہوا۔ اس وقت ایک ریڈیو سیٹ کو ہمیشہ اپنے ڈرائنگ روم میں رکھا کرتے تھے، اور حد یہ ہے کہ انھوں نے اکثر افسانوں کو بعض ہلکے پھلکے گانوں سے متاثر ہوکر لکھا تھا۔ ان کے اسی شوق کو ان کے خاکے میں دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے:

''ان کے اکثر افسانوں کی تحریک بعض بہت معمولی گیتوں سے ہوئی ہے۔ مثلاً پنجاب کا کوئی ڈھولک گیت انھوں نے سنا اور دل کو لگ گیا تو اسے پھر سنا۔ کچھ بھولے بسرے مناظر اور ان سے وابستہ تاثرات اُجاگر ہونے لگے۔ ریکارڈ پھر بجایا اور پھر بجایا اور بجاتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک پورا منصوبہ افسانے کا گنٹھ گیا، اور جتنی دفعہ بھی ریکارڈ بجایا کہانی کی تفصیلات پرسے باندھ باندھ کر سامنے آتی رہیں اور بالآخر خیال کے شیشے میں افسانے کی پری اُتر آئی''۔ 20

شاہد احمد دہلوی کو خود بھی موسیقی کا بہت شوق تھا۔ ان کو موسیقی سے اتنا لگاؤ تھا کہ اس کے نتیجے میں انھوں نے سولہ سال کی عمر میں کلاسیکی موسیقی سیکھ لی تھی۔ حالانکہ خاندان مولویوں کا تھا، جہاں گانا بجانا منع ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس شوق میں ایسے مبتلا ہوئے کہ پھر اس سے دور نہ جاسکے۔ اپنے اسی شوق کو اپنے خاکے میں یوں بیان کرتے ہیں:

’’خدا جانے موسیقی کا شوق کہاں سے مجھے لگا۔مولویوں کا خاندان دور دور تک گانے بجانے کا چرچا نہیں۔مگر سنتے آتے ہیں کہ اولیا کے گھر بھوت پیدا ہوجاتے ہیں۔شاید یہی بات ہو، سولہ سال کی عمر سے کلاسیکی موسیقی اچھے استادوں سے سیکھنی شروع کی تھی، خاندان والے ناراض تھے کہ کیا بیہودہ شوق لگایا ہے؟ میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ موسیقی ،اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے آخر حاصل کیا ہوگا؟ اب اندازہ ہوتا ہے کہ اگر میرے پاس یہ موسیقی کا علم وفن نہ ہوتا تو خدا جانے یہاں میرا حشر کیا ہوتا۔ہاں تو 36، سے آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر بھی کرنی شروع کردی تھی۔مگر ایس احمد کے نام سے۔پاکستان آنے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا‘‘۔ 21ے

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہد احمد دہلوی نے اپنے خاکے کے ذریعہ اپنے اس مشغلہ کا ذکر کیا ہے جس سے ان کے اس راز پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے کہ اس موسیقی کی وجہ سے وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے تھے۔اورانھوں نے ایس۔احمد کے نام سے اپنی موسیقی کے پروگرام نشر کیا کرتے تھے۔

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کے ذریعہ نہ صرف ان کی بعض عادات واطوار ومشاغل کا علم ہوتا ہے بلکہ دیگر شخصیتوں کے رہن سہن، عادات واطوار پسند ناپسند اور ذوقو شوق پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح جس شخصیت کو آپ صرف اس کی علمیت وادبیت کی وجہ سے جانتے اس کو مکمل جاننے کے لئے ان کے خاکے بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔

شوکت تھانوی کے خاکے میں بھی انھوں نے ان کی پان نوشی کا ذکر کیا ہے۔کیوں کہ شوکت تھانوی کو بھی پان کھانے کی عادت تھی۔مگر وہ خود کم کھلاتے تھے اور دوسروں کو زیادہ کھلاتے تھے، اور وہ کتاب کی شکل کی پان کی ڈبیا ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔اس میں پان کے تمام لوازمات موجود

ہوتے تھے۔ان کی پان کھانے کی عادت کا بیان بھی جزئیات نگاری کے ساتھ بڑے لطیف پیرائے میں کیا ہے، لحاظہ وہ لکھتے ہیں:

''آخر تک معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اپنی کمائی خرچ کہاں کرتے تھے۔صرف دو چیزیں ایسی دکھائی دیں جن میں انھیں ضرور اپنی گرہ ڈھیلی کرنی پڑتی تھی۔ایک پان اور دوسرے لباس۔ پان وہ کھاتے کم تھے، کھلاتے زیادہ تھے۔انھوں نے ایک بڑی ڈبیا کتاب کی شکل کی بنوائی تھی جس میں پان کا پورا لوازمہ ہوتا تھا۔یہ ڈبیا تقریب بہر ملاقات بطور بہت کامیاب تھی۔ جو اس سے بچ نکلتا اس پر بٹوے سے وار کیا جاتا۔اس میں چھالیا، الائچی، لونگ، جاوتری، منتھال کی ننھی سی شیشی، سبھی کچھ ہوتا تھا۔کہاں تک کوئی بچتا۔مار ہی کھا جاتا۔اس پر غضب ان کی سخن سازی و سخن بازی نوار درام ہو کر ان کا کلمہ پڑھنے لگتا''۔22

اس اقتباس سے شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کے اسلوب کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔انھوں نے پان کی لوازمات کا ذکر عمدگی سے کیا ہے کہ قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ یہاں صفت تجنیس کا استعمال ہوا ہے، مثلاً 'سخن سازی و سخن بازی' اور ساتھ ہی محاورہ کا بھی بڑا عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔

بیخود صاحب کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ان کی یہ عادت اس قدر تھی کہ وہ ہر روز ایک ناول پڑھ لیتے تھے۔ان کے ناول پڑھنے کی عادت کو ایک واقعہ کے ذریعہ مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری شاہد احمد دہلوی کے اسلوب کا قائل ہو جاتا ہے:

''بیخود صاحب کو کتابوں کی چاٹ پڑ گئی تھی۔روزانہ ایک ناول لے جاتے اور اگلے دن واپس کر کے دوسرا لے جاتے، وصی اشرف نے انھیں بڑھیا سے بڑھیا اور گھٹیا سے گھٹیا سارے ہی ناول چٹا دیتے۔مگر بیخود صاحب ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ ''میاں اس میں مزہ نہیں آیا۔کوئی اور دو'' اور وصی اشرف دلی کے جوتے والوں کی طرح اور انھیں ایک توفہ (تحفہ) ناول دیتے اور وہ اسے اپنے

بڑے سے لاکھی رومال میں لپیٹ کر لے جاتے۔ پڑھتے صرف ناول ہی تھے''۔23؎

جمیل جالبی کا مشغلہ بھی پڑھنا لکھنا رہا ہے۔ وہ اپنے ملازمت کے سلسلے میں مصروف ہونے کے باوجود اپنے مطالعے کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ انھوں نے اپنی چھوٹی سی لائبریری بھی بنائی تھی۔ اس لائبریری میں کئی نایاب کتابیں بھی موجود تھیں۔ اسی میں وہ گھنٹوں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ ان کی لائبریری اور پڑھنے کے شوق کا ذکر عمدہ محاوروں کے ذریعہ کیا ہے کہ یہ ان کے اسلوب کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری بھی بنالی ہے۔ جس میں بعض نایاب کتابیں بھی ہیں۔ اس لائبریری میں جم کر بیٹھتے ہیں اور گھنٹوں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ طبع زاد مضامین بھی لکھتے ہیں اور ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ ایلیٹ کے مضامین کا ترجمہ کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ دونوں کی محنت شاقہ کے بعد انھوں نے اس مہم کو سر کیا اور ایک مجموعہ چھپوا کر ہمارے علمی سرمایہ میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ کیا۔ ایسے مشکل کام وہی شخص کر سکتا ہے جو دھن کا پکا ہو۔ اردو کے کلاسیکی ادب کا بھی مطالعہ کرنے کے لیے بڑے صبر وسکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جمیل صاحب اس کی ضخیم جلدوں کو بھی دیمک کی طرح چاٹتے رہتے ہیں''۔24؎

ان تمام اقتباسات کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیتوں کے مشاغل، عادات واطوار، پسند ناپسند اور ذوق وشوق کا ذکر مختلف واقعات کے حوالے سے عمدگی سے کیا ہے کہ ایک طرف ان کی منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے کمال کے باعث سارا واقعہ نظروں میں گھوم جاتا ہے اور دوسرے زبان وبیان کی دلکشی اور حسن کی بدولت ان کا اسلوب پڑھنے والے کو ان کا گرویدہ بنا دیتا ہے، اور قاری مزے لے لے کر ان کی تحریروں کو پڑھتا ہے اور متاثر ہوتا جاتا ہے۔ یہی

شاہد احمد کی تحریروں کی خاصیت ہے۔

شاہد احمد دہلوی نے اپنی بصیرت سے ایسے واقعات کا انتخاب کیا ہے کہ جن سے موضوع خاکہ کی شخصیت کے نمایاں پہلونمودار ہو جاتے ہیں۔انھوں نے معمولی واقعات کے زریعہ سے شخصیت کا بیان کیا ہے۔مولوی نذیراحمد کو ہم سب ایک ناول نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ان کی شخصیت سے متعلق بہت سی باتوں سے بے خبر ہیں مثلاً وہ دوسروں کی مدد کرتے تھے یعنی مسلمانوں کو قرض دے کر ان میں تجارت کا شوق پیدا کرنا چاہتے تھے۔وہ قرض دے کر منافع میں اپنے حصے کی آمدنی بھی لے لیتے تھے۔مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ قرض لینے والوں کا تجارت میں نقصان بھی ہو جاتا تو وہ اسے معاف کر دیتے تھے،اور کبھی ان کی دولت سے منافع کما کر غلط راستہ اختیار کرتا تو خود بھی شرمندہ ہوتے اور اسے سبق سیکھانے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ایک ایسے ہی واقعہ کا ذکر شاہد احمد دہلوی اس عمدگی سے کیا کہ نذیراحمد کی شخصیت ہو بہ ہو اپنی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے،ملاحظہ فرمائے:

> ''ایک دفعہ کسی کو روپیہ ادھار دیا۔اس نے خوب روپیہ کمایا اور کچھ مولوی صاحب کو بھی دیا۔ایک دن مولوی صاحب بازار میں گزر رہے تھے۔سامنے سے ایک اعلیٰ درجے کی فسٹن آئی اور ان کے قریب آکر رک گئی۔اس میں سے وہ صاحب شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے اترے،اور جورنڈی ساتھ تھی اس سے ٹھٹھا مار کر بولے''ان مولوی صاحب کو سلام کرو،یہ سب کچھ انھیں کی بدولت ہے''۔مولوی صاحب کو یہ بات نہایت ناگوار گزری،خون کا سا گھونٹ پی کر چپکے ہو رہے اور گھر آکر پہلا کام یہ کیا کہ موتی ساگر وکیل کو بلایا۔اس شخص کے کاغذات ان کے حوالے کیئے اور اس پر نالش کر دی۔مقدمے نے طول پکڑا اور خوب خوب روپیہ برباد ہوا۔فریض ثانی نے جب یہ دیکھا کہ اب قید ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تو ایک دن آکر مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ لئے،اور ان کے قدموں میں لوٹ گیا،مولوی صاحب نے اسے معاف کر دیا''۔25

اس اقتباس سے نذیر احمد کی ہمدردی اور مدد کرنے کے جذبہ کا علم ہوتا ہے۔شاہد احمد دہلوی کا اسلوب بڑا پرلطف ہوتا ہے جس واقعہ کا بیان کرتے ہیں نہ صرف واقعہ کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے بلکہ اپنی مزاح نگاری سے قاری کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

پروفیسر مرزا محمد سعید نے کبھی بھی پیسوں کے لئے نہیں لکھا تھا، اور کسی کی فرمائش پر بھی نہیں لکھتے تھے۔ جب تک وہ خود نہ چاہے اس وقت تک وہ کچھ بھی نہیں لکھتے تھے۔ چاہے کوئی بھی ان کو کتنا ہی پیسے کا لالچ کیوں نہ دیتے۔ بڑے بڑے پبلشروں نے ان سے لکھوانا چاہا اور بڑی بڑی رقمیں بھی پیش کی گئیں، مگر انھوں نے ان کو ایک لفظ بھی لکھ کر نہیں دیا۔ انھوں نے ایک ناول ''یاسمین'' لکھ کر اپنے شاگرد پبلشر کو بنا کچھ لئے دے دیا تھا، چنانچہ شاہد احمد دہلوی نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کی عکاسی ایک واقعہ کے ذریعہ سے یوں کی ہے:

> ''ایک پبلشر صاحب لاہور سے دلی محض اس غرض سے آئے تھے کہ مرزا صاحب سے ناول لکھوائیں گے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ مرزا صاحب نہیں لکھیں گے، مگر وہ بڑے بڑے مصنفوں کو خرید چکے تھے۔ نہ مانے بولے ہم انھیں ایک ناول کا ایک ہزار روپیہ دیں گے تو وہ کیوں نہیں لکھیں گے؟ یہ وہ زمانہ تھا کہ دوڈھائی سو روپیہ میں اچھا خاصہ ناول پبلشر کو مل جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے اپنے ساتھ لے کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے تعارف کرایا۔ مرزا صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ پبلشر صاحب نے چھوٹتے ہی ناول لکھنے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔آپ میرے ناول کے پانچ ہزار روپئے دے دیں گے دس ہزار دیں گے۔ مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ جو کام کر رہا ہوں اسے چھوڑ کر آپ کے لئے ناول لکھوں۔ پانچ دس ہزار کی بات سن کر پبلشر صاحب کی سٹی گم ہوگئی اور وہ چار منٹ پہلو بدل کر رخصت چاہی''۔26؎

شاہد احمد دہلوی نے اس اقتباس میں مرزا صاحب کی شخصیت کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ یہ ان کے اسلوب ہی کا کمال ہے کہ شخصیت کی تصویر کشی اس خوبی سے کرتے ہیں کہ گویا ہمیں احساس ہونے لگتا ہے کہ ہم ان سے مل چکے ہیں۔

شوکت تھانوی مکھن لگانے کے ہنر سے اچھی طرح واقف تھے۔یعنی کسی کا دل جیتنے کے لیے وہ ایک موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔لہٰذا شوکت تھانوی کی شخصیت کی اس خصوصیت پر ایک واقعہ کے ذریعے سے اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ ان کی شخصیت کی ہو بہ ہو عکاسی ہوئی ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ میں شوکت تھانوی کے پاس ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھا ہوا تھا، باتیں کرتے کرتے شوکت صاحب ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور بولے 'ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے، ذرا نظامی صاحب (اسٹیشن ڈائرکٹر) کو سنا آؤں'۔ وہ لطیفہ سنانے چل دیے۔ میں نے ان کے دوست سے کہا 'اس نے خوشامد کرنے کی حد ہی نہیں رکھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی' انھوں نے کہا 'بھیا یہاں اس طرح کام چلتا ہے، پول سنسنگ بڑی چیز ہے'۔

'یہ نیا لفظ تم نے کیا بولا؟'

'یعنی'

پول سنسنگ'

'بٹرنگ۔مکھن لگانا۔پول سن کا مکھن ہوتا ہے نا؟'

پول سنسنگ ، بٹرنگ ،مکھن لگانا،مکھن بازی کرنا، یہ سارے محاورے اسی زمانے میں وضع ہوتے تھے۔ایک ساحب نے اسی زمانے میں کہا تھا'۔آج بازار میں مکھن ہی غائب ہے'

'کیوں؟ کیا مکھن بھی چور بازار میں چلا گیا؟'

نہیں فلاں صاحب نے فلاں افسر کے لگا دیا سالا'
ایسی باتوں پر ہنسی بھی آتی تھی اور جی بھی جلتا تھا، مگر یہ عام دستور تھا اور شوکت صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا۔ انہوں نے اس کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہو گئے تھے۔ جب عام مقولہ یہ ہو کہ ؎

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

تو پھر کسی ایک کو ہدف ملامت کیوں بنایا جائے؟ ایسا ہی خودی اور خودداری کا اگر خیال ہے تو اپنے گھر بیٹھو یا دنیا چھوڑ دو''۔ 27؎

ان تمام اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہد احمد دہلوی نے ایسے واقعات کا انتخاب کیا ہے جن سے موضوع خاکہ کی شخصیت کے بعض دلچسپ پہلو قاری کے سامنے آجاتے ہیں جن سے ان کی واقفیت نہیں تھی۔

خاکہ نگاری کا پورا دائرہ شخصیت ہی کے اردگرد گھومتا ہے۔ کیونکہ اس کا موضوع ہی شخصیت ہے۔ اسی لئے اس میں شخصیت کی سیرت و کردار کی بعض اہم خصوصیات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنے خاکوں میں شخصیت کی خصوصیات کا بیان اس طرح کیا ہے کہ اس کی خوبیاں اور خامیوں دونوں ہی قاری کے سامنے آجائے یا شخصیت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جوں کا توں قاری کے آگے بے نقاب ہو جائے۔ مثلاً خواجہ حسن نظامی کی شخصیت میں صبر و تحمل بہت تھا۔ انھیں غصہ نہیں آتا تھا اور نہ ہی غرور و تکبر ان میں تھا۔ ان کی اسی خصوصیت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''خواجہ صاحب کو غصہ کبھی نہ آتا تھا۔ نہایت شائستہ اور موٴثر گفتگو کرتے تھے۔ ہر ایک کی سعی سفارش کے لئے جھٹ تیار ہو جاتے اور دامے، درمے، قدمے، سخنے اس کی مدد کرتے۔ غرور ان میں نام کو نہیں تھا۔ ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتے۔ یہاں تک کہ بدخواہوں اور دشمنوں سے بھی''۔ 28؎

علامہ راشد الخیری ضرورت مندوں کی چھپ کر مدد کرتے تھے۔ ان میں مدد کرنے کا جذبہ ایسا

تھا کہ غریبوں اور یتیموں کی جو مدد انھوں نے کی اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ ان کے اسی جذبہ کی ستائش اس طرح سے کی ہے:

''بیواؤں، یتیموں اور غریب رشتہ داروں کی روپے پیسے سے مدد کرتے رہتے تھے اور خاموشی کے ساتھ کہ اس ہاتھ کی خبر اس ہاتھ کو نہ ہوتی تھی، ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ غریبوں اور مسکینوں کا کتنا بڑا حلقہ ان کے سہارے پل رہا تھا''۔ 29؎

منٹو کو اپنی علمیت کا غرور تھا وہ دوسروں کو اپنے سے آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ ان کی اسی خامی کی طرف شاہد احمد اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

''منٹو کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ انھیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا لکھنے والا ہوں، اس لئے وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ ذرا کسی نے ڈون کی لی اور منٹو نے اڑنگا لگایا''۔ 30؎

پروفیسر مرزا محمد سعید شہرت سے بہت گھبراتے تھے وہ اتنے خاموش خدمت گذار تھے کہ خود ان کے زمانے کے اکثر لوگ ان کے ادبی مرتبے سے واقف نہیں تھے۔ ان کی شہرت و نام ونہاد سے دوری کا ذکر کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''اتنے خاموش کہ خود ان کے زمانے کے اکثر لوگ بھی ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے واقف نہیں ہوئے۔ در اصل خود مرزا صاحب شہرت سے گھبراتے تھے اور پبلک پلیٹ فارم پر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کام کرتے تھے، کام کی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر کام کرتے تھے اپنی تسکین کے لیے کام کرتے تھے۔ اس لئے کہ انہیں کام کرنا ہوتا تھا۔ فرمائشی کام انہوں نے ساری عمر نہیں کی''۔ 31؎

جمیل جالبی بڑے خلوص سے جھوٹ بولتے تھے۔ اگر وہ کسی سے وعدہ کرتے ہیں کہ وہ کل

پانچ بجے ضرور ملیں گے۔ مگر وہ نہیں جاتے اور بہانے بناتے تھے۔ ان کی شخصیت کی اس خامی کا بیان شاہد احمد دہلوی نے اس ہمدردانہ نقطہ نظر سے کیا ہے کہ ان کی خامی سے بھی قاری کو پیار ہونے لگتا ہے ،مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''جمیل صاحب بڑے خلوص سے جھوٹ بولتے ہیں، اور جب ان سے باز پرس کی جاتی ہے تو بڑی محبت سے کوئی خوبصورت عذر تراش لیتے ہیں اور ان کے اس بھولپن پر غصے کے بدلے پیار آجاتا ہے۔ وہ وعدہ کرلیں گے کہ میں کل ٹھیک پانچ بجے آپ کے پاس آؤں گا، مگر اگلے دن وہ سرے سے آنے کے ہی نہیں۔

اماں کل کہاں رہ گئے تھے؟

کیا بتاؤں شاہد بھائی۔ سوتا رہ گیا، بیوی سے کہا تھا جگا دینا، وہ بھول گئیں۔

ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

بھئی سب انتظار ہی کرتے رہے، آپ کمانے پر تشریف ہی نہیں لائے؟'

ارے......! بالکل بھول گیا۔ بس دیکھئے یہ حال ہوتا جارہا ہے حافظہ کا''۔ 32

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں بھی مزاحیہ اور شگفتہ اسلوب کا مزہ آتا ہے۔ وہ اپنے مزاحیہ اور دلچسپ اسلوب کے ذریعہ قاری کو شخصیت کے تمام پہلوؤں سے بھرپور واقف کرواتے ہیں نیاز فتح پوری کم آمیز تھے۔ پہلی ملاقات میں لوگوں کو ان سے غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ وہ مغرور ہیں لیکن وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے کم گو اور کم آمیز ہوگئے تھے۔ وہ اپنی تعریف سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کی ان خصوصیات کا بیان شاہد احمد دہلوی یوں کیا ہے:

''نیاز صاحب بہت خاموش طبیعت کے آدمی تھے، کسی قدر لیے دیے بھی رہتے تھے۔ پہلی ملاقات میں لوگوں کو ان کا بہت غلط اندازہ ہوتا تھا۔ عام طور سے لوگ انھیں مغرور سمجھتے تھے۔ بعض نوجوان ان کی کتابیں پڑھ کر بڑی عقیدت سے ان سے ملنے جاتے تھے۔ نیاز صاحب ایک مصروف آدمی تھے۔ انھیں ہر

وقت پڑھنے لکھنے سے کام رہتا تھا۔ پھر اپنی تعریف سن کر انھیں وحشت ہوتی تھی۔ ملاقاتی صاحب اسلام علیکم رسید کر کے معانقہ کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیتے۔ نیاز صاحب ہاتھ سے قلم رکھتے۔ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے اور سخت اکراو کے ساتھ ہاتھ بڑھاتے۔ وہ صاحب اپنے دونوں ہاتھوں سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان کے نرم و نازک ہاتھ کو ملتے و لتے اور اس عمل سے فراغت پا کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر مل کر سامنے کرسی پر ڈٹ جاتے''۔ 33

میراجی مذہبی نہیں تھے۔ مزہب سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ ان کو مسلمان اس لیے کہا جاتا تھا کیوں کہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر شاہد احمد یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''مذہب سے میراجی کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہندو ضمیات سے انھیں شغف تھا۔ اسی کا رچا بچا تصور ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ بس مسلمان اس لئے تھے کہ ایک مسلمان کے ہاں پیدا ہو گئے تھے۔ جو شخص اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرنا بھی ضروری نہ سمجھتا ہو وہ بھلا مذہبی قید و بند کو کیسے گوارا کر لیتا۔ میراجی کے تو دل اور دماغ دونوں ہی کافر تھے''۔ 34

میراجی کی شخصیت کے اس تاریک پہلو کی حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا گیا کہ اس سے شاہد احمد دہلوی کی خاکوں کی غیر جانبداری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

خاکہ نگاری کی اہم صفت غیر جانبداری ہے، کیونکہ خاکے میں شخصیتوں کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تب ہی شخصیت پوری طرح سے ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اگر اس کے برخلاف شخصیت کے بیان میں مبالغہ سے کام لیں تو شخصیت کی بھرپور عکاسی ممکن نہں ہوسکتی ہے۔ چنانچہ شاہد احمد دہلوی نے میراجی کی شخصیت کی بعض خامیوں کو غیر جانبداری سے یوں پیش کیا ہے:

''میراجی بڑے گندے آدمی تھے۔ وہ ان میں سے تھے جو کہتے ہیں کہ یا

نہلائے دائی یا نہلائیں چار بھائی۔ انھیں کبھی کسی نے نہاتے نہیں۔ دیکھا، بلکہ نہ دھوتے بھی نہیں دیکھا۔ بال کٹوانے کے بڑے چور تھے۔ وحشیوں کی طرح ہمیشہ بڑھے رہتے۔ اوران میں کبھی تیل نہ ڈالتے اور نہ انھیں بناتے۔ جب دلی آئے تھے تو موچھیں بھی مونڈ ڈالی تھیں۔ ایک دفعہ جانے دل میں کیا سمائی کہ چار ابر دکا صفایا کر گلے میں سادھوؤں کی سی کنٹھی بھی ڈال لی تھی۔ ہمیشہ سنجیدہ صورت بنائے رہتے تھے۔ انھیں قہقہہ مار کر ہنستے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ باتیں اکثر ہنسنے ہنسانے کی کرتے مگر خود کبھی نہ ہسنتے تھے۔ بہت خوش ہوتے تو خندہ دندان نما فرمایا۔ ان کے نچلے پن سے بڑی گھن آتی تھی۔ مگر یہ ان گھناؤنی چیزوں میں سے تھے جنھیں اپنے سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی قلندرانہ اور حرکتیں مجذوبانہ، دو چار آدمیوں مل کر ایک کمرہ کہیں باڑے کی طرف لے رکھا تھا مگر رات کو اگر کہیں گھاس میں پڑ رہے تو وہیں سو گئے اور اگر پڑی پر لیٹ گئے تو وہیں صبح ہوتی۔ ایک دو دن نہیں برسوں یہی حال رہا''۔35

منٹو نے بھی میراں جی کی شخصیت کی ہو بہو تصویر کھینچی تھی، یہاں شاہد احمد دہلوی جس انداز میں میراں جی کی شخصیت کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس سے ان کی شخصیت کی ان خامیوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ اور خاکہ نگار کی غیر جانبداری کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

شوکت تھانوی کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کے بارے میں شاہد احمد دہلوی نے یہ بتایا کہ ان کے دوست بنانے کا انداز بہت الگ تھا جنھیں دوست بنایا دوستی نبھائی۔ لیکن بنا کسی فائدے وہ کسی سے دوستی بھی نہیں رکھتے تھے، مثلاً لکھتے ہیں:

''جن سے دوستی کا رشتہ قائم کر لیتے تھے ان سے متعلقات میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ مگر وہ دوست صرف انھیں بناتے تھے جن سے انھیں فائدہ پہنچتا تھا یا فائدہ پہنچنے کی امید ہوتی تھی''۔36

منٹو کو بناوٹ سے چڑ تھی کیوں کہ ان کا ظاہر اور باطن دونوں ایک سا تھا۔ وہ منہ پھٹ اور صاف گو واقع ہوئے تھے ان کی اس کمزوری کا ذکر غیر جانبداری سے یوں کر دیا ہے:

''دراصل منٹو کو بناوٹ سے چڑھ تھی۔ خود منٹو کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اس لئے لگی لپٹی نہ رکھتا تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا صاف کہہ دیتا، بلکہ منٹو بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ تھا۔ ایک دفعہ احمد شاہ بخاری نے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا دیکھو منٹو میں تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں منٹو نے کہا'' مگر میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا''۔ 37

منٹو کی صاف گوئی گستاخی کی حد تک تھی ان کی شخصیت کے پہلو کی نشاندہی شاہد احمد دہلوی نے بخوبی سے کیا ہے۔

جمیل جالبی وقت کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ ہر کام میں گھنٹہ آدھا گھنٹہ دیر۔ ایک واقعہ کے حوالے سے ان کی شخصیت کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے کہ ان کی شخصیت ہو بہو ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے اقتباس ملاحظہ فرماتے:

''جمیل صاحب وقت کی پابندی نہیں کرتے۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ لیٹ ہونا ان کا معمول ہے۔ چنانچہ اب میں ان کے لئے اتنا مارجن رکھتا ہوں۔ اگر مجھے اور انہیں ساتھ جانا ہوتا ہے تو وہ نہایت وثوق کہتے ہیں۔ میں آجاؤں گا آپ کے پاس میں عرض کرتا ہوں۔ جی نہیں میں آؤں گا آپ کے پاس۔ میں وقت پر مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے ان کے گھر پہنچا تا ہوں۔ بجلی کی گھنٹی کا بٹن دبا تا ہوں۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے آتے ہیں اور بیٹھک کا دروازہ کھولتے ہیں آئیے بس ایک منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں، پندرہ منٹ کے بعد برآمد ہو کر کہتے ہیں ایک پیالی چائے کی پی لیں، بس چلتے ہیں۔ الیکٹرک ریزر ہاتھ میں لیے چلے آتے ہیں۔ یہیں شیو بنالوں۔ آپ اکیلے بیٹھے ہیں۔ کہہ کر ریزر کا پلگ لگاتے ہیں اور

چہرے پر استری سی کرنے لگتے ہیں۔ابھی بہت دیر ہے۔دیکھ لیجئے گا وہاں کوئی نہیں آیا ہوگا۔لوگ وقت کی پابندی ہی نہیں کرتے اور خدا دنداں نما کے ساتھ ان کے رخساروں پر سینکڑوں ننھے ننھے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں شیو ختم ہوگیا، پلگ نکالا اور ریزر میز پر رکھتے ہوئے بولے۔آپ بھی اسی سے شیو کیا کیجئے۔نہ صابن نہ پانی، چاہے بستر پر لیٹے لیٹے شیو بنالیں،بس ابھی آیا۔دس منٹ پھر گزر گئے۔ملازم نے دو پیالیاں چائے کی لاکر میز پر رکھ دیں۔پھر سگریٹ کا ڈبہ رکھ گیا۔جمیل صاحب ڈھلا ہوا جوڑا اور دودھیا اچکن پہنے نمودار ہوتے ہاتھ میں پانوں کی تھالی''معاف کیجئے کچھ دیر ہوگئی''۔میں نے کہا کہ جلدی سے نہا کر کپڑے بدل لوں۔ارے آپ نے چائے نہیں پی؟ ٹھنڈی تو نہیں ہوگئی۔پیالی کو ہاتھ لگا کر''نہیں، ابھی گرم ہے۔دیکھ لیجئے گا سب سے پہلے ہم ہی پہنچیں گے۔پان لیجئے۔اور یہ سگریٹ دیکھیے کیسا ہے۔ایک صاحب ترکی سے لائے تھے۔آیئے چلیں'' چلئے صاحب۔ان کی کار میں جا کر بیٹھے۔اس کار کو چلا چلا کر انھوں نے اس کا پالیتھین نکال دیا ہے۔اس کی گڈیاں پھٹ گئی ہیں،اور جگہ جگہ اس میں بسرے بدھیاں لٹکی ہوئی ہیں۔

''اماں اس گاڑی کو تو بدلو۔یہ کیا نیتی لگا رکھی ہے تم نے؟

''جی ہاں، بدل رہا ہوں، چھوٹی کار مل رہی تھی مجھے۔میں نے لینے سے انکار کر دیا۔غلطی کی۔اب بڑی کار دو سال بعد ملے گی۔جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو دیکھا کہ آدھا جلسہ ختم ہو چکا ہے۔کمال کر دیا ان لوگوں نے آج سب وقت پر آپہنچے۔اچھا یوں آگئے ہوں گے کہ مہمان خصوصی غیر ملکی ہے۔خیر آیئے یہیں بیٹھ جاتے ہیں''۔ 38

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاہد احمد دہلوی نے شخصیت کے

بیان میں غیر جانبداری سے کام لیا ہے انھوں نے جہاں شخصیتوں کی خوبیوں کا بیان کیا ہے وہیں ان کی خامیوں اور کمزوریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ جمیل جالبی کی وقت کی پابندی نہ کرنا حکیم کیف دہلوی کی عیاشی، اور میر ناصر علی کی بے جا ضد وغیرہ کا بیان بڑے دل کش انداز میں کیا ہے کہ وہ شخصیتیں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے نمودار ہو جاتی ہیں۔

ایک طرف شاہد احمد دہلوی کا مزاحیہ اسلوب ان کی تحریر کو پر لطف بنا دیتا ہے تو دوسرا فنی کاریگری و چابکدستی سے خاکہ نگاری کے تمام لوازمات کو اتنے عمدہ طریقے سے بیان کرتے ہیں کہ شخصیت کی بھرپور عکاسی کے ساتھ اس کا عہد اور اطراف و اکناف کا ماحول بھی زندہ اور متحرک نظر آتا ہے۔

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا اندازہ اتنا دلفریب اور پرکشش ہوتا ہے کہ قاری کو ذرا سی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا، انھوں نے تشبیہات، استعاروں اور محاوروں کے علاوہ صفت تکرار، صنعت تضاد، اور تجنیس وغیرہ کا بھی استعمال کر کے اپنے اسلوب کے حسن میں اضافہ کیا ہے واقعہ نگاری میں انھیں کمال حاصل ہے۔ جس واقعہ کا بیان کرتے ہیں اس کی سچی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ منظر کشی ہو یا جزئیات نگاری ان کی زبان دانی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا، غرض شاہد احمد دہلوی نے اپنے خاکوں میں پر لطف اور مزاحیہ اسلوب کے ذریعہ شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ اپنی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ موضوع خاکہ کی شخصیت سے ہمارا مکمل تعارف ہوتا ہے۔ یہی ان کے اسلوب کا کمال ہے۔

☆☆☆

حواشی

1۔ صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری، ص:283

2۔ فیض احمد فیض، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ساقی بک ڈپو، دہلی، 2000، ص:83

3۔ مولوی نذیر احمد دہلوی، مشمولہ گنجینہ گوہر، ص:12

4۔ جگر مرادآبادی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:130

5۔ مرزا عظیم بیگم چغتائی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:95

6۔ مولانا عنایت اللہ، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:83

7۔ شوکت تھانوی، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ص:61)

8۔ کرشن چندر، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ص:139)

9۔ مولانا صلاح الدین احمد، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ص:107

10۔ نہال سیوہاروی، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ص:217

11۔ حکیم کیف دہلوی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:138

12۔ جگر مرادآبادی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:123)

13۔ میر ناصر علی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:23)

14۔ مولانا عبدالسلام ندوی، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ص:49)

15۔ میرے ناصر علی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:31

16۔ استاد بیخود دہلوی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:51

17۔ جمیل جالبی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:211

18۔ منٹو، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:126

19۔ جگر مرادآبادی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:135

20۔ ایم۔ اسلم، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:166

21ے شاہد احمد دہلوی، مشمولہ، گنجینۂ گوہر، ص:227

22ے شوکت تھانوی، مشمولہ، بزم خوش قصاں، ص۔70

23ے استاد بیخود دہلوی، مشمولہ، گنجینۂ گوہر، ص:41)

24ے جمیل جالبی، مشمولہ، گنجینۂ گوہر، ص:203

25ے مولوی نذیر احمد دہلوی، مشمولہ، گنجینۂ گوہر، ص:18

26ے پروفیسر مرزا اصمد سعید، مشمولہ، گنجینۂ گوہر، ص:143

27ے شوکت تھانوی، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ص:69

28ے خواجہ حسن نظامی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:59

29ے مولوی عبدالحق، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ص:48

30ے منٹو، مشمولہ، گنجینۂ گوہر، ص:122

31ے پروفیسر مرزا محمد سعید، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:142

32ے جمیل جالبی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:213

33ے مولانا نیاز فتح پوری، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ص:79

34ے میرا جی، مشمولہ، گوہر، ص۔:116

35ے میراں جی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:114

36ے شوکت تھانوی، مشمولہ، بزم خوش نفساں، ص:68

37ے منٹو، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:123

38ے جمیل جالبی، مشمولہ، گنجینہ گوہر، ص:214

☆☆☆

سعادت حسن منٹو (پیدائش 1912۔وفات 1955)

سعادت حسن منٹو اردو ادب میں منٹو کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ اردو ادب میں ایک منفرد افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے معاصر افسانہ نگاروں کی روش سے انحراف کرتے ہوئے منفرد لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔

منٹو کے والد کا نام خواجہ غلام حسن تھا۔ ان کی دو بیویاں تھیں پہلی بیوی کے بطن سے نو اولاد ہوئیں ان میں تین لڑکے اور چھ لڑکیاں تھیں۔ دوسری بیوی کا نام سردار بیگم تھا۔ ان کی تین اولاد ہوئیں۔ جن میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ اس لڑکے کا نام منٹو تھا۔ منٹو 11 رمئی 1912ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام سعادت حسن اور منٹو قلمی نام تھا۔ ان کے فرضی ناموں میں مفکر، کامریڈ، آدم، وٹنم (وٹنم کے حروف الٹ دینے سے منٹو ہو جاتا ہے) وغیرہ ہیں۔

منٹو نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور 1921ء میں ایم اے او، (M.A.O.) ماڈل اسکول میں چوتھی جماعت میں داخلہ لیا، انھوں نے دسویں جماعت تین بار فیل ہونے کے بعد پاس کیا، 1931ء میں میٹرک امتحان پاس کیا۔ 1935ء میں آگے کی تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر بیماری کی وجہ سے آگے کی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔

منٹو نے کئی ملازمتیں اختیار کیں۔ انھوں نے ہفت روزہ اخبار ''پارس'' کے مدیر کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ہفت روزہ 'مصور' کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ان کی شادی 26 راپریل 1939ء

کوکشمیر کے ایک باعزت گھرانے میں ہوئی۔ان کی بیوی کا نام ’صفیہ‘ تھاان کا اکلوتا بیٹا عارف تھا جو بعد میں وفات پا گیا۔ان کی تین لڑکیاں ہیں۔

منٹو کو بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ تھا۔ان کی ادبی زندگی کے رہنما باری علیگ اور اختر شیرانی تھے۔ان کی پہلی تحریر بھی باری علیگ ہی کی زیرِادارت شائع ہونے والے اخبار ’مساوات‘ میں شائع ہوئی تھی۔اس طرح منٹو نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مساوات میں کالم نگاری کے ذریعے کیا۔

منٹو کے افسانوی مجموعوں میں آتش پارے، دھواں، لذتِ سنگ، سیاہ حاشیئے ، چغد، ٹھنڈا گوشت ، خالی بوتلیں ، خالی ڈبے، یزید ، بادشاہیت کا خاتمہ، نمرود کی خدائی، کھول دو، سڑک کے کنارے، سرکنڈوں کے پیچھے، پھندنے وغیرہ ہیں، اس کے علاوہ منٹو کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ’’منٹو کے مضامین‘‘ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

منٹو نے افسانوں کے علاوہ مزاحیہ مضامین ،ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، اور خاکے بھی لکھے ہیں۔منٹو کے افسانوں کے بعد جو چیز سب سے زیادہ مقبول ہوئی ہے وہ ان کے خاکے ہیں۔منٹو کے خاکوں کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ’ گنجے فرشتے‘ ہے ، جو 1952ء میں شائع ہوا، ان کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ’’لاؤڈ اسپیکر‘‘ ہے جو 1955ء میں شائع ہوا اور تیسرا مجموعہ ’فلمی شخصیتیں‘ کے عنوان سے 1956ء میں منظر عام پر آیا۔منٹو نے اپنے خاکوں کا پہلا مجموعہ ’’گنجے فرشتے،‘‘ کا نام کیوں رکھا ہے اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ’’ میں نے بہت سوچا تھا کہ ان مضامین کے مجموعے کا نام میں نے ’’گنجے فرشتے‘‘ کیوں رکھا ہے۔اب یہ سطور لکھتے لکھتے اس کی وجہ تسمیہ معلوم ہوگئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بتایا ہوا نسخہ ہرگز ہرگز مجرب نہیں ہے اور لوگ اپنی کمزوریاں دور کرنے کے لئے ضرور محلّہ پیر گیلا نیاں کے غلام محمد ہی کی گولیاں خریدینگے، اور انجام کار سیالکوٹ کے کسی چوراہے میں کھڑے ہو کر مجھے نیر بانو

کے پرانے یا نئے سینڈل سے اپنا سر گنجا کرنا پڑے گا''۔1

منٹو کی اس وضاحت سے یہ علم ہوتا ہے کے انھوں نے شخصیات کی خوبیوں کے ساتھ ان کی خامیوں کا بیان بھی حقیقت نگاری سے کیا ہے، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت نگاری اور غیر جانبداری ان کے خاکوں کا خاص وصف ہے۔اس کے علاوہ خاکہ نگاری کے تمام فنی خصوصیات کا استعمال پوری صداقت اور فنی چابکدستی سے کیا ہے۔خاکہ کا پہلا وصف یہ ہے کہ خاکہ نگار موضوع خاکہ سے اپنی پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کا بیان کیا ہے مثلاً بابوراؤ پٹیل سے ان کی پہلی ملاقات مبارک بلڈنگ کے دفتر میں ہوئی تھی۔اور وہ خیال کرتے تھے کہ بابوراؤ، انگریزی بڑی صاف ستھری لکھتے تھے۔اس طرح سے انگریزی صاف لکھنے والا شخص دبلا پتلا اور تیکھے نقشوں والا آدمی ہوگا مگر بابوراؤ پٹیل سے ملنے کے بعد ان کا تصور غلط ثابت ہوا کیوں کہ منٹو پر اس ادیب کی تحریروں کا بڑا اثر تھا۔ اوصاف و شفاف انداز بیان جب کہ ادیب کی چہرے کی بناوٹ اور لب و لہجہ دیکھا تو بابوراؤ پٹیل سے پہلی ملاقات کے وقت ابھرنے والے تاثر کا بیان دلچسپ انداز میں کیا ہے:

'' مبارک بلڈنگ کے اس وسیع و عریض دفتر میں بابو راؤ سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔اس وقت تک ''فلم انڈیا'' کے غالباً ساتھ آٹھ شمارے نکل چکے تھے۔جو میں 'مصور' کے دفتر میں دیکھ چکا تھا اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ میرا خیال تھا ایسی ستھری انگریزی لکھنے والا اور نوکیلے طنز کا مالک دبلا پتلا اور تیکھے نقشوں والا آدمی ہوگا، مگر جب میں نے ایک جاٹ کو ایک جہازی میز کے پاس گھومنے والی کرسی پر بیٹھے دیکھا تو مجھے سخت ناامیدی ہوئی، اس کے چہرے کا کوئی نقش، کوئی خط ایسا نہیں تھا، جس میں اس کے قلم کا ہلکا سا عکس بھی نظر آ سکے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چوڑا چکلا چہرہ، موٹی ناک بڑا واہیات لب دہان، دانت بدنما۔۔لیکن پیشانی بڑی۔جب وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے اٹھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے اونچا ہے۔یعنی کافی دراز قد ہے۔مضبوط ڈیل ڈول، لیکن جب

اس نے ہاتھ ملایا تو گرفت بڑھی ڈھیلی اور جب اس نے اردو میں بات چیت شروع کی تو میرا سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ گنواروں کا سالب ولہجہ، بات بات میں بمبئی کے موالیوں کی طرح ''سالا'' کہتا تھا اور گالیاں بکتا تھا''۔2

بابوراؤ پٹیل کی ظاہری شخصیت اور ان سے پہلی ملاقات میں منٹو متاثر نہ ہوسکے، بابوراؤ پٹیل ہی کی طرح وہ آغا حشر کاشمیری سے بھی بے حد متاثر تھے، آغا حشر کاشمیری سے پہلی بار پنڈت محسن کے صحن میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے صحن میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان میں ایک کونے میں ایک عجیب آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے حلیے اور خدوخال کے علاوہ لباس اور ظاہری شخصیت کو دیکھا تو منٹو کو عجیب لگا اور جب علم ہوا کہ وہ آغا حش کاشمیری ہیں تو منٹو کو دھکا سا لگا۔ آغا حشر سے پہلی ملاقات کے تاثر کا بیان کرتے ہوئے منٹو لکھتے ہیں:

''باہر صحت میں کرسیوں پر بھی کچھ آدمی بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں تخت پر پنڈت محسن بیٹھے گڑگڑی پی رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک عجیب وغریب آدمی میری نگاہوں سے ٹکرایا۔ چیختے ہوئے لال رنگ کی چمکدار سائن کا لاچا، دو گھوڑے کی بوسکی کی کالروالی سفید قمیص، کمر پر گہرے نیلے رنگ کا پھندنوں والا ازار بند، بڑی بڑی بے ہنگم آنکھیں ۔۔۔ میں نے سوچا کڑہ گھنیاں کا کوئی پیر ہوگا، لیکن فوراً ہی کسی نے اس کو آغا صاحب کہہ کر مخاطب کیا مجھے دھکا سا لگا۔

ہری سنگھ نے بڑھ کر اس عجیب وغریب آدمی سے مصافحہ کیا، اور میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ 'میرے دوست سعادت حسن منٹو آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے''۔3

منٹو نے آغا حشر سے ملاقات کے بیان میں ان کی بہترین حلیہ نگاری اور تصویر کشی کی ہے کہ آغا حشر کی تصویر ہوبہو نظروں میں گھوم جاتی ہے، اس طرح منٹو نے اپنے ایک خاکے میں دیوان سنگھ مفتون سے پہلی ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے دیوان سنگھ مفتوں سے پہلی بار وہ انھیں کے دفتر میں

ملے تھے انھوں نے بڑی گرم جوشی سے ان سے ملاقات کی۔ باوجود اس وقت وہ ان سے زیادہ متاثر نہ ہوئے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب وہ نہ آئے تو میں چلا گیا۔ شام کو آیا تو وہ دفتر میں موجود تھے۔ سر پر چھوٹی سی سفید پگڑی۔ قلم انگلیوں میں دبائے کچھ لکھ رہے تھے۔ چشمے کے شیشوں کے پیچھے آنکھیں ایک عجیب انداز میں اوپر کر کے مجھے دیکھا اور یوں اچھلے جیسے ربڑ کی ٹھوس گیند اچھلتی ہے۔ مجھ سے گھٹ گھٹ جھپیاں پائیں۔ یعنی بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے اور کہا' مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے تھے۔ میں ایک ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا''۔

مجھے بیٹھنے کو کہا۔ بمبئی کے حالات پوچھے۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے متوجہ تو ضرور ہیں لیکن ان کا دماغ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے ٹیلی فون کا ریسور اٹھایا اور نمبر ملا کر دوسرے والے سے کہا۔ میں صندر لال بول رہا ہوں نئی دہلی سے لالہ۔۔۔۔ ہیں؟۔۔۔۔ کہاں گئے ہیں۔۔۔۔؟ اچھا۔۔۔۔!''۔

آپ کا دفتر پرانی دلی میں تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صندر لال نہیں بول رہا تھا دیوان سنگھ مفتون بول رہا تھا۔ دوران گفتگو میں آپ نے کئی مرتبہ اس طرح مختلف نمبر ملائے اور جعلی ناموں سے لالہ۔۔۔۔۔ کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔۔۔ معلوم نہیں کیا چارسوبیسی تھی۔ لیکن مجھے اتنا یقین تھا کہ اس لالے کی شامت آگئی ہے یا عنقریب آنے والی ہے۔

ٹیلی فون کے ذریعے سے جب کچھ پتہ چلایا نہ چلا تو انھوں نے سولہویں مرتبہ مجھے بیئر کی دعوت دینے کے بعد اپنے خاص آدمی (غالباً سردار وایام سنگھ) کو آواز دے کر بلایا۔ اس کے کان میں ہولے سے کچھ کہا اور رخصت کر دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ہاں منٹو صاحب تو بیئر منگواؤں آپ کے لئے'

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ’سردار صاحب زبانی جمع خرچ آپ نے آخر سیکھ ہی لیا
دلی والوں سے منگوائیے۔ منگواتے کیوں نہیں۔
یہ سن کر دیوان صاحب خوب کھل کر ہنسے اور اہالیان یوپی کو بے نقط سنانے
لگے‘‘۔4

اس اقتباس سے دیوان سنگھ مفتون سے پہلی ملاقات کے تاثرات کے ساتھ ساتھ منٹو کی شگفتہ مزاجی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

انھوں نے پہلی ملاقات میں ابھرے والے تاثرات کے علاوہ موضوع خاکہ کی حلیہ نگاری بھی بہترین انداز میں کی ہے مثلاً اختر شیرانی سے پہلی ملاقات کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کے حلیے کا بیان بھی لطیف انداز میں کیا ہے:

’’دس بارہ آدمی بیٹھے تھے جو میرے جانے پہچانے تھے، صرف ایک صورت اجنبی تھی اور وہ اختر شیرانی کی تھی چپٹا چہرہ ، سپاٹ پیشانی ، موٹی ناک، موٹے ہونٹ، گہرا سانولا رنگ، چھدرے بال، آنکھیں بڑی اور پرکشش، ان میں تھوڑی سی اداسی بھی تھی۔ بڑی شستہ و رفتہ اردو میں حاضرین سے گفتگو کر رہے تھے‘‘۔5

باری علیگ سے منٹو بے حد متاثر تھے۔ باری علیگ کی شخصیت کے ظاہری خدوخال متاثر کن نہیں تھے۔ ان کے حلیے کا بیان حقیقت پسندی سے کرتے ہوئے ان کے حلیہ کو دلکش تشبیہ کے ذریعہ عمدہ انداز میں کیا ہے:

’’موٹا موٹا گول چہرہ سیاہی مائل گندمی رنگ، بہت بڑا سر، متوسط کالے کالے ہونٹ، مسوڑے بھی کالے مگر جب ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی تھی تو آس پاس کے تمام خط و خال اپنی سیاہ قبا اتار پھینکتے جو عدالتوں کی سی خشک سنجیدگی اور متانت کا باعث ہوتی تھی۔ صرف ان مسکراتے ہوئے لمحات کی

رصد گاہوں میں وہ اپنے ستاروں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ صرف انہی لمحات میں ان کے مسلسل مطالعے سے اکتائے ہوئے یہ ستارے بھی تھوڑی دیر کے لیے مسکرا لیتے تھے''۔6

نور جہاں فلم انڈسٹری کی مشہور و معروف شخصیت ہے۔ وہ اپنے زمانے کی مشہور گلوکارہ تھی۔ اس کی شکل و صورت عام تھی اس میں کسی طرح کی دلکشی نہیں تھی ان کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو اس کی آواز تھی، اسی آواز جس سے منٹو متاثر تھے چنانچہ ان کی سریلی آواز کا بیان دلچسپ تشبیہہ کے ذریعہ منٹو یوں بیان کرتے ہیں:

''نور جہاں ان دنوں فلم بین لوگوں کے لئے ایک فتنہ تھی۔ قیامت تھی، لیکن مجھے اس کی شکل و صورت میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ ایک فقط اس کی آواز قیامت خیز تھی، سہگل کے بعد میں نور جہاں کے گلے سے متاثر ہوا۔ اتنی صاف و شفاف آواز، مرکیاں اتنی واضح، کھرج اتنا ہموار، پنچم اپنا نوکیلا، میں نے سوچا، اگر یہ لڑکی چاہے تو گھنٹوں ایک سُر پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ اسی طرح جس طرح بازیگر تنے ہوئے رسے پر بغیر کسی لغزش کے کھڑے رہتے ہیں''۔7

ان تمام مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منٹو نے اپنے خاکوں میں شخصیتوں سے پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کے علاوہ ان کے حلیہ کا بیان بھی عمدہ انداز میں کیا ہے۔ ان کا اور انداز بیان دلچسپ اور پرلطف ہوتا ہے۔ اور وہ شخصیت کے خدوخال کی عکاسی اس عمدگی سے کرتے ہیں کہ موضوع خاکہ سے نہ صرف ہماری ملاقات ہوتی ہے بلکہ وہ ہو بہو ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے، یہی ان کے خاکوں کا کمال ہے۔

منٹو نے اپنے خاکوں میں شخصیات کی عادات واطوار کا بیان بھی کیا ہے۔ منٹو نے شخصیتوں کی ایسی عادتوں کو جو دوسروں سے ذرا مختلف تھیں اپنے خاکوں کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

عصمت چغتائی کی ایک عجیب عادت تھی کہ انھیں برف کے ٹکڑے کھانے کا بہت شوق تھا۔منٹو نے ان کی اس عادت پر پُر لطف انداز میں روشنی ڈالی ہے۔مثلاً لکھتے ہیں:

''عصمت چغتائی کو برف کھانے کا بہت شوق ہے، بالکل بچوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لئے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹتی رہتی ہے۔اس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا کر لکھے ہیں۔ چار پائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی ہے۔ سامنے تکیے پر کاپی کھلی ہے۔ایک ہاتھ میں فاؤنٹین پن ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی، ریڈیو اونچے سروں میں چلا رہا ہے مگر اس کا قلم اور منہ دونوں کھٹا کھٹ چل رہے ہیں''۔8

باری علیگ کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ لکھتے وقت اپنے دانتوں کو رگڑتے تھے۔ان کی اس عادت سے لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی تھی کہ وہ بہت غصّہ میں ہیں۔ چنانچہ ان کی اس انوکھی عادت کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے،مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ابھی ابھی جب میں نے تصور میں انھیں لکھتے دیکھا تو وہ اپنے دانت رگڑ رہے تھے، باری صاحب کی عادت تھی، لکھنے کے دوران میں وہ اپنے دانت ضرور کٹکٹاتے تھے، جیسے غصّے میں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گول گول حروف لکھتے تھے۔ اتنے گول کہ بعض اوقات میرے لئے ان کی عبارت کے اکثر لفظ ایک دوسرے کے قوام ہوئے تھے''۔9

منٹو نے اپنے خاکوں میں موضوع خاکہ سے جذباتی لگاؤ کا ذکر بھی کیا ہے مثلاً منٹو کو فلمی ستارے شیام سے بہت لگاؤ تھا۔ یہ لگاؤ اس قدر تھا کہ ان کی موت کی خبر سن کر وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ ان کی کیا کیفیت تھی۔اس کا بیان انھوں نے اپنے خاکے میں یوں کیا ہے:

''اپریل کی تیس یا چوبیس تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ پاگل خانے میں شراب چھوڑنے کے سلسلے میں زیر علاج تھا کہ شیام کی موت کی خبر ایک اخبار میں

پڑھی۔ان دنوں ایک عجیب وغریب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوش مندی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہنچتا ہوں۔دونوں سرحدیں کچھ اس طرح آپس میں گڈ مڈ ہوگئی تھیں کہ میں خود کو 'نومینز لینڈ' میں بھٹکتا محسوس کرتا تھا''۔10؎

منٹو اپنے خاکوں میں شخصیات کی صفات کی عکاسی کرتے وقت منظر نگاری سے بھی کام لیا ہے،مثلاً مشہور فلمی اداکار اشوک کمار کی عادتوں کا ذکر کراتے ہوئے انھوں نے ان کی سادگی اور شرافت کا ذکر بھی،منظر نگاری کے ذریعے کیا ہے۔مثال دیکھئے:

''پردے پر وہ مجھے چاکلیٹ ہیرو معلوم ہوتا تھا۔مگر جب میں نے اس کو باہر دیکھا تو وہ ایک کسرتی آدمی تھا۔اس کے مکّے میں اتنی قوت تھی کہ دروازے کی لکڑی میں شگاف پڑ جاتا تھا۔ ہر روز گھر پر باکسنگ کی مشق کرتا تھا۔شکار کھیلنے کا شوق تھا۔سخت سے سخت کام کر سکتا تھا افسوس مجھے صرف اس بات کا ہوا کہ اسے آرائش کا قطعاً ذوق نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اس کا گھر دلکش سے دلکش ساز و سامان سے آراستہ ہوتا مگر اس طرف وہ کبھی توجہ دیتا ہی نہیں تھا اور اگر دیتا تھا تو اس کے نتائج غیر صناعانہ ہوتے تھے۔برش اٹھا کر خود ہی سارے فرنیچر پر گہرا نیلا پینٹ ٹھوپ دیتا یا کسی صوفے کی پشت توڑ کر اسے دیوان کی بھونڈی شکل میں تبدیل کر دیا۔مکان سمندر کے ایک غلیظ کنارے پر ہے۔نمکین پانی کے چھینٹے باہر کھڑکیوں کی سلاخوں کو چاٹ رہے ہیں۔جگہ جگہ لوہے کے کام پر زنگ کی پیڑیاں جمع ہیں۔ان سے بڑی اداسی پھیلانے والی بو آ رہی ہے مگر اشوک اس سے قطعاً غافل ہے۔ریفریجریٹر باہر کاری ڈور میں پڑا جھک مار رہا ہے۔اس کے ساتھ الگ کر اس کا گرانڈیل السیشین کتّا سو رہا ہے۔ پاس کمرے میں بچے اودھم مچا رہے ہیں، اور اشوک غسل خانے کے اندر بات پر بیٹھا دیواروں پر

حساب لگا کر دیکھ رہا ہے ک اس میں کون سا گھوڑا اوّن سے آئے گا یا مکالموں کا
پرچہ ہاتھ میں لئے ان کی ادائیگی سوچ رہا ہے۔ اشوک کو خراست الید یعنی
پامسٹری اور علم نجوم سے خاص شغف ہے۔ مؤخر الذکر علم اس نے اپنے باپ سے
سیکھا ہے''۔11؎

منٹو کے خاکوں میں اس طرح کی منظر کشی جگہ جگہ ملے گی۔لیکن افسانوی انداز کی منظر کشی منٹو کے خاکوں کی خاص خصوصیت ہے ملاحظہ فرمائیے:

''میں فلمستان میں ملازم تھا، صبح جاتا تو شام کو آٹھ کے قریب لوٹتا۔ایک روز
ارتفاق سے واپسی جلدی ہوئی۔یعنی میں دوپہر ہی کے قریب گھر پہنچ گیا۔اندر
داخل ہوا تو ساری فضاء مرتعش نظر آئی۔ جیسے کوئی ساز کے تار کو چھیڑ کر خود چھپ گیا
ہے۔ڈریسنگ ٹیبل کے پاس میری دو سالیاں کھڑی بظاہر اپنے بال گوندھ رہی
تھی۔مگر ان کی انگلیاں ہوا میں چل رہی تھی۔ ہونٹ دونوں کے پھڑ پھڑا رہے
تھے۔مگر آواز نہیں نکلتی تھی۔ دونوں مل جل کر گھبراہٹ کی ایسی تصویر پیش کر رہی
تھیں جو اپنے گھبراہٹ چھپانے کی خاطر بے مطلب دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر
رہی ہو۔ملحقہ کمرے کے دروازے کا پردہ اندر کی طرف دبا ہوا تھا''۔12؎

خاکہ نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ خاکوں میں خود خاکہ نگار کی شخصیت بھی جھلکتی ہے۔منٹو کے خاکوں میں بھی ہر جگہ خود ان کی شخصیت بھی ہمیں نظر آتی ہے۔اگر منٹو کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اکٹھا کر دیا جائے تو ایک خاکہ تیار ہو جائے گا۔خود خاکہ تیار ہو جائے گا۔منٹو نے نواب کاشمیری کی شخصیت کے بارے میں لکھتے یوئے خود اپنی شخصیت کی بھی بڑی خوب عکاسی کی ہے۔مثلاً ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اسے دیر تک مٹی کے تیل کی بو آتی رہی
میں اب کبھی سوچتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں مٹی کا تیل

ہوں، کیروسین ہوں، نواب کاشمیری ہوں، کاشمیری میں بھی ہوں۔لیکن اتنا ظالم
نہیں جتنا کہ وہ تھا۔اس لئے اس نے صرف اولاد کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو خودکشی
پر مجبور کر دیا۔

میں بھی کشمیری ہوں، مجھے کشمیریوں سے بہت محبت ہے لیکن میں ایسے
کشمیریوں سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی بیویوں سے برا سلوک کریں''۔13؎

منٹو نے میراجی کے خاکے میں اپنی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، منٹو نے میراجی کی شراب نوشی کی عادت کے بارے میں بیان کرتے ہوئے خود اپنی شراب نویشی کے بارے میں بھی ذکر کر دیتے ہیں لحاظہ وہ لکھتے ہیں:

''تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں ان دنوں غالباً 'آٹھ دن' کی شوٹنگ
ہورہی تھی۔اس کی کہانی میری تھی۔جس کے لئے دو ایک گانوں کی ضرورت تھی،
میں نے اس خیال سے کہ میراجی کو کچھ روپئے مل جائیں، اس سے یہ گانے لکھنے
کے لئے کہا۔جو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لکھ دئے، مگر کھڑے کھڑے خاموش قسم
رہا۔واپس جاتے ہوئے اس نے مجھ سے سات روپیے طلب کئے کہ اسے ایک
آدّھا لینا تھا۔

اس کے بعد بہت دیر تک اس کو ہر روز ساڑھے سات روپئے دینا میرا فرض
ہوگیا۔میں کود بوتل کا رسیا تھا۔یہ منہ نہ لگے تو جی پر کیا گزرتی ہے۔اس کا مجھے
بخوبی علم تھا۔اس لئے میں اس رقم کا انتظار کر رکھتا، اس سات روپے میں رم کا
آدّھا آتا تھا، باقی آٹھ آنے اس کے آنے جانے کیلئے ہوتے تھے''14؎

ہر شخص کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں، اس کا رنگ ڈھنگ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور کسی سے وہ جانا پہچانا جاتا ہے، منٹو نے جن شخصیات پر خاکے لکھے ہیں۔ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں کی عکاسی کی ہے، جو بظاہر عجیب وغریب معلوم ہوتی تھیں چنانچہ تپش کاشمیری صاحب کی تلاوت کرنے

کے انداز پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے ایک روز دیکھا کہ وہ صبح سویرے اٹھے غسل کیا، اور الف ننگے بدن خشک کئے بغیر کرسی پر بیٹھ گئے۔ حمائل شریف نکالی اور تلاوت شروع کردی ۔۔۔۔۔ایک پارہ پڑھا۔۔۔۔ کپڑے پہنے اور باہر نکلے میں حیرت میں گم تھا کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے۔

کہیں ان کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا باہر نکل کر انھوں نے ٹرام کے ایک ٹکٹ پر نظم لکھی۔ مجھ سے بری پُر مغز گفتگو کی۔ میری زبان کی چند غلطیوں کی طرف میری توجہ دلائی۔ میرے دماغ میں چونکہ بڑی کھد بد ہو رہی تھی۔ اس لئے میں ان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

تپش صاحب۔۔۔۔ آپ ننگے ۔۔۔۔ ننگے بدن قرآن مجید کی تلاوت کیوں کرتے ہیں، کیا یہ معیوب نہیں۔۔۔۔

تپش صاحب مسکرائے۔۔۔۔

قرآن میں کہیں بھی یہ حکم درنہیں کیا گیا کہ آدمی تینوں کپڑے پہن کر اس کی تلاوت کرے۔۔۔ میں اس لئے کپڑے نہیں پہنتا کہ مبادا ان میں کوئی گندگی کی آرائش ہو۔۔۔ نہانے کے بعد میں تولئے سے اپنا بدن بھی اسی لئے خشک نہیں کرتا''۔15؎

باری علیگ صاحب نفاست پسند تھے وہ صاف ستھرہ رہنا پسند کرتے تھے وہ اپنی میز کو خوبصورتی سے سجانا پسند کرتے تھے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر لطیف انداز میں روشنی ڈالی ہے مثال دیکھئے:

''باری صاحب حسب توفیق صفائی پسند تھے۔ اپنے میز کی جھاڑ پونچھ اور اس کے بناؤ سنگھار میں کافی وقت صرف کرتے تھے لیکن اس معاملے میں وہ بالکل

بچوں کے مانند تھے۔ ناخن کاٹنے کی چھوٹی سی قینچی ہے۔ وہ بھی اپنے قلمدان کے ساتھ سجاوٹ کے طور پر وہاں رکھ دی ہے''۔16؎

کوئی بھی انسان اگر غریب ہو یا مفلسی میں مبتلا ہو تو اس کے حلیہ اور برتاؤ سے اس کی مفلسی اور مشکلات کا پتہ چل جاتا ہے۔ مگر رفیق غزنوی کی شخصیت اس سے مختلف تھی ان کی شخصیت کے اسی عجیب وغریب پہلو سے انھوں نے یوں واقف کروایا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''میں یہاں آپ کو رفیق کی عجیب وغریب شخصیت کا ایک عجیب وغریب پہلو دیکھانا چاہتا ہوں، جب اس پر بمبئی کی زبان میں کڑکی یعنی مفلسی کا زمانہ آتا ہے تو وہ بہترین لباس پہنتا ہے۔ جب یہ دور گذر جاتا ہے تو وہ معمولی کپڑے پہننے لگتا ہے۔ یوں وہ ہر لباس میں بانکا سجیلا نظر آتا ہے''17؎

رفیق غزنوی کی شخصیت کے ایک اور عجیب پہلو کے بارے میں منٹو لکھتے ہیں:

''رفیق غزنوی میں کھلنڈرا پن اس عمر میں بھی موجود ہے۔ چھوٹی سی بات ہوگی اور وہ ہنس ہنس کر اپنا برا حال کرلے گا۔ بہت خوش ہوگا تو اچھلنا کودنا شروع کردے گا''۔18؎

اسی طرح انھوں نے شام کی شخصیت کی بعض خصوصیات کی بھی نشاندہی کی ہے، مثلاً شیام کو ڈھنڈے پن سے نفرت تھی کیوں کہ ان کو تپش اور حدّت سے پیار تھا۔ منٹو ان کی موت پر ان کی شخصیت کی اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اس کو تپش اور حدّت سے پیار تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شیام ٹھنڈے ہاتھوں کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اگر واقعی موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے تو اس نے یہ کہہ کر ایک طرف جھٹک دیئے ہوتے۔ ہٹو بڑی بی۔ تم میں خلوص نہیں''۔19؎

منٹو کے مختلف واقعات کے ذریعہ بھی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے، منٹو نے

شخصیتوں کی زندگی سے ایسے ایسے واقعات کا انتخاب کیا ہے جن سے ان کی مختلف عادات اور صفات کا پتہ چلتا ہے۔ میراجی کو شراب پینے کی عادت تھی اور ان کی یہ عادت اس حد تک تھی کہ شہر میں بارش کی وجہ سے ساری دکانیں بند کردی گئی تھیں اور شراب پینے کی لت کی وجہ سے وہ شہر کے ایک ایسے علاقے میں گئے جہاں شراب مل سکتی تھی۔ ایک واقعہ کے ذریعہ سے میراں جی کی شراب نوشی کی لت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سخت بارش ہو رہی تھی۔ جس کے باعث برقی گاڑیوں کی نقل حرکت کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا تھا۔ خشک دن، ہونے کے وجہ سے شہر میں شراب کی دکانیں بند تھیں صرف باندرہ ہی ایک ایسی جگہ تھی، جہاں سے مقررہ داموں پر یہ چیز مل سکتی تھی میراجی میرے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میرا پرانا لنگوٹیا حسن عباس جو دہلی سے میرے ساتھ چند دن گذارنے کے لئے آیا تھا۔ ہم تینوں باندرہ اُتر گئے اور ڈیڑھ بوتل رم خرید لی واپس اسٹیشن پر آئے تو راجہ مہدی علی خاں مل گیا۔ میری بیوی لاہور گئی ہوئی تھی اس لئے پروگرام یہ بنا کہ میراجی اور راجہ رات میرے ہی یہاں رہیں گے۔
>
> ایک بجے تک رم کے دور چلتے رہے۔ بڑی بوتل ختم ہوگئی، راجہ کے لئے دو پیگ کافی تھے۔ ان کو ختم کر کے وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اور فلمی گیت لکھنے کی پریکٹس کرتا رہا۔ میں حسن عباس اور میراجی پیتے اور فضول باتیں کرتے رہے۔ جن کا سر تھا نہ پیر، کرفیو کے باعث بازار سنسان تھا۔ میں نے کہا اب سونا چاہئے۔ عباس اور راجہ نے میرے اس فیصلے پر صاد دیا۔ میراجی نہ مانا۔ آدھے کی موجودگی اس کے علم میں تھی۔ اس لئے وہ اور پینا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، میں اور عباس ضد میں آگئے اور وہ آدھا کھولنے سے انکار کردیا۔ میراجی نے پہلے منّتیں کیں۔ پھر حکم دینے لگا۔ میں اور عباس دونوں انتہا درجے کے سفلے

ہو گئے۔ ہم نے اس سے ایسی باتیں کیں کہ ان کی یاد سے مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے۔لڑ جھگڑ کر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے'۔20؎

تپش صاحب کھانے کے بہت شوقین تھے ایک بار کھانے کے باوجود دوبارہ بھی کھا سکتے تھے۔منٹو ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔اور تپش صاحب پہلے ہی کھا چکے تھے اسی ہوٹل میں ان کے اور دوست بھی آ گئے اور وہ ان کو کھانے میں شرکت کی دعوت دی ،انھوں نے شکریہ ادا کر کے کھانا شروع کر دیا۔ چنانچہ منٹو ان کی شخصیت کے اسی پہلو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہم لاہور کے حاجی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔تپش صاحب کھانا کھا چکے تھے، لیکن مجھے کھانا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھے تھے کہ اتنے میں ان کے چند دوست آئے جو پاس والے میز پر بیٹھ گئے ان میں سے ایک نے تپش صاحب سے علیک سلیک کرنے کے بعد کہا،'' آئیے کھانا تناول فرمائیے''۔

تپش صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

''خدا آ کو بہت بہت دے۔۔۔میں گھر سے کھا کر آیا ہوں'' ان کے دوست نے بڑا اصرار کیا کہ وہ ضرور کھائیں۔آخر تنگ آ کر وہ ان کے پاس بیٹھ گئے اور بارہ روٹیاں اور سالن منگوائی۔اس کے بعد فرنی کی چار پلیٹیں کھائیں اور خدا کا شکر ادا کر کے وہاں سے اٹھے اور میرے پاس چلے آئے۔۔۔ان کے اس دوست کی حالت قابل رحم تھی۔جس نے از راہ تکلف ان کو دعوت دی تھی۔وہ بالکل مبہوت تھا۔ وہ شاید اس لمحے ہر لعنتیں در لعنتیں بھیج رہا تھا۔ جب اس نے تپش صاحب سے کہا:

''آئیے کھانا تناول فرمائیے۔

میرا خیال ہے کہ تپش صاحب میں ذائقے کی حس موجود نہیں تھی۔وہ ہر چیز کھا سکتے تھے۔تھوہڑ اور کیلے میں ان کے نزدیک کوئی فرق نہیں تھا۔کچے چاول ہوں یا

اُبلے ہوئے ۔ تازہ ہوں یا پانچ چھ روز کے باسی ان کے لیے ایک جیسے تھے''۔21

منٹو نے شخصیات کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کا بیان کیا ہے۔ اور انھوں نے حقیقی واقعات کی عکاسی کی ہے۔ منٹو نے خود کا خاکہ بھی لکھا ہے۔ اس میں بھی غیر جانبداری کو ملحوظ رکھا ہے چنانچہ منٹو اپنے جھوٹ بولنے کی عادت کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

''یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اول درجے کا جھوٹا ہے۔ شروع شروع میں اس کا جھوٹ اس کے گھر میں پتہ چل جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہو گیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملہ کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا۔ جھوٹ تھا۔۔۔ منٹو جھوٹ بقدر کفایت بولتا ہے لیکن اس کے گھر والے، مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے۔ اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سرمے سے بنا رکھا ہو''۔22

منٹو نے نہ صرف اپنے خاکے میں اپنے جھوٹ بولنے کی عادت کا ذکر کیا بلکہ انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کرنے کی بات کا ذکر بھی ایمانداری سے کر دیا ہے وہیں دیگر شخصیات کی خامیوں اور خوبیوں کا بیان بھی کیا۔ مثلاً بابا راؤ پٹیل کا تکیہ کلام یہ تھا کہ وہ ہر بات پر لفظ سالا استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اس عیب کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میں نے خیال کیا، شاید اس لئے کہ اس کو اردو نہیں آتی، لیکن جب اس نے ٹیلی فون پر کسی سے انگریزی میں گفتگو شروع کی تو خدا کی قسم میرے دل میں شک پیدا ہوا کہ یہ شخص ہرگز ہرگز وہ بابوراؤ پٹیل نہیں جو ''فلم انڈیا'' کا اداریہ لکھتا ہے ''بمبئی کا لنگ'' رقم کرتا ہے اور سوالوں کے جواب دیتا ہے۔ معاذ اللہ کیا

لب ولہجہ تھا۔ایسا لگتا تھا کہ انگریزی،مرہٹی میں اورمرہٹی بمبئی کی گنوار بولی میں بول رہا ہے۔یہاں بھی ہرفل اسٹاپ کے بعد یااس سے پہلے ایک ''سالا'' ضرور آتا تھا۔میں نے دل میں کہا۔اگر یہی سالا بابوراؤ پٹیل ہے تو سالا میں سعادت حسن منٹو نہیں ہوں''۔23ے

ان تمام اقتباسات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ منٹو نے شخصیات کی خوبیوں اور خامیوں کے بیان میں غیر جانبداری برتی ہے۔چاہے وہ اپنا عزیز دوست ہی کیوں نہ ہو،منٹو نے خود اپنے خاکے میں بھی غیر جانبداری سے اپنی خامیوں کی عکاسی کی ہے۔انھوں نے یہ بھی اظہار کیا کہ انھوں نے شخصیات کو جوں دیکھا انھیں اپنی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ بیان کر دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں،کوئی شمپو نہیں،کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سید بھی نہیں ہوسکی۔اس کے منہ سے گالیاں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔میراجی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہوسکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیانہ کہے۔اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے''۔24ے

منٹو کے اس اقتباس سے ان کی حقیقت پسندی کا علم ہوتا ہے کیوں کہ اس زمانے میں کسی کے عیوب پر بے باکانہ انداز میں روشنی ڈالنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔بڑے ادیبوں سے قاری کو عقیدت ہوتی ہے لیکن خاکہ نگاری کا تقاضہ یہی ہے کہ خاکہ نگار موضوع خاکہ کی خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی بیان کرتے۔چنانچہ منٹو نے بھی اپنے خاکوں میں غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔منٹو کے خاکوں کا اسلوب دلچسپ اور دلکش ہے۔انھوں نے اپنے خاکوں کو دلچسپ بنانے کے لئے لطیفوں،تشبیہات اور محاوروں کا

بھی استعمال کیا ہے۔ رفیق غزنوی منٹو کے دوست تھے۔ جس وقت منٹو ان کے گھر میں داخل ہوئے تو اس وقت وہ اس انداز سے بیٹھے تھے ان کے بیٹھنے کے انداز کو دلچسپ تشبیہ کے ذریعہ بیان کیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''رفیق غزنوی میرا دوست ہے۔ میرے اس کے بڑے ہی بے تکلف مراسم ہیں۔ میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تو محفل جمی ہوئی تھی۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سوفے پر تازہ ترین بیوی خورشیدہ عرف 'انورادھا' بیٹھی ہے۔ اس کے ساتھ نور جہاں ہے۔ ایک کرسی پر شری نظامی جی براجمان ہیں اور فرش پر ہمارے رفیق غزنوی صاحب یوں بیٹھے ہیں جیسے کسی سومنات پر حملے کی تیاری کر رہے ہوں''۔ 25؎

فلمی اداکار نور جہاں کو پینے کی عادت تھی۔ ان کے پینے کے انداز کو منٹو نے دلچسپ انداز میں انوکھی تشبیہ کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''سب پی رہے تھے۔ نور جہاں کا پیگ بہت ہلکا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہونٹوں کے ذریعہ چوس رہی تھی۔ جیسے مکھیاں پھولوں سے آہستہ اور ہولے ہولے رس چوستی ہیں''۔ 26؎

منٹو اپنے افسانے لکھنے کے انداز کو دلکش تشبیہہ کے ذریعہ اس طرح بیان کئے ہیں کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''میں اس سے بیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اول درجے کا فراڈ ہے اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا، خود افسانہ اسے سوچتا ہے یہ بھی ایک فراڈ ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جب کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ انڈا کہیں چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے۔ اس کے دوست یار بیٹھے

ہوتے ہیں، اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیا جاتا ہے۔ جو بعد میں چوں چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں''۔27؎

آغا حشر کاشمیری کی آواز کو پہاڑوں میں بہنے والے پانی کی تیز دھار سے تشبیہہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آغا صاحب مسکرائے اور بیٹھ کر رستم کا پُر زور مکالمہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ اللہ اللہ کیا گرج دار آواز تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا تیز دھارا پہاڑ کے پتھروں کو بہائے لئے جا رہا ہے''۔28؎

دیوان سنگھ مفتون کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر معاملہ میں احتیاط برتتے تھے۔ ان کی احتیاط برتنے کی عادت کو دلچسپ محاورے کے ذریعے یوں بیان کیا ہے:

''دیوان سنگھ مفتون بہت محتاط آدمی ہے۔ محاورہ ہے۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ چھاچھ کے علاوہ وہ پانی بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ کاتب کو ہدایت ہے کہ جب اس کی لکھی ہوئی سلپیں پہلے کاغذ پر منتقل ہو جائیں تو فوراً واپس کر دی جائیں۔ کتابت شدہ سطور میں اغلاط لگانے کے بعد وہ میز پر پڑی ہوئی کالی صندوقچی کھولے گا اور اس میں تمام سلپیں ڈال کر اس کو مقفل کر دے گا اور جب پرچہ چھپ کر آ جائے گا تو اپنی تحریروں کو تلف کر دے گا۔ معلوم نہیں یہ احتیاط کیوں برتی جاتی ہے''۔29؎

مولانا چراغ حسن حسرت کی شخصیت کی عکاسی صنعت تضاد کے ذریعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''حسرت صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مردم کش ہیں سراسر غلط ہوگا۔ لیکن ان کے کردار میں ایک عجیب وغریب چیز یہ ہے کہ وہ جلا کر مارتے ہیں اور کئی بار

اپنے اعجاز سے زندہ کیا ہے''۔30

چراغ حسن حسرت کی شخصیت کے ایک اور پہلو کو محاورہ کے ذریعے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''مولانا چراغ حسن حسرت جنھیں میں اپنی اختصار پسندی کی وجہ سے حسرت صاحب کہتا ہوں، عجیب وغریب شخصیت کے مالک ہیں۔آپ پنجابی محاورے کے مطابق دودھ دیتے ہیں مگر مینگنیاں ڈال کر ویسے یہ دودھ پلانے والے جانوروں کی قبیل سے نہیں ہیں ۔حالانکہ کافی بڑے بڑے کان رکھتے ہیں''۔31

انور کمال پاشا کی شخصیت کے بیان میں فارسی کہاوت اور اردو محاورے کے استعمال سے دلچسپی پیدا کر دی ہے:

''فلمی دنیا میں دراصل بلند بانگ دعوے ہی بااثر ثابت ہوتے ہیں۔ایک محاورہ ہے''پدرم سلطان بوذ'' لیکن اس کے برعکس انور کمال پاشا ہمیشہ یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ میرا باپ سلطان نہیں گذر ریا تھا۔سلطان تو میں ہوں۔
نفسیاتی اعتبار سے نفی اکثر اوقات کارگر اور بااثر ثابت ہوتی ہے۔میرا خیال ہے کہ انور کمال پاشا نفسیات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔اسی لئے وہ اس گرُ کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں کہیں کہیں ٹھوکر بھی کھائی ہے لیکن ان کا اُلّو سیدھا ہوتا رہا ہے''۔32

منٹو نے اپنے خاکوں میں لطیفوں کا بھی استعمال کیا ہے۔انھوں نے انور کمال پاشا کے زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے ایک واقعہ کو لطیفے کے ذریعے بیان کیا ہے۔مثال دیکھئے:

''انور کمال پاشا کے متعلق کسی جگہ گفتگو ہو رہی تھی۔اس دوران میں ایک صاحب نے جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا کہا ''جی ، میں تو انور صاحب کو

جانتا ہوں۔ وہ باپ کے گناہ ہیں''۔

انور کمال پاشا بہرحال بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک ہے۔ وہ اتنا بولتا، اتنا بولتا ہے کہ ان کے مقابلے میں اور کوئی نہیں بول سکتا۔ اصل میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی آواز خود سننا چاہتا ہے اور دل ہی دل میں داد دیتا ہے کہ واہ انور کمال، تو نے آج کمال کر دیا۔ تیرے مقابلے میں اور کوئی اتنا زبردست مقرر نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ انسانی نفسیات کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض انسانوں کو یہ مرض ہوتا ہے کہ وہ ریکارڈ بن جائیں اور اسے گراموفون کی سوئی تلے رکھ کر ہر وقت سنتے رہیں۔ انور کمال پاشا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

اس کے پاس اپنی گفتگو کے کئی ریکارڈ ہیں۔ جو اپنی زبان کی سوئی کے نیچے رکھ کر بجانا شروع کر دیتا ہے اور جب سارے ریکارڈ بج چکتے ہیں تو وہ ریڈیو کے فرمائشی پروگرام سننے والے بچوں کے مانند خوش ہو کر محفل سے چلا جاتا ہے''۔33

چراغ حسن حسرت کے متعلق ایک لطیفہ بیان کرتے ہوئے منٹو لکھتے ہیں:

چلتے چلتے آپ کو ان کے متعلق ایک لطیفہ سنائے دیتا ہوں۔ بہت دنوں کی بات ہے، آپ ''امروز'' کے ایڈیٹر تھے۔

میں اور ''نیا ادارہ'' کے مالک چوہدری نذیر ان سے ملنے گئے۔ چوہدری صاحب نے ان کو کچھ رقم پیشگی کے طور پر دے رکھی تھی کہ وہ ان کو ایک کتاب لکھ کر مرحمت فرمائیں۔ باتوں باتوں میں چوہدری صاحب نے اس کا زکر کیا۔ حسرت صاحب کو یہ بات اس قدر ناگوار گذری کہ تمام پبلیشروں کی ہشت پشت کو بے نقط سنانا شرو کر دیں۔ مجھے تاؤ آ گیا، چنانچہ حسرت ساحب کی ان 'بے نقطیوں' کو مستعار لے کر (ان کی اجازت کے بغیر) ان کے حق میں زیادہ

سے زیادہ بیس پچیس سانسوں کے اندر اندر استعمال کردیں۔حسرت صاحب کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی بدتمیز انسان نے ان سے ایسی بدتمیزی کی تھی ۔ان کے لئے یہ اتنا بڑا صدمہ تھا کہ منہ سے ایک لفظ بھی باہر نکال نہ سکے۔میں خاموش ہوا،تو ان کو فوری طور پر اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہوا کہ میں نے ان کی توہین کی ہے۔میں اُٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا''مولانا ذرا بیٹھئے''۔

میں ذرا کیسے بیٹھتا۔مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ گفتگو کے ہر معاملے میں ان کی لغت میری ڈکشنری پر بھاری ہے۔ چنانچہ میں نے ان سے عرض کیا۔ حسرت صاحب معاف فرمایئے۔میں اب یہاں ایک منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ میرا غصّہ فرو ہو چکا ہے۔آپ کے غصے کا پارہ چڑھ رہا ہے میں گدھا ہوں ،اگر آپ کو موقع دوں کہ آپ مجھے گالیاں دے سکیں۔۔۔سلام علیکم''۔

یہ کہہ کر میں چل دیا۔ بعد میں سنا کہ وہ رات بارہ بجے تک اندر ہی اندر کھولتے رہے۔ مجھے اس بات کا کامل احساس ہے کہ حسرت صاحب ایسے بزرگ پسند بزرگ کے ساتھ میں نے بہت زیادتی کی،لیکن ہر انسان کو ایسے مواقع ضرور بہم پہنچانے چاہئیں کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اندر ہی اندر کھولے اور بس کھلتا رہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس عمل سے آدمی سنورتا ہے،نکھرتا ہے۔جس طرح بھٹی چڑھایا ہوا کپڑا''۔34

منٹو نے دیوان سنگھ کی زندگی میں پیش آنے والے ایک واقعہ کو اس طرح مزاحیہ انداز میں لطیفے کے زریعے بیان کیا ہے،مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ایک لطیفہ سنئے جو انھوں نے خود مجھے سنایا۔انتہائی مفلسی کے دن تھے کہ ان کا ایک دوست آن وارد ہوا۔ پہلے تو وہ بہت سٹپٹائے کہ جیب میں ایک ڈھیلا بھی نہیں تھا۔لیکن فوراً ان کو ایک ترکیب سوجھی ۔ بارہ لیمن بوتلیں منگوائیں۔ دو

دوست کو پلائیں دو خود پئیں۔ باقی آٹھ غسلخانے میں خالی کردیں اور نوکر سے کہا جاؤ یہ بارہ خالی بوتلیں بیچ آؤ۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ گولی والی بوتلیں اچھے دام لے آئیں، چنانچہ دوست کو رات کا کھانا کھلانے کا مسئلہ حل ہوگیا۔ دوسرے تیسرے روز انھوں نے دکاندار کو بارہ بوتلوں کی قیمت ادا کردی''۔35

منٹو کے خاکوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے یہ تمام شخصیتوں سے اپنی دیرپا ملاقات کی بناء پر لکھا تھا۔ انھوں نے اپنے خاکے کسی سے عقیدت کی بناء پر نہیں لکھے تھے بلکہ انھوں نے ایسی ہی شخصیتوں کا انتخاب کیا تھا جن کا تعلق ادبی یا فلمی دنیا سے رہا تھا۔ باوجود اس کے ان کے خاکوں میں فلمی دنیا سے متعلق شخصیات زیادہ ہیں کیوں کہ منٹو بہت عرصہ تک ممبئی میں رہے اور فلموں کے لئے کہانیاں بھی لکھتے رہے تھے اسی لیے انھوں نے ان کا انتخاب کیا ہے جن سے ان کی قربت رہی ہے۔ انھوں نے شخصیتوں کی خامیوں اور خوبیوں کا بیان حقیقت پسندی سے کیا ہے۔ انھوں نے شخصیات کی عکاسی اتنے دلکش اور پرلطف اسلوب کے ذریعے کیا ہے کہ موضوع خاکہ کی شخصیت کے عیب بھی بُرے نہیں لگتے بلکہ ان سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ یہی منٹو کے اسلوب کی خاصیت ہے۔ وہ دلچسپ وانوکھے محاوروں، تشبیہات اور لطائف کے ذریعے اپنے اسلوب میں جان ڈالتے ہیں۔ غرض منٹو اپنے خاکوں کے پُر لطف اسلوب اور غیر جانبدارانہ انداز بیان کی وجہ سے اردو ادب میں شہرت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی

1۔ کلیات منٹو، (منٹو کے خاکے) سعادت حسن منٹو، ص:58

2۔ بابوراؤ پٹیل، مشمولہ، کلیات منٹو، ص:108

3۔ آغا حشر کاشمیری، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص:66

4۔ دیوان سنگھ مفتون، مشمولہ، کلیات منٹو، ص:224

5۔ اختر شیرانی، مشمولہ، کلیات منٹو، ص:75

6۔ باری علیگ، مشمولہ، منٹو کے خاکے، ص۔:123

7۔ نور جہاں، مشمولہ، کلیات منٹو منٹو کے خاکے، ص:323

8۔ عصمت چغتائی، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:285

9۔ باری علیگ، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:130

10۔ مرلی کی دھن (شیام)، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:315

11۔ اشوک کمار، مشمولہ، کلیت منٹو، منٹو کے خاکے، ص:91

12۔ کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:353

13۔ نواب کاشمیری، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:372

14۔ تین گولے، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:201

15۔ تپش کاشمیری، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:190

16۔ باری صاحب، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:129

17۔ رفیق غزنوی، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:239

18۔ رفیق غزنوی، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:245

19۔ مرلی کی دھن، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:317

20۔ تین گولے، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:203

21۔ تپش کشمیری، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:189

22۔ سعادت حسن منٹو، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص:277

23۔ بابوراؤ پٹیل، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے) ص:108

24۔ کچھ منٹو کے خاکے کے بارے میں، مموله، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص:41

25۔ نور جہاں، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص،:383

26۔ نو جہاں، مشمولہ،، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے) ص:384

27۔ سعادت حسن منٹو، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص:276

28۔ آغا حشر سے دو ملاقاتیں، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:64

29۔ دیوان سنگھ مفتوں، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص:222

30۔ چراغ حسن حسرت، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص:210

31۔ چراغ حسن حسرت، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص:206

32۔ انور کمال پاشا، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص:101

33۔ انور کمال پاشا، مشمولہ، کلیات منٹو (منٹو کے خاکے)، ص:102

34۔ چراغ حسن حسرت، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:218

35۔ دیوان سنگھ مفتون، مشمولہ، کلیات منٹو، منٹو کے خاکے، ص:228

سید ضمیر جعفری (پیدائش 1916۔وفات 1999)

سید ضمیر جعفری مقبول شاعر، نثر نگار، مزاح نگار اور کالم نویس ہیں، اور ضمیر جعفری ان خوش نصیب ادیبوں میں سے ہیں جنہیں بہت کم عرصے میں مقبولیت حاصل ہوئی ۔ انھوں نے اپنے تعلیمی سفر کی شروعات پرائمری جماعت سے کی اور دسویں جماعت جلم سے پاس کیا وہیں سے پہلی مرتبہ شعر کہنا شروع کیا اور اسکول کے ملک الشعرا کی حیثیت سے مقبول ہوئے ۔ انھوں نے ایف ۔ اے کا امتحان کیمبلپور سے پاس کیا وہیں وہ کالج میگزین کی ادرت بھی کرتے تھے۔ 1938ء میں گریجویٹ ہوئے اور انھوں نے کئی ملازمتیں اختیار کی فوج کے میجر کی حثیت سے بھی کام کیا اور روزنامہ ''بادشمال'' کے مالک اور مدیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

سید ضمیر جعفری نے مولانا چراغ حسن حسرت کا خاکہ لکھا ہے ۔ اس کا عنوان ''سنگاپور کا میجر حسرت'' رکھا ہے اس خاکے میں سنگاپور میں پیش آنے والے واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سید ضمیر جعفری کا کہنا ہے کہ ''ہم نے مرشد کے تذکرے کے لئے وہی اسلوب چنا ہے جو خود ان کا اسلوب حیات تھا''۔ سید ضمیر جعفری مولانا چراغ حسن حسرت روزمرہ زندگی کی معمولات کا ذکر بڑی عمدگی سے کرتے ہیں:

> ''البتہ شام کو جب آفتاب غروب ہوتا تو یہ آفتاب طلوع ہوجاتا ۔ ان کی عادت تھی کہ دفتر سے آنے کے بعد کوئی کتاب سینے پر رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سو

جاتے ۔ ہر شام بیدار ہوتے، غسل کرتے ، لباس بدلتے ۔ چھٹی کا دن ہوتا تو سرے سے اٹھتے ہیں اس وقت ۔ شیو بھی شام ہی کو بناتے ۔ ان کے لئے جاگ کر سونا جتنا مشکل تھا۔ سو کر جاگنا اس سے زیادہ مشکل تھا اور جاگ کر پھر کہیں باہر جانے کے لئے تیار ہونا تو گویا قطرے کا گہر ہونا تھا۔ صاف ستھرا لباس پہنے کا شوق ضرور تھا مگر اس شوق کو اتنی اہمیت بھی نہیں دے رکھی تھی کہ لباس خود پہننا بھی پڑے سگریٹ، کتاب، اور شراب کے علاوہ وہ کسی شئے کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دیتے تھے ۔ فوجی وردی کی نوک پلک کے بارے میں سخت لاپرواہ تھے ۔ مگر چونکہ بڑا جرنیلی قد کاٹھ پایا تھا اس لیے جو چیز جس طرح پہن لیتے ، سج جاتی ، وہ تیار ہوتے نہیں تھے، تیار کرائے جاتے تھے ۔ اُن کا بیٹ مین عنایت اللہ جس کو وہ علامہ کہتے تھے ۔ بیگم حسرت پر تحسین و آفرین بھیجتے ہوئے اکثر کہا کرتا تھا ۔ ۔ ’ میں تو صاحب کو بچوں کی طرح پال رہا ہوں ‘‘ ۔ 1

اس اقتباس سے سید ضمیر جعفری نے چراغ حسن حسرت کے لئے آفتاب کا استعارے کا استعمال کیا۔ جس نے ان کی پوری شخصیت کی بہترین عکاسی ہوتی ۔ اس خاکے میں ان کے روزمرہ کے کام اوران کی عادات واطوار کا بیان بھی بڑی دلکشی سے کیا گیا ہے ۔

چراغ حسن حسرت کو سگریٹ پینے کا بہت شوق تھا۔ وہ اس عادت کو دل سے چھوڑ دینا چاہتے ۔ مگر یہ عادت ان سے نہیں چھوٹتی تھی وہ اتنا زیادہ سگریٹ پیتے تھے کہ شام تک ان کی آدھی کوٹھری ماچس کے خالی ڈبیوں اور سگریٹ سے بھر جاتی تھی لحاظہ ان کی اس کمزوری کا ذکر انھوں نے ایک واقعہ کے زریعہ بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے:

’’ سگریٹ منہ سے نہیں نکلی ۔ دھواں آنکھوں میں جارہا تھا۔ کبھی کبھی تو ی گمان ہوتا کہ دھواں آنکھوں میں جا نہیں رہا، آنکھوں سے آرہا ہے درمیان میں جھنجھلا کر آنکھیں ملنے بھی لگتے ۔ لیکن آنکھوں کی جلن اور سگریٹ کے دھوئیں

میں کوئی رشتہ شاید وہ کبھی دریافت نہ کر سکے تھے۔علل و معلول کی اکثر کار فرمائشوں سے مرشد عموماً بے تعلق و بے نیازی رہے۔۔۔۔۔۔

اتنے میں مجھے کپڑا جلنے کی بوسی آئی۔ میں نے کہا۔۔۔۔’ مولانا کہیں کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا۔۔۔ بولے۔۔۔۔ آپ کہہ رہے ہیں تو ضرور جل رہا ہوگا، آپ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔۔۔۔۔ پھر ذرا چلا کر بولے۔۔۔ ارے قاضی صاب ذرا ادھر تو تشریف لائیں۔ دیکھئے کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟ یہ کہیں سے بو سی کیا آرہی ہے؟ ۔۔۔ اس کہیں سے بوٗ کا راز یہ کھلا کہ جناب کی پتلون کا پائجامہ چار پانچ انچ کے قریب راکھ ہو چکا تھا فرمانے لگے۔۔۔۔’ مولانا یہ سگریٹ بھی بڑی واہیات چیز ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس لعنت کو چھوڑ ہی دوں‘‘۔۔۔۔۔ اور شام تک سگریٹ اور ماچس کے خالی بکسوں سے آدھی ٹوکری بھری پڑی تھی‘‘۔ 2ے

مندرجہ بالا اقتباس میں سگریٹ نوشی کی اس لت کا بیان اس دلکشی کے ساتھ کیا کہ سارا واقعہ نظروں آ گئے رقص کرنے لگتا ہے۔

میجر حسرت کو کتابیں پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ سنگاپور میں دوالفیکر نامی ایک کتابوں کی دکان تھی جہاں وہ گھنٹوں کتابوں کا مطالعہ کرتے تھیں وقت کا احساس نہیں ہوتا تھا ان کے دوست ان کی اس عادت سے بیزار ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کے اس عادت کا ذکر واقعہ کے حوالے سے سے دلکش انداز میں کرتے ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

’’سنگاپور میں ’دوالفیکر‘‘ کتابوں کی ایک بڑی دکان تھی جس کے مالک ایک مدراسی مسلمان تھے۔ مدراس میں عبدالفیکر نام عام سننے میں آتا ہے۔ پتہ نہیں ’دوالفیکر‘۔۔۔۔ عبدالفقیر ہی کا مخفف تھا یا ذوالفقار کی مالا باری شکل۔ مرشد اسی تجسس میں دو ایک مرتبہ اس دکان پر گئے اور پھر یہ معمول بن گیا کہ دفتر

سے واپسی پر وہاں ضرور رک جاتے۔ سنگاپور کی مرطوب آب و ہوا میں ساری دوپہر کام کرنے کے بعد ہمیں گھر جانے کی جلدی ہوتی مگر مرشد ہیں کہ دکان میں کھڑے ایک شیلف سے دوسرے شیلف اور دوسرے سے تیسرے کی طرف کھچے چلے جارہے ہیں۔ کتابوں کی دکان کے اندر جا کر وہ باہر نکلنے کا راستہ ہی بھول جاتے۔ ایک ایک کتاب تانک جھانک ہو رہی ہے۔ ادھر ہم دروازے پر کھڑے یا جیپ میں بیٹھے انھیں کوس رہے ہیں۔ بعض اوقات ہم انہیں اُتار کر خود چپکے سے فرار ہو جاتے اور جیپ واپسی بھیج دیتے۔ مرشد کو اس پر بڑا دکھ ہوتا۔ اس لیے نہیں کہ ہم نے ان کا انتظار کیوں نہ کیا، اس لیے کہ ان کے ساتھ اکٹھے رہنے اور کام کرنے کے باجود ہم اتنے کور ذوق اور بے حس کیوں تھے کہ کتابیں قطار در قطار اور منزل بہ منزل رکھی ہیں مگر ہم میس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مرشد کا بس چلتا تو وہ میس کے بجائے 'دوالفیکر' یا کتابوں کی کسی دوسری دکان میں بستر ڈالتے''۔3

چراغ حسن حسرت کا دوست بنانے کا انداز بھی بڑا نرالا تھا۔ وہ کسی کو دوست بنانے میں جلد بازی نہیں کرتے تھے۔ اگر ایک بار دوست بنالیا تو اس طرح سے دوستی نبھاتے تھے کہ اگر وہ دوست دشمن بھی بن جائے تب بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے ان کی دوستی نبھانے کی اس صفت کا بیان وہ اس طرح کرتے ہیں:

''دوستوں کی محبت ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ، سب سے بڑی تسکین تھی مگر دوستیکر نے میں وہ تقدم یا تیزی کے قائل نہ تھے۔ موت تک یہی نہ کھل سکتا کہ وہ دوست بننے پر آمادہ بھی ہیں یا نہیں لیکن اندر ہی اندر نہایت نامعلوم طور پر وہ دوسرے کے دل میں سماجاتے اور پھر دوستی میں ان کی بے بسی یہاں تک پہنچ جاتی کہ دوست اگر دشمن بھی ہو جاتا تو وہ اسے چھوڑ نہ سکتے''۔4

حسرت کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل تھا کیوں کہ وہ معمولی سے غلطی کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ بار بار طنز کے تیر چلاتے تھے کہ ان کے دوست پریشان ہوجاتے تھے۔ ان کی شخصیت کی اسی خصوصیت کا بیان ضمیر جعفری یوں کرتے ہیں:

> ''مرشد کے ساتھ کام کرنا تلوار کی دھار پر چلنا تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی کو اپنے اسلوب طنز کی تازگی کے ساتھ وہ مہینوں تروتازہ رکھتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کسی روز وہ کام سے مطمئن ہوجائیں یا کھل کر شاباش دے جائیں۔ معیار کے معاملہ میں وہ قدم قدم پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حالب اور نصیر حسین خیال کا حوالہ دیتے''۔5

چراغ حسن حسرت خرید وفروخت کرنا سخت ناپسند تھا۔ ان کی ہر ضروری چیز کو دوسرے انھیں لاکر دیتے تھے لیکن اپنوں کے لئے کوئی چیز خریدنا ہوتو وہ ضرور خرید کردیتے تھے۔ ان کی شخصیت کے اس انوکھے پہلو سے ضمیر جعفری اس طرح واقف کرواتے ہیں:

> ''بازار کی خرید وفروخت سے انھیں سخت وحشت ہوتی تھی۔ ان کی ضرورت کی اکثر چیزیں ہمیں لوگ خریدا کرتے تھے۔ مگر جب کبھی خود بازار میں نکلتے تو ظہیر و زینب کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی تحفہ خرید لیتے''۔6

چراغ حسن حسرت کا حافظہ بہت عمدہ تھا ان کے کتاب پڑھنے کا انداز دوسروں الگ تھا۔ کتاب اٹھاتے اورق کی الٹ پھیر کرتے اور سب کچھ حفظ کرلیتے تھے۔ اگر کوئی ان سے اس کتاب کے متعلق سوال کرتا تو اس کے متعلق ساری باتیں بڑی عمدگی سے بتادیتے۔ لوگ ان کے حافظہ سے بڑے متاثر ہوتے۔ ضمیر جعفری بھی ان کی شخصیت کے اس پہلو سے بہت متاثر تھے چنانچہ وہ ان کی اس خصوصیت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جس طرح اور لوگ کتاب پڑھتے ہیں اس طرح ہم نے انھیں پڑھتے بھی نہیں دیکھا۔ ان کی کیفیت تو کچھ ایسی تھی کہ کتاب اٹھائی۔ اسے چھوا، ٹٹولا،

سونگھا، چند ایک ورق الٹ پلٹ کر دیکھے اور بس۔ اس کے بعد وہ کسی باطنی عمل سے کتاب کا نفس مضمون، کتاب کی روح سب کی سب، اپنے ذہن میں منتقل کر لیتے دوسرے روز آپ اس کتاب کے متعلق بات کریں تو اور اس کے کرداروں کا حسب نسب، کہانی کی اٹھان، اس کی کمزوریاں اور خوبیاں مصنف کا اسٹائل اور فلسفہ اور پھر دس اور کتابوں سے اس کی جزئیات کا موازانہ، یہ سب یوں بیان کر جاتے جیسے یہ کتاب انھوں نے مکتب میں سبقاً پڑھی ہو'' ۔7

حسرت کام کرنے کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ انھیں دفتری کاموں میں کوئی غلطی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ بہت بری طرح ڈانٹ دیتے تھے۔ ڈانٹنے کے بعد خود بھی رنجیدہ ہو جاتے تھے کیوں کہ ان کی شخصیت بڑی ہمدردی تھی لیکن ان کے کام کرنے کے اپنے اصول تھے جس پر وہ سختی سے کاربند رہتے تھے۔ چنانچہ محاورتی انداز میں بڑے دلکش اسلوب کے ساتھ ان کی شخصیت کے اس پہلو کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

''دفتر میں میرا ان کا واسطہ کچھ ویسے کم تھا مجھ میں اس واسطے کو اور بھی کم رکھتا تھا۔ اس واسطے سے بس یہ سمجھئے کہ کچھ خوف ہی آتا تھا۔ مرشد جب آزاد رہتے، دل دہل جاتا۔ الٰہی خیر اب نہ معلوم کم بخت کونسا محاورہ الٹا جا پڑا ہے؟ کس روزمرے کو تکلیف پہنچ گئی ہے؟ کہیں کوئی شتر گربہ تو نہیں پکڑا گیا؟ کس جملے کی نشست تو برخاست نہیں ہوگئی؟ کوئی بندھنے والا خیال کھل تو نہیں گیا؟ خدا معلوم تذکیر و تانیث کا کونسا شاخسانہ اٹھنے والا ہے؟ ہمیں مرشد کے سامنے اپنی جہالت کے اعتراف و اقرار میں کیا تامل ہوسکتا تھا۔ تاہم نوجوانوں کی پوری مصنوی نسل کو اپنے سامنے تختہ دار پر کھینچتے ہوئے دیکھنے سے ہم کتراتے ضرور تھے۔ ہمیں مرشد کی ڈانٹ سے زیادہ ان کی مایوسی و آزردگی کا ڈر تھا۔ وہ گاندھی جی کی طرح دوسروں کو سزا دیتے ہوئے اپنے آپ کو سزا دینے لگتے تھے!'' ۔8

سید ضمیر جعفری کی خاکوں کے جائزہ کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ چراغ حسن حسرت کے خاکے کو عمدگی سے پیش کیا کہ ان کی شخصیت پوری طرح سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ان کے کام کرنے کا انداز، کتاب کے مطالعہ کا شوق، ان کی پسند، ناپسند، شراب اور سگریٹ پینے کا انداز دوستی نبھانے کا انداز اور پھر ان کی ڈسپلین کی عادت وغیرہ کا تذکرہ بڑے دلچسپ اسلوب اور واقعہ نگاری کے ذریعہ کیا کہ ان کی شخصیت سے بھرپور واقعیت ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ چراغ حسن حسرت سے ہم ملاقات کرر ہے ہیں۔یہی ان کے خاکہ نگاری کا کمال ہے۔

☆☆☆

حواشی

1۔سنگاپور کا میجر حسرت، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد اول، 2004 ص:259

2۔سنگاپور کا میجر حسرت، مشمولہ، اردو کے بہترین شخص خاکے۔جلد اول، 2004/ ص:252

3۔سنگاپور کا میجر حسرت، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے ص:256

4۔سنگاپور کا میجر حسرت، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد اول، ص:262

5۔سنگاپور کا میجر حسرت، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد اول، ص:255

6۔سنگاپور کا میجر حسرت، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد اول، ص:265

7۔سنگاپور کا میجر حسرت، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد اول، ص:252

8۔سنگاپور کا میجر حسرت، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد اول، ص:258

☆☆☆

فکر تونسوی کی خاکہ نگاری (پیدائش1918۔وفات1987)

فکر تونسوی1918ء میں پیدا ہوئے۔ان کا انتقال1987ء میں ہوا۔وہ ایک ایسے ادیب ہیں جو اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔انھوں نے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے، مثلاً وہ ایک انشائیہ نگار، کالم نگار اور شاعر بھی ہیں لیکن ان کو سب سے زیادہ مقبولیت ان کی طنزیہ کالم نگاری کی وجہ سے حاصل ہوئی۔

فکر تونسوی کی کالم نگاری کی شروعات ایک روزنامہ اخبار کے ذریعے ہوئی جسے وہ ایک طنزیہ کالم ''آج کی خبر'' کے عنوان سے روزانہ لکھا کرتے تھے۔اس کالم کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔اور اسی بناء پر انھوں نے روزنامہ ''ملاپ'' میں 1955ء سے ''پیاز کے چھلکے'' کے عنوان سے کالم لکھنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری و ساری رہا،اور رسالہ ''بیسویں صدی میں'' میں بھی انھوں نے اپنے خدمات انجام دیئے۔ اپنے قلم کے ذریعے سماجی اور سیاسی مسائل کو طنز و مزاح کا نشانہ بنا کر دلچسپی کے ساتھ پیش کیا۔ایک کالم نگار کی حیثیت سے انھوں نے لاتعداد مضامین کے ذریعہ سے اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔

فکر تونسوی نے کالم نگاری کے علاوہ انشائیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے انشائیوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔جن میں ''ساتوں شاستر، ہم ہندوستانی، بیس ہزار چراغ، تیر نیم کش وغیرہ شامل ہیں۔

فکر تونسوی نے خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔''خدوخال'' ان کے خاکوں کا مجموعہ

ہے۔ یہ مجموعہ 1955ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل تیرہ خاکے موجود ہیں۔ان میں سے صرف آٹھ خاکے ان کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی دوسرے ادیبوں کے لکھے ہوئے خاکے ہیں۔ ان آٹھ خاکوں میں باری صاحب، احمد ندیم قاسمی، کنہیالال کپور، بلونت سنگھ، مخمور جالندھری، ساحرلدھیانوی، تاجور عامری اور''عبدالمتین عارف'' کے خاکے شامل ہیں۔ان کی خاکہ نگاری کے متعلق خود ان کا کہنا ہے کہ''ارادہ یہ تھا کہ اپنے ادب میں ایسے اسکیچوں کورواج دینے کی مہم شروع کی جائے اور ایک کتابی سلسلہ کے ذریعے ادیبوں،شاعروں، سائنسدانوں، آرٹسٹوں اور دوسری تہذیبی شخصیتوں کے خاکے ان کے قریبی دوستوں سے لکھوا کر پیش کئے جائیں۔''ان کے خاکوں کے مجموعے میں خود فکرتونسوی کا بھی ایک خاکہ شامل ہے۔اس کا عنوان''اپنا خاکہ'' ہے۔

ان تمام خاکوں کی ایک خصوصیت یہ رہی تھی کہ فکرتونسوی نے اپنے ذہنی تصور اور تجربات کے لحاظ سے ہر شخص کے اصل نام کے ساتھ ایک دوسرا نام بھی دیا ہے۔اصل نام کے ساتھ جو نام شامل ہے اس کو"Nick name" بھی کہتے ہیں۔مثلاً احمد ندیم قاسمی کے لئے پیرزادہ، کنہیال لال کپور کے لئے''مسخرا'' ساحرلدھیانوی کے لیے''شہزاداہ'' وغیرہ جیسے نام کا استعمال کیا ہے انھوں نے زیادہ تر خاکے ایسے ادیبوں کے لکھے ہیں جنہیں ان سے گہرے دوستانہ مراسم رہے ہیں۔

فکرتونسوی نے یہ خاکے ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں لکھے تھے۔انھوں نے ایسی ہی شخصیتوں کے خاکے پیش کئے ہیں۔جنھوں نے زندگی کے ہر طرح کے حالات سے ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔لحاظہ صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> ''فکرتونسوی نے جس زمانے میں یہ خاکے لکھے ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ذہنوں پر انقلاب کا ایک رومانی تصور چھایا ہوا تھا۔فکرتونسوی نے ان شخصیتوں کو اپنے ہیرو کی شکل میں پیش کیا ہے جو نا مساعد حالات کا جی داری سے مقابلہ کرتے ہوئے زندگی کی صحت مند قدروں اور انسانیت کی بقا اور تحفظ کے

لیے سینہ سپر ہیں''۔1؎

فکر تونسوی کی خاکہ نگاری کا آغاز اشتراکی ادیب باری کے خاکے سے کیا ہے۔ یہ خاکہ 1945ء میں لکھا گیا ہے اس کے بعد انھوں نے دوسرے ادیبوں پر بھی خاکے لکھے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں خاکہ نگاری کے فنی لوازمات کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور سراپا نگاری یا حلیہ نگاری کے بیان میں کسی بھی طرح کی احتیاطی نہیں برتتے ہیں، بلکہ پہلی نظر میں جس طرح سے نظر آئے اسی کو بیان کر دیئے لحاظہ کنہیالال کپور کا حلیہ بیان کرتے ہیں:

''کنہیالعل کپور کو میں سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اُف اِس کے چہرے کے وہ طلسمی نقوش جو ذہن کی پوری گرفت میں کبھی آتے ہی نہیں۔ طلسمی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس چہرے میں کوئی جادو ہے، کوئی افسوس ہے، بلکہ یہ کہ کپور کے نقش دیکھنے والے کے لیے ایک بڑی مصیبت بن جاتے ہیں۔ یہ نقوش کچھ قابل اعتراض حد تک موھم بھی نہیں۔ قابل فخر حد تک تیز بھی نہیں، یوں سمجھئے کہ تیکھے پن اور دھیمے پن کو اگر ملا جلا دیا جائے اور پھر کوشش کی جائے کہ کپور کے رخسار کپور کی آنکھیں کپور کی ناک، اس کے ہونٹ، اس کی تھوڑی ذرا واضح اور روشن شکل میں سامنے آجائیں تو اکثر ناکامی ہوگی۔ ناک کے پورے نقشے کو پکڑتے پکڑتے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ناک نہیں ہے رخسا ہے اور پھر رخسار کی طرف نگاہ دوڑائی جائے تو وہاں آنکھ کا سا عالم طاری دکھائی دیتا ہے۔۔۔اسی لیے تو میں اپنی مجبوری اور بے چارگی کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس شخص کے صحیح ترین نقش کا مکمل تصور کرنا اور ان سے کوئی صاف تصویر بنا سکنا اتنا ہی مشکل ہے''۔2؎

واقع کے حوالے سے ان کے دبلے پتلے جسم پر مزاحیہ انداز میں یوں روشنی ڈالی ہے:

''اسے اپنے پتلے جسم کا خود بھی کافی احساس ہے، ایک مرتبہ جب وہ ایک

انگریز قاتون سے ملا تو اس کا یہ احساس ایک نہایت طنزیہ لطیفے کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس خاتون نے کپور کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا۔ کپور صاحب You are as thin as a Needle! کہ آپ اتنے پتلے ہیں۔ جتنی سوئی ہوتی ہے، کپور نے بے ساختہ بھولپن سے جواب دیا۔ محترمہ آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں''۔3

اس اقتباس سے فکرتونسوی کی حلیہ نگاری کے کمال کا پتہ چل جاتا ہے انھوں نے کنہیالال کپور کے حلیہ کے بیان میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔ اوران کے دبلے پتلے پن کا بیان بھی بڑے لطیف انداز میں کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کنہیالال کپور بھی بڑے شگفتہ طبیعت کے مالک تھے، انھیں خود اپنے دبلے پن کا احساس تھا جب ایک انگریزی خاتون نے ان سے مذاق کیا تو انھوں نے سادگی سے اس مذاق کو اور خود کو مذاق کا موضوع بننے میں کوئی اعتراض یا غصیّے کا اظہار نہیں کیا۔ یہی ان کی شخصیت کی خاصیت تھی جس پر فکرتونسوی نے عمدگی سے روشنی ڈالی۔ ظاہری خدوخال اور سراپے کا ذکر تو ہر خاکہ نگار اپنے اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں لیکن فکرتونسوی نے اپنے خاکوں میں حلیہ نگاری کے بیان میں جزئیات نگاری سے کام لیا۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کی حلیہ نگاری کرتے وقت حقیقت پسندی سے کام لیا، کیوں کہ خاکہ نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جو محسوس کرے اسے جوں کا توں بیان کردے، چنانچہ احمد ندیم سے پہلی ملاقات میں جو تاثر ابھرا اسے جوں کا توں بیان کرتے ہوئے غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ اوران کے سراپے اور لباس کے بیان میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے مثال دیکھئے:

''جب میں اس سے پہلی مرتبہ ملا تو اس نے مجھے بالکل متاثر نہ کیا۔ میرا مطلب ہے اس مرعوب کن احساس کو جو اس کی شاعری اور افسانہ نگاری نے میرے دل پر مسلط کر رکھا تھا۔ ایک وقتی جھٹکا کا سا لگا'' کچھ اعتبار نہیں آیا''

میرے اندر بیٹھا ہوا ڈرپھوک شرارتی کہنے لگا۔ متوسط جسم کا آدمی پشاوری کلاہ اورمشہدی ذکر جیسے اکثر وہ سر پر نہ پہنتا تو اپنے خوبصورت گچھے دار پیچدار تہہ بہ تہہ اور ہموار بالوں کی وجہ سے دیکھنے والے کو زیادہ مرعوب کرسکتا تھا۔ جن پر موتیار کی سلکی شیروانی جو دیہاتی پنجاب کے متمول، معزز اور شرفاء کا لباس ہے۔۔۔ مجھے اس سارے لباس میں سب سے زیادہ موزوں صرف پنجابی شلوار ہی دکھائی دی وہ سفید لٹھے کے دودھیا شلوار جس کی چمک اور رعنائی کے آگے دنیا کے بہترین لباس مند پڑ جاتے ہیں''۔4

مندرجہ بالا اقتباس سے فکر تونسوی کے انداز تحریر کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے شخصیت کی تصویر کشی میں کسی طرح کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ وہ جیسے انھیں نظر آئے ان کی شخصیت کی عکاسی پوری صداقت کے ساتھ کردی۔

اسی طرح انھوں نے کنہیا لال کپور کے کوٹ پتلون پہننے کے انداز کا بھی مذاق حقیقت پسندی سے کیا ہے۔ ان کا مذاق لطیف ہوتا ہے، لحاظہ موضوع خاکہ کو برا نہیں لگتا۔ فکر تونسوی کے لباس کا بیان مزاحیہ انداز میں جزئیات نگاری کے ساتھ کیا ہے کہ پوری تصویر نظروں میں گھوم جاتی ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''جب وہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہوتو اس کے مسخرے کیریکٹر میں سونے پہ سہاگہ کا کام ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ لہراتے اور جھومتے ہوئے کوٹ پتلون کپور سے لگا تو کھا نہیں سکتے۔ اس لیے اس کے پتلے پتلے جسم کی غمازی کرنے کے فعل میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ دنیا کا بڑا درزی بھی شاید اس منحنی اور لچکیلے جسم پر کسی قسم کا سوٹ فٹ نہ کرسکے۔ ایسے میں نے کئی بار چاہا ہے کہ یوں کوٹ پتلون پہنے ہوئے کپور سے جا کر کہہ دوں۔۔۔ ’طنز نگار! گر تمہارے ہاتھ میں چھڑی دیدی جائے اور سر پر میناری ہیاٹ اور اس کے ساتھ ہی خشخشی

داڑھی کا اضافہ بھی کر دیا جائے تو تم برنارڈ شا معلوم ہونے لگو۔ ممکن ہے میرے اس مذاق کو کپور سنجیدگی کا روپ دے دے اور کسی دن تنہائی میں اپنے لباس کو برنارڈ شا کے معیار کا لباس بنا کر دیکھ لے۔۔۔لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کیلئے شا کی نقل کو بھونڈی نقل سمجھے گا اور کبھی اسے عملی جامہ نہیں پہنائے گا''۔5؎

فکر تونسوی نے ''اپنا خاکہ'' کے عنوان سے خود کا خاکہ بھی لکھا ہے، خود اپنے لباس کا بیان بھی جزئیات نگاری کے ساتھ کیا ہے جس سے خود ان کی شخصیت نظروں کے سامنے آجاتی ہے مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

''گھر میں دھوتی کے بجائے تہبند باندھ کر پھرتا ہوں اکثر اوقات ایک وقت میں ایک ہی تہبند ہوتا ہے۔ دوسرا تہبند پہلے تہبند کی جگہ لے سکتا ہے ورنہ پہلے تہبند کی جگہ بیوی کی سفید ساڑی بھی پُر کر سکتی......چیختی ہے تو چیختی رہے۔ شوہرانہ بے تکلفی کا اتنا بھی فائدہ نہ اٹھایا جائے اسے چیخ چلاّہٹ سے بچنا ہے تو خرید کر لا دے ایک تہبند۔ آخر گھر کا راشن، گھی تیل، بچوں کے کپڑے، اپنے کپڑے، لکڑی اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں لے ہی آتی ہے بازار سے۔ مجھے بھاؤ تاؤ کرنا آتا تو گھر کی ساری اکانومی یوں بیوی نہ سنبھال لیتی۔ اب جب سنبھال چکی ہے تو میں کیوں تہبند خریدنے کا دردِسر مول لوں۔

چنانچہ سردیوں اور گرمیوں میں پتلونوں، بش شرٹوں، قمیصوں اور بنیانوں کا انتظام، ان کی دھلائی کی ذمہ داری، اُنہیں پریس کرنے کا خرچ سب کچھ بیوی کے ذمے۔ بڑی سگھڑ بیوی ہے' میں احباب کو بڑے فخر کے ساتھ سنایا کرتا ہوں مطلب پرست پرلے سرے کا۔

ڈھلی ہوئی پینٹ اور بش شرٹ وقت پر نہ مل سکے تو بڑے سے بڑے کام کو نظر انداز کر کے پینٹ کے ڈھل جانے پر اپنی ساری قوت مرکوز کر دیتا

ہوں۔ سارے پروگرام کینسل ہو جاتے ہیں۔ سوچتا ہوں، بدی کے معاملے میں
بیٹا تو بن ہی گیا ہوں''۔6

اس اقتباس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فکرتونسوی نے جہاں دیگر شخصیتوں کی عکاسی میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا وہیں اپنی شخصیت کی خامیوں کا بیان بھی بڑی غیر جانبداری سے کر دیا ہے۔

کنہیالال کپور کے بات کرنے کا ایک خاص انداز ہے۔ ان کی باتوں سے نا تو ان کے عالمانہ رنگ کا پتہ چلتا ہے اور نا ہی ان کی ذہنی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ تسلسل کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور ہر دوسرے تیسرے فقرے پر ایک قہقہہ لگاتے ہیں۔ اور ملاقاتی کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کندھوں، پیٹھ، اور زانو پر بھی ہاتھ مارتے تھے۔ جیسا کہ کوئی بڑی بات ہو گئی ہو، ان کے اسی انداز کا ذکر ان کے خاکے میں فکرتونسوی نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اس کی باتیں خاص پیچیدہ نہیں ہوتیں، نہ ان میں عالمانہ رنگ ہوتا ہے اور نہ ان سے کسی ذہنی گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ بے ساختہ تسلسل کے ساتھ باتیں کر رہا ہوتا ہے، جب ہر دوسرے تیسرے فقرے پر وہ ایک جچے تلے قہقہے کے ساتھ ملاقاتی کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے، داد کی تالی بجاتا ہے، اس کے کندھوں پر، پیٹھ پر، زانوں پر ہاتھ مارتا ہے، تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بہت بڑی بات کہی گئی ہے۔ لیکن اس کہی جانے والی بڑی بات کی پوری شدت اس لمحے بالکل محسوس نہیں ہوتی اور بسا اوقات تو حیرت بھی ہوتی ہے کہ کپور نے کوئی خاص اہم اور عظیم بات تو کہی نہیں۔ پھر یہ کامیڈی، یہ قہقہہ کیوں؟ یہ ہاتھ پر ہاتھ مارنا کیسا؟ مگر آپ کپور سے جدا ہو جایئے تو دو تین گھنٹے کے بعد آپ اپنے اندر اس قہقہے کا اثر محسوس کریں گے اور اس شدت کے ساتھ چونک پڑیں گے جیسے واقع کسی بہت بڑی بات پر چونکا جا سکتا ہے۔ بس یہی کپور کی باتوں کا طلسمی

پہلو ہے۔ اتنے لاابالیانہ پن سے، اتنی بے نیازی سے باتیں کرے گا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا کے بڑے بڑے حادثے کو اپنے انداز بیان کی بے پروائی سے یوں بے معنی اور بے اثر بنا کر رکھ دے گا اور آپ کے ذہن پر پڑے ہوئے بوجھ کو یوں ٹل جانے کا اشارہ دے گا کہ ایک بار تو دماغ پر ایک لطیف قسم کا غبار چھا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، کپور سے جدا ہونے کے بعد آپ سوچیے کہ کپور کا قہقہہ بے پناہ معنی پیدا کرتا ہوا آپ کے دل ودماغ میں گونج رہا ہوگا''۔7

کنہیالال کپور کے انداز گفتگو اور قہقہہ لگا کر بات کرنے کی عادت کا ذکر فکر تونوی نے بڑے دلچسپ انداز میں سنایا۔ یہ صرف ان کی شخصیت کے اس پہلو پر مزاحیہ انداز میں نظر ڈالا ہے بلکہ خود اپنی گفتگو اور رفتار کا ذکر بھی بڑے دلکش انداز میں کیا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

''نہ بول چال میں اور نہ رفتار میں کوئی خاص جادو بھرا ہوا ہے رٹے ہوئے، کچھ منطقی قسم کے فقرے زبان سے نکلتے رہتے ہیں۔ جو اثر سے اکثر محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے سنتا زیادہ ہوں، بولتا کم ہوں یعنی اپنی کمزوری چھپانے کے لئے چالاکی کرتا ہوں، ملاقاتی اور مقابل کے سامنے اکثر اثبات میں ''ہوں ہاں'' کر دیتا ہوں۔ یا انکار کرنا ہو تو خاموش ہو جانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اس کے باوجود کئی لوگ منتظر رہتے ہیں کہ میں بھی ''گوہر افشانی کروں'' لیکن گوہر ہوں تو افشاں بھی کیے جائیں۔ اس لئے گاہکوں کو اس جوہری کی دوکان سے مایوس لوٹنا پڑتا ہے''۔8

فکر تونسوی نے اپنے سگریٹ پینے کی عادت کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو سگریٹ پینا پسند نہیں ہے۔ مگر برانڈیڈ سگریٹ پینا پسند کرتے تھے اور وہ برانڈیڈ سگریٹ پینے کے لئے تڑپتے رہتے ہیں اور بہانا بنا بنا کر سگریٹ پیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی سگریٹ نوشی کی اس عادت کا ذکر صفت تکرار، رعایت لفظی

اور محاورے کے ذریعہ کتنی خوبصورتی سے کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

''سگریٹ پیتا نہیں ہوں، پھونکتا ہوں۔ کیسپٹن! کیسپٹن !! کیسپٹن !!! کتنا مکمل برانڈ ہے کم بخت، پیو تو پھلوں کا جوس حلق سے اترتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی طبیعت مچل جاتی ہے۔کیسپٹن پینے کیلیے کیا کیا بہانے نہیں تراشتا ہوں، خواہ مخواہ چائے پی لیتا ہوں تاکہ اس کے بعد کیسپٹن پیا جا سکے۔ بغیر پیاس کے پانی کا گلاس بھر کر پی جاتا ہوں تاکہ کیسپٹن پیا جا سکے بغیر خواہش کے کتاب اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں تاکہ کیسپٹن پیا جا سکے۔ آنکھوں میں نیند اُتار کر پندرہ بیس منٹ کے لیے سو جاتا ہوں تاکہ کیسپٹن پیا جا سکے باغ میں جا کر گھاس کے تختے پر لیٹ جاتا ہوں تاکہ لیٹ کر کیسپٹن پیا جا سکے، میری بہت سی تحریریں، کیسپٹن برانڈ سگریٹ نے لکھی ہیں، کیسپٹن اور قلم دونوں کم بخت اس ہم آہنگی سے چلتے ہیں کہ بسا اوقات تو لکھتے لکھتے قلم کیسپٹن معلوم ہوتا ہے اور کیسپٹن قلم۔ ''اُف کتنا مہنگا ہے کم بخت یہ خوب صورت کیسپٹن!'' میں پاسنگ شو کا تین آنے والا پیکٹ دیکھ کر کہتا ہوں، لیکن پاسنگ شو کا ساتھ دینے سے تو بہتر ہے کہ میں نہ رہوں۔ بلکہ پاسنگ شو ہو جاؤں۔سگریٹ کے معاملے میں تم بور روایت کا شکار ہو۔ میرے سارے دوست میرے انقلابی اور پرولتاری رجحانات کو دیکھ کر طنز کے تیر چلاتے ہیں''۔9

فکر تونسوی نے شخصیات کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو غیر جانبدارانہ انداز میں بیان کیا ہے مثلاً مخمور جالندھری کے خاکے میں ان کی محنت کرنے کی عادت کی ستائش کی ہے وہیں ان کی ملنساری اور دوسروں پر جلد اعتماد کرنے کی کمزوری پر بھی نگاہ ڈالی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''وہ بہت محنتی ہے کام کرنے کی جتنی طاقت میں نے مخمور میں دیکھی اس دور کے بہت کم ادیبوں میں دیکھی ہے۔مخمور جب کام کرنے کے روپ میں آتا ہے

تو اس سرپیر کا ہوش نہیں رہتا۔شاہد وشراب اضافی حیثیت سے اختیار کر جاتے ہیں۔۔۔۔۔ ہرانسان کی طرح مخمور میں کمزوریاں بھی موجود ہیں۔عام طور پر یہ سیدھی سادی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ان میں کوئی الجھن یا اینچ پیچ نہیں ہوتا ہے وہ اپنے ہر ملاقاتی سے جلد گھل مل جاتا ہے اس پر اعتماد کرنے لگ جاتا ہے اسے اپنی آتما کے ایک حصہ میں جگہ دے دیتا۔اس کی حرکات دیکھتا ہے اور پھر انھیں اپنی فطری نجات کی کسوٹی پر پرکھ کر اسے طرح دیتا رہتا ہے اور جب طوفان حد سے گذر جائے تو جھلاہٹ سے ملتا جلتا احتجاج بھی کرتا ہے‘‘۔10؎

مندرہ بالا اقتباس میں سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شخصیات کی عادات واطوار کا بیان پوری ایمانداری و دیانتداری سے کرتے ہیں۔وہ موضوع خاکہ کی خوبیوں اور خامیوں کی عکاسی اس عمدگی سے کرتے ہیں کہ شخصیت اپنے تمام خدوخال کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے،مخمور جالندھری کے خاکے میں ان کی جس کمزوری کا ذکر کیا تھا مثلاً لوگوں سے جلد گھل مل جانے کی عادت کا ذکر کیا وہی عادت فکر تونسوی کی شخصیت میں بھی پائی جاتی ہے اپنی اس کمزوری کا بیان بھی وہ پوری صداقت اور ایمانداری سے اپنے خاکے میں کر دیتے ہیں:

’’بہت جلد گھل مل جاتا ہوں۔اتنا جلدی کہ بعد میں اندر ہی اندر کڑھن بھی شروع ہو جاتی ہے،بظاہر کسی کو رنجیدہ اور ملول ہونے دیتا۔ہر ایک سے خوشی خوشی ملتا ہوں خوشی خوشی رخصت کرتا ہوں۔اگر چہ کئی آدمیوں کے متعلق بعد میں پچھتاتا ہوں۔لیکن اس پچھتاوے میں مایوسی کو دخل دینے سے روک دیتا ہوں انتہائی سختی سے بے حد کرختگی سے‘‘۔11؎

اس اقتباس سے فکر تونسوی کی ملنساری کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں سے کس قدر جلد گھل مل جاتے ہیں اور جب انھیں شخصیت کے مزاج سے واقفیت ہوتی ہے تو اپنی اس کمزوری کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ اپنی ناگواری کا اظہار دوسروں کے آگے نہیں کرتے اس سے اندازہ ہوتا ہے۔

صبر وتحمل بھی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔

فکر تونسوی کے خاکوں میں خاکہ نگاری کے لوازمات بڑی عمدگی سے ملتے ہیں وہ شخصیت کی عکاسی کرتے وقت کبھی مزاحیہ اسلوب سے شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالتے ہیں تو سنجیدہ اور طنزیہ اسلوب کے ذریعہ شخصیت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً احمد ندیم قاسمی کا اپنے زمانے میں بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔سارے لوگ ان کا محفلوں میں بڑا ادب واحترام کرتے تھے۔اس احترام کی وجہ سے لوگوں میں جو خوف رہتا تھا۔اس مرخوبی کی ستائش کرتے ہوئے اپنے طنزیہ انداز میں فرماتے ہیں:

> ''احترام!احترام!احترام!ندیم قاسمی آرہا ہے باادب باملاحظہ ہوشیار!اور فرط احترام سے ساری کائنات دم بخود ہوجاتی ہے۔یہ ایک عجیب قسم کا پرمسرت خوف ہے جو ندیم قاسمی کے آتے ہی محفل میں طاری ہوجاتا ہے اور سب حاضرین اس جادو بھرے خوف میں لپٹے لپٹائے جھولتے رہتے ہیں''۔12

فکر تونسوی نہ صرف موضوع خاکہ کی خامیوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ خود اپنے خاکے میں بھی غیر جانبداری برتتے ہیں اور خود اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنانے میں تامل نہیں کرتے مثلاً وہ فرماتے ہیں:

> ضد کرنا۔اپنی بات پر اڑ جاتا۔انھیں میرے کردار سے کوئی لگاؤ نہیں۔لیکن ا کے باوجود ضد کرتا ہوں،اپنی بات پر اڑ جاتا ہوں اور یوں محسوس کرنے لگتا ہوں جیسے واقعی میں ضدی اور اڑیل ہوں،چنانچہ ان بناوٹی احساسات کو اصلی رنگ دینے کے لیے اڑیل اور ضدی لوگوں کی طرح عجیب وغریب حرکات بھی کرنے لگتا ہوں اور بسا اوقات لوگ دھوکا بھی کھا جاتے ہیں،لیکن مجھے علم ہوتا ہے کہ بنیاد ہوا پر رکھی گئی ہے۔میرا کوئی بھی موڈ کسی بھی وقت ان بادلوں کو تتّر بتّر کرسکتا ہے۔

''چنانچہ بادل تتر بتر ہوجاتے ہیں مطلع صاف ہوجاتا ہے اور سیدھا سادا چاند کھلے آسمان پر چمکنے لگتا ہے، لوگ حیران ہوجاتے ہیں، دانتوں میں انگلیاں دباتے ہیں۔ کئی ایک اُلجھ جاتے ہیں۔ کئی ایک بدگمان ہوجاتے ہیں۔ کئی ایک فرطِ مسرت سے تالیاں پیٹتے ہیں۔ اور یوں میری اعصابی جنگ ختم ہوجاتے ہیں''۔13؎

فکر تونسوی کتنی سادگی سے اپنی شخصیت کی عکاسی کی ہے کہ ان کی شخصیت ہو بہ ہو نظروں میں جھومنے لگتی ہے۔ اس اقتباس میں ان کے اسلوب کی خوبیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے ان کی نثر دلکش و شگفتہ ہے۔ محاوروں کے عمدہ اسلوب سے اپنی نثر کو تازگی و حسن بخشتا ہے اسلوب کو پُر لطف آنے لگتا ہے۔

فکر تونسوی کے اسلوب کی ایک اور خصوصیت تکرار اور رعایت لفظی ہے یعنی ایک ہی لفظ کی رعایت سے کئی جملے بنا دیتے ہیں اور اس کے خوبصورت استعمال سے تحریر کو جاندار اور لطیف و شگفتہ بنا دیتے ہیں خصوصاً مزاحیہ اسلوب کے لیے اس کا بھرپور استعمال کرتے ہیں، مثلاً کنہیا لال کپور کے متعلق ان کی رائے ہے کہ وہ بہادر نہیں تھے۔ کیوں کہ وہ اپنے مخالف کو کبھی کوئی چیلنج نہیں کرتے تھے لیکن ان کے یہاں جو طنز آیا ہے اسے وہ ان کا مزاج کا حصہ نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہوئے اسلوب کا بڑا عمدہ استعمال کیا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

''کپور اس قسم کا بہادر آدمی بھی نہیں ہے کہ اپنے مخالف کی بے باکانہ چیلنج کر سکے۔ اپنے بل بوتے پر اعتماد کر کے اسے محاربے کے لیے پکار سکے۔ اگرچہ ایک طنز نگار کی زندگی اپنے حادثوں کے امکانات سے بھرپور ہوجاتی ہے۔ جن کی وجہ سے مخالفین کی ایک عجیب و غریب جماعت پیدا ہوجاتی ہے اور کپور کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے وہ اگر کوئی چوٹ کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ چوٹ کرنے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے، تو بعض چوٹ سہنے والے بلبلا اٹھتے ہیں اور جب یہ بھی دیکھتے ہیں کہ

چوٹ لگانیوالا کپور جیسا منحنی اور دبلا پتلا شخص ہے تو آنکھیں بھی نکالنے لگتے ہیں۔ اگر جواب میں کپور بھی آنکھیں نکالا سکتا تو شاید کپور آج اپنی شکست خوردہ حالت میں دکھائی نہ دیتا۔اس کی شخصیت کے تمام خطوط اس امر کی غمازی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ مجھ سے تمہیں کیا لینا ہے بھائی میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، میں تمہارا کچھ بگاڑ بھی کیا سکتا ہوں میں تو ایک شریف سا انسان ہوں۔ باقی رہی طنز وہ تو میرے بس کا روگ نہیں۔اس پر میرا کچھ اختیار بھی نہیں۔ وہ تو میری فطرت میں بغیراتہ پتہ لگائے داخل ہوگئی کہ اس افلاس زدہ، ہڈیوں کے ڈھانچے اور کمزور سے انسان کے اندر داخل ہوتا اس کے ساتھ مذاق کرنا تو نہیں''۔14

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو فکر تونسوی نے خاکہ نگاری میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے،ان کے خاکوں میں زبان و بیان اور اسلوب نگارش کے لحاظ جدت کا احساس ہوتا ہے۔انھوں نے شخصیات کے حلیے اور عادات واطوار کے بیان میں وہ تفصیل سے کام لیتے ہیں۔خصوصاً شخصیت کی تصویر کشی کے وقت جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اور محاوروں، رعایت لفظی کے ذریعہ اپنے اسلوب کو حسن و توانائی بخشتا ہے۔

☆☆☆

حواشی

1. اردو ادب میں خاکہ نگاری، صابرہ سعید، ص:272
2. کنہیا لال کپو ر، مشمولہ، اردو ادب کے بہترین شخصی خاکے ،جلد دوم، کاک آفسٹ پرنٹرس، دہلی، 2007، ص:586
3. کنہیالال کپور، مشمولہ، ردو کے بہترین شخصی خاکے، ص:588
4. احمد ندیم قاسمی، مشمولہ، خدوخال، ص:40
5. کنہیالال کپور، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:589
6. اپنا خاکہ، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:158
7. کنہیالال کپور، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:591
8. آپنا خاکہ، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:158
9. اپنا خاکہ، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:159
10. مخمور جالندھری، مشمولہ، خدوخال، ص:133
11. اپنا خاکہ، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:159
12. اردو ادب میں خاکہ نگاری، صابرہ سعید، ص:274
13. اپنا خاکہ، مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص:155
14. کنہیالال کپور، مشمولہ، اردو کے بہترین شخص خاکے، جلد دوم، ص:594

☆☆☆

شفیق الرحمٰن (پیدائش1920۔وفات2000)

شفیق الرحمٰن 9/نومبر 1920ء کو پیدا ہوئے اور 19/مارچ 2000ء کو ان کا انتقال ہوا۔ بحیثیت ادیب ان کی شہرت کی اصل وجہ ان کا مغربی طرز کا لطائف آمیز افسانوی اسلوب ہے۔ جوان کے مضامین، افسانوں اور پیروڈیوں میں واضح طور پر دیکھائی دیتا ہے۔ان کی تحریروں میں اگرچہ بعض مخصوص کردار بھی نظر آتے ہیں۔جن کی پیشکش دیکھتے ہوئے ان کی شگفتہ، شخصیت نگاری کی مہارت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

شفیق الرحمٰن کے مضامین کا مجموعہ ''دریچے'' ہیں جو 1989ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں زیادہ تر مضامین شخصی نوعیت کے ہیں۔ان میں تین شخصیتوں کے مضامین اہمیت رکھتے ہیں،ان میں فکرتونسوی، ضمیرجعفری اورابن انشاءاہم ہیں۔

اس مجموعے میں پہلا مضمون ایک نٹرویو کی صورت میں ہے۔فکرتونسوی کا مضمون ان کے فکرو فن پر انوکھے اور منفرد انداز کا مضمون ہے۔اس مضمون میں ان کی شخصیت کے کئی گوشے نمایاں ہوگئے ہیں۔ان کے ہم عمر دو مزاح نگار سید ضمیر جعفری اور ابن انشاء کے خاکے بھی شامل ہیں۔اس میں ان شخصیات کے علاوہ ان کے فن پر بھی مختصراًروشنی ڈالی گئی ہے۔

فکرتونسوی سے شفیق الرحمٰن کی پہلی ملاقات پنجاب کے ایک قصبے میں ہوئی تھی۔اس وقت وہ

پنجاب میں وہ مویشی گنتے کا کام کرتے تھے اپنے کام کے سلسلے میں انھوں نے فکر تونسوی سے ملاقات کرنے گئے تو ان کی ذہانت اور رکھ رکھاؤ سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اپنی پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کا ذکر انھوں نے یوں کیا ہے:

''رفیق دیرینہ فکر تونسوی صاحب سے بڑی پرانی دوستی ہے۔ تب سے جب میں پنجاب کے جنوبی حصے میں مویشی گنتے کے عہدے پر فائز تھا۔ انہیں دنوں دورے پر ایک قصبے میں گیا تو ایک دکان پر پھرتیلے سے نوجوان کو دیکھا جس سے دکاندار بڑے ادب سے پیش آرہا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ اس علاقے کے مشہور شاعر فکر تونسوی ہیں۔ جب میں نے بتایا کہ مجھے اچھے اشعار سننے کا شوق رہا ہے تو فکر نے مجھے لسّی پینے کی دعوت دی جو میں نے فوراً قبول کر لی۔ پھر باتوں باتوں میں کہا کہ اگر وہ ان حضرات سے بات چیت کرادیں جو ڈیوٹی کے سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہوں تو ممنون ہوں گا۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے متعلقہ لوگوں سے ملایا۔ فکر کی ذہانت اور سوشل رکھ رکھاؤ سے میں بہت متاثر ہوا۔

پھر چلتے وقت انھوں نے مشورہ دیا کہ حیوانات کی بجائے اگر میں انسانوں کی طرف رجوع کروں تو مستقبل بہتر ہوسکتا ہے یعنی میرا مستقبل یہ تھی فکر تونسوی سے پہلی ملاقات''۔1

فکر تونسوی نے اپنے خاکوں میں شخصیات کا حلیہ بھی بڑی خوبی سے بیان کیا ہے، عموماً وہ مزاحیہ انداز میں موضوع خاکہ خدوخال اور حلیہ کا بیان کرتے مثال کے طور پر پدرم سلطانی بہت دبلے انسان تھے مزاحیہ انداز میں ان کے دبلے پن کا بیان یوں کیا ہے کہ لطف آتا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''اس قدر دُبلے پتلے ہیں کہ پہلی مرتبہ نظر نہیں آتے۔ اچھی طرح دیکھنے کے لئے تین چار مرتبہ غور سے دیکھنا پڑتا ہے''۔2

پدرم سلطانی ایک فرض کردار ہے۔ اس کے باوجود اس کردار کو انھوں اس عمدگی سے تخلیق کیا

کہ وہ حقیقی اور جیتا جاگتا کردار معلوم ہوتا ہے۔

اس مجموعے میں ایک دلچسپ خاکہ ریحانہ خانم کا ہے انھوں نے ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ان کی نظر کمزور تھی لیکن وہ چشمہ نہیں پہننا چاہتی تھیں اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے بناتی تھیں ان کی اپنی عمر چھپانے اور چشمہ سے گریز کرنے کی عادت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''آپ کی نظر شروع سے کمزور رہی لیکن عینک سے چڑ تھی اس لئے بینائی ٹسٹ کرنے کے چارٹ (جن پر مختلف حروف چھپے ہوتے ہیں) زبانی رٹ، جب عزیز و اقارب عینک لگوانے کا مشورہ دیتے تو آپ آنکھوں کے اسپیشلسٹ کے سامنے وہ حروف (بغیر دیکھے) فرفر پڑھ کر سنا دیتیں۔
>
> پہلے آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ پچیس سال سے پہلے شادی نہیں کریں گی لیکن بعد میں مجبوراً طے کرنا پڑا کہ جب تک شادی نہ ہوسکی پچیس برس کی رہیں گی''۔3

انھوں نے شخصیات کی عادات و اطوار کا بیان انھوں نے مزاحیہ انداز میں ہے، مثلاً بی۔ایل۔مفکر کی یہ دات تھی کہ مرچیں اور تمباکو ان کے غذا کی اہم ترین اشیاء تھیں۔۔وہ انھیں استعمال کرتے تھے اور مرض کو ختم کرنے کے لیے متفرق دواؤں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ان کی ان عادتوں کا ذکر انھوں نے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے:

> ''ہاضم دوائیاں ان کا کھانا (مرچ مصالحے) ہضم کرتی ہیں۔خواب آور دوائیوں سے نیند آتی ہے۔اسپرین سے پُراسرار درد دُور ہوتے ہیں۔سکون پیدا کرنے والی گولیوں سے زبردستی پیدا کیا ہوا ذہنی انتشار کچھ دیر کے لئے کم ہوجاتا ہے (پتہ نہیں ان کے اپنے اعضاء دن بھر کیا کرتے ہیں)''۔4

ش۔م۔میر کا اہم مشغلہ اخبارات میں چھپنے والے ہر طرح کے خطوط کی تردید کرنا تھا۔اخباروں کے ایڈیٹروں کو خط لکھنا ہی ان کا مشغلہ تھا ان کی اس خامی کا بیان شفیق الرحمٰن یوں کرتے تھے:

''اخباروں کے ایڈیٹروں کے نام لگا تار خطوط لکھنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ کبھی اخبار میں کسی شخص کا کیسے ہی موضوع پر خط چھپے آپ فوراًاس کی تردید کرتے ہیں۔مثلاًاگر کوئی یہ کہے کہ سورج مغرب میں غروب ہوتا ہے، تو آپ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ بیان غلط ہے سورج یا تو مغرب مغرب، جنوب میں غروب ہوتا ہے یا پھر مغرب شمال مغرب میں''۔5

مسٹر منظور افضل کو شکار کھیلنے کا شوق تھا۔ انھوں نے چند ماہ مشق کر کے شکار کھیلنا سیکھا تھا۔ ہر کام حساب کتاب کر کے کرتے تھے، چنانچہ وہ بھی حساب کتاب کر کے کھیلتے تھے۔ان کی ایسی عادت پر وہ پرلطف انداز میں یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''چند دوستوں نے شکار کا شوق دلایا۔ چند ماہ کی مشق کے بعد آپ نے حسب لگایا کہ اکٹھے کارتوس خریدے جائیں تو ایک کارتوس تقریباً دس آنے کا پڑتا ہے اور عام شکاریوں کے نشانے کے مطابق ایک تیتر یا بٹیر پر کم ازکم پانچ چھ فائر کرنے پڑتے ہیں۔ اور گرتے گرتے ان میں سے کچھ پرندے جھاڑیوں میں کھو بھی جاتے ہیں)

یعنی ایک مختصر سا پرندہ اتنے کا نہیں پڑتا جس قدر اس پر صرف کیا جاتا ہے۔ اتنی ہی قیمت سے ایک چھوٹا مرغ یا دو چوزے بآسانی خریدے جاسکتے ہیں۔نہ پندرہ بیس میل پیدل چلنا پڑتا ہے اور نہ شکار کے سلسلے میں لاف زنی کرتے ہوئے جھوٹ موٹ کے قصے گھڑنے پڑتے ہیں''۔6

مہر نگار زریں ایک ڈاکٹر تھیں۔ وہ اکثر مریض بچوں کو اپنے بچے سمجھ کر ڈانتی رہتی تھیں۔ کئی بار اپنے ہی بچوں کو مریض سمجھ کر فیس بھی مانگ لیتی ہیں۔ان کی اس خاصیت کو مزاحیہ انداز میں یوں بیان کیا:

1979ء ڈاکٹری شروع تو کی لیکن اس طرح کہ مریضوں کو دیکھتے وقت

اپنے بچوں کا ادھیان رہتا ۔ بچوں کی دیکھ بھال کے دوران مریض ذہن میں رہتے ۔۔اور یہ کیفیت تھی کہ کئی مریضوں کو بچوں کی طرح ڈانٹ دیا کہ فوراً ہاتھ منہ دھو کر آؤ ، یا اپنے جوتے بدلو، قمیض صاف نہیں، شرارتیں مت کرو، وغیرہ۔ اُدھر کبھی کبھی ساتوں بچوں کو نسخے پکڑا دیتیں، اور بے خبری میں ان سے فیس بھی مانگ لیتیں''۔7

منشی اعجاز حسن محتسب وہ ایک شریف انسان ہیں۔ وہ باہر جاتے ہیں تو ہمیشہ اپنی نظریں نیچے رکھتے ہیں۔ان کی اس عادت کی وجہ سے کئی مرتبہ انھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ شفیق الرحمٰن ان کی اس شرافت کو بیان دلچسپ انداز میں کیا ہے مثلاً لکھتے ہیں:

''نہایت شریف النفس ہیں۔ باہر نکلتے ہیں تو ہمیشہ نظریں نیچی کر کے چلتے ہیں۔ لوگوں سے اکثر ٹکرا جاتے کئی مرتبہ ٹانگوں ،موٹروں کے نیچے آتے آتے بچے''۔ 8

انھوں نے اپنے خاکوں کے کرداروں کی صفات کا بیان بڑے دلکش انداز میں کرتے ہیں مثلاً ،از بررومانی ایک نازک مزاج آدمی ہیں۔ان کی نازک مزاجی کا یہ حال تھا کہ جو چیزیں کھاتے تھے ان کے بدن کے اسی حصے میں درد ہونے لگتا۔ان کی اس نازک مزاجی کا بیان دلچسپ انداز میں کرتے ہیں:

''بڑے نازک مزاج ہیں۔ایک دعوت میں سری پائے نوش کئے تو ذرا دیر بعد سر میں درد ہوگیا اور پاؤں میں موج آ گئی''۔9

اظہر سماجی ایک شاعر تھے، وہ شاعری از بررومانی کو کھری کھری سنانے کے لئے کیا کرتے تھے۔ان کی شاعری کی اس خصوصیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

'' آپ بھی شاعر ہیں اور زنداں ،خرابے،خوناب ، سامراج طبقاتی شعور وغیرہ پر جان چھڑکتے ہیں، دراصل آپ شاعری اس لئے کرتے ہیں از بررومانی کی خبر لے سکیں''۔10

آغا حکیم اختر کی ایک الگ شخصیت تھی ان کے بغیر محلے کا کوئی غیر اہم واقعہ یا شہر کی کوئی اوٹ پٹانگ حرکت مکمل نہیں ہوتی تھی، ان کی شخصیت کے اس پہلو کی نشاندہی شفیق الرحمٰن یوں کرتے ہیں:

> ''آپ جانتے ہیں کہ دعوتوں میں چوہدری صاحب سے لوگ متاثر محض اس لئے ہوتے کیونکہ موصوف بالکل خاموش بیٹھے رہتے ہیں اور یہ کہ خواجہ جو اتنے موٹے ہیں اور ہر وقت بھوک اڑ جانے کی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ وہ سوائے ناشتے، لنچ اور ڈنر کے کچھ بھی تو نہیں کھاتے۔ آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ پڑوسیوں کے ہاں شور مچانا بند کیوں ہو گیا ہے، اور شیخ صاحب خواہ مخواہ خوش اس لئے رہنے لگے ہیں کہ قنوطی لوگوں سے ادھار لینا شروع کر دیا ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ قنوطی کو قرض کی واپسی کی امید ہی نہیں ہوتی''۔11

بی۔ایل مفکر کتابیں پڑھ کی اس میں سے ایک مہلک بیماری کو انتخاب کرتے ہیں مثلاً وہ دق کے مرض میں اس وقف تک مبتلا رہے جب تک کہ کوئی دوسری مہلک بیماری ان کو کتابوں میں نظر نہ آتی۔ چنانچہ ان کی اس عادت کے متعلق شفیق الرحمٰن دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''گھر کا طبیب، خانگی وید، گھریلو ڈاکٹر، کی قسم کی کتابیں بڑے انہاک سے پڑھتے ہیں۔ ان میں سے ایک مہلک سی بیماری منتخب کر کے اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس وقت تک مبتلا رہتے ہیں۔ جب تک اس سے بہتر مہلک بیماری نہیں مل جاتی۔
>
> 1963ء میں دق کے مریض بنے رہے، پھر کسی نے بتایا کہ دق کا تو علاج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ 64ء میں اپنے لئے ضعف دل تجویز فرمایا۔ 65 میں خون کے کم دباؤ کی شکایت رہی۔ 66ء میں خون کے زیادہ دباؤ کی اور 67 میں نارمل دباؤ کی۔ پھر دو سال تک گردے کی بیماریاں۔ (ایک ایک کر کے سب)
>
> کسی نے طبی رسالے میں پڑھایا کہ جگر کی رسولی بری خطرناک ہوتی ہے،

لہٰذا70 میں جگر کی رسولی۔

اب تک متعدد جان لیوا بیماریوں کے مریض رہ چکے ہیں (اور متعدد ڈاکٹروں
میں سے کچھ کو اور زیادہ امیر بنا چکے ہیں، اور کچھ کی زندگیاں تباہ کر چکے ہیں)12؎

نسیم اے ڈی کو سوتے وقت قراٹے لینے کی عادت تھی ان کے خراٹے ایسے ہوتے تھے، کہ خود ان خراٹوں کی آواز کو سن کر وہ نیند سے جاگ جاتے تھے، چنانچہ شفیق الرحمٰن مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

''چوبیس گھنٹوں میں سے پندرہ سولہ گھنٹے سو کر گزارتے ہیں۔ اور اتنے زور
سے خراٹے لیتے ہیں کہ خود بار بار جاگ اٹھتے ہیں''۔13؎

شفیق الرحمٰن اپنے خاکوں میں موضوع خاکہ کی بعض خامیوں کا بیان بھی بڑے پر لطف اور شگفتہ انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً منشی اعجاز حسن محتسب کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی ان سے ملنے کے لیے آتا تھا۔ تو سلام کر کے پوچھتے تھے کہ کام کیا ہے ان کی اس صاف گوئی اس قودر تھی کہ جو کام وہ خود جوانی میں کرنا پسند کرتے تھے اور جب کسی اور نوجوان نے کر دیا تو خفا ہو جاتے تھے ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر شفیق الرحمٰن نے یوں روشنی ڈالی ہے:

''بڑے صاف گو ہیں۔ کوئی ملنے جائے تو وعلیکم السلام کے بعد پوچھتے ہیں کہ
کیا کام ہے!
ایک مرتبہ اسی ایک ترقی پسند شعر سن کر بولے لاحول ولا قوۃ الا بلا۔۔۔۔۔
مگر بھئی سبحان اللہ''۔
اکثر نوجوانوں کو نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔
جو حرکتیں جوانی میں خود کرنا اہتے تھے۔ اگر کسی نوعمر کرتے دیکھ پائیں تو خفا
ہو جاتے ہیں اور اسے برا بھلا کہنے لگتے ہیں''۔14؎

ان متذکرہ مثالوں کے علاوہ اس مجموعے میں کام چور بھوت کے عنوان سے چند فرض

کرداروں کا افسانوی انداز میں لکھا ہوا ایک خاکہ ہے۔اس کا مرکزی کردار ایک روایتی قسم کا گپ باز شکاری ہے۔اسی طرح ایک مضمون ''استفسارات وجوابات'' کی بڑی عمدہ پیروڈی ہے۔مثال کے طور پر ایک اقتباس ذیل میں درج ہے:

''سوال: پڑوس سے رات بھر کھانسنے کی آواز آتی ہے جس سے سونا محال ہوجاتا ہے۔بار بار جھانک کر دیکھتا ہوں (بعض اوقات ٹارچ کی مدد سے) کہ ایسی بھیانک اور کرفت کھانسی کس کی ہوسکتی ہے لیکن نیچے احاطے میں فقط چند اونٹ اور بیل بندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

پڑوسی غصیل ور بے مروت سے لوگ ہیں اس لئے ان سے پوچھنے کو جی نہیں چاہتا۔متواتر جھانک جھانک کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رات کو وہ بیل اور اُونٹ ہی کھانستے ہوں گے آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اُونٹ اور بیل کیوں کر کھانس سکتے ہیں جب کہ وہ نہ سگریٹ پیتے ہیں نہ حقے''۔15؎

اسیک اور مثال خاکہ ''استفسارات وجوابات'' سے ملاحظہ کیجئے:

''سوال: میرے خیال میں مغربی لباس کا سب سے تکلیف دہ جزو ٹائی ہے، یہ قطعاً فضول معلوم ہوتی ہے، ادھر ہم ہیں کہ سب کے ٹائی کے شوقین ایسا کیوں ہے۔کیا آپ ٹائی کا ایک بھی فائدہ گنوا سکتے ہیں؟

جواب: ٹائی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسے اتارتے وقت بڑی فرصت محسوس ہوتی ہے''۔16؎

چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں جو لطائف کی صورت میں نظر آتی ہیں:

''سوال: ہمارے پڑوس میں دھوبی گھاٹ ہے۔دھوبیوں کا کتا دن بھر ہمارے گھر بیٹھا رہتا ہے۔نکلتا ہی نہیں۔بتائیے کیا کریں۔

جواب : غالبًا بیچارہ کہاوت کے سلسلے میں آجانا ہوگا۔ اسے کچھ کہا کریں''۔17؎

سوال: میں کافی عرصے سے پی۔ایچ۔ڈی کے لئے کوشش کر رہی ہوں۔ ابھی تک کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن میرے بال جو کبھی گھنے اور لمبے تھے۔لگاتار جھڑ رہے ہیں۔خصوصاً خزاں کے موسم میں تو بہت زیادہ تعداد میں جھڑتے ہیں۔کوئی علاج بتائیے۔

جواب: پی۔ایچ۔ڈی اور گھنے بال۔۔۔۔یہ دونوں چیزیں ہمیشہ متضاد رہی ہیں۔یا تو آپ ان دونوں میں سے ایک کو چن لیں لیں یا پھر بالوں میں کنگھی بالکل نہ کیا کریں۔اس طرح آپ کو پتہ بھی نہ چل سکے گا کہ بال کس وقت جھڑ گئے اور کتنے تھے۔رہ گیا خزاں اور جھڑاؤ کا معاملہ، سو وہ قدرتی ہے۔اس میں کسی کو دخل نہیں''۔18؎

سوال: میرے شوہر کو آٹھ برس سے دردِ سر کی شکایت ہے۔بہت علاج کئے، لیکن افاقہ نہیں ہوا۔کیا آپ کوئی مشورہ دے سکتے ہیں؟

جواب: آپ کی شادی کتنے سال پہلے ہوئی تھی؟ بہتر ہوگا کہ یہ سوال آپ کے شوہر ہم سے براہ راست پوچھیں''۔19؎

سوال: اتفاق سے میں کافی بھاری بھرکم ہوں۔ورزش اور DIETING کے علاوہ جنہیں میں غیر فطری حرکتیں سمجھتا ہوں۔بہتیرے جتن کئے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ابھی ابھی کسی نے بتایا ہے کہ بار بار مالش کرانے سے وزن کم ہوجاتا ہے کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: بالکل صحیح ہے۔اس سے واقعی وزن کم ہوجاتا ہے۔مالش کرنے والے کا''۔20؎

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفیق الرحمن نے اپنے خاکوں کے مجموعے میں

استفارات وجوابات کے عنوان کے تحت اخبارات میں شائع ہونے والے سوال جواب کو پیروڈی کے انداز میں بیان کیا ہے،اور''عکس تقدیر'' میں ستاروں کی مدد سے قسمت کا حال بتانے والوں پر بڑے لطیف انداز میں طنز بھی کیا ہے۔اس مہینے میں پیدا ہونے والوں کی خصوصیات کے عنوان ہر بھی مضمون لکھا ہے۔اس میں یہ لکھا گیا ہے کہ اس مہینے میں پیدا ہونے والوں میں بے شمار خوبیاں ہوتی ہیں یہ لوگ حسن کے شیدائی اور لذیذ غذاؤں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔خصوصاً شیریں اور مرغن اشیاء کا ذوقِ ضرور ہوتا ہے۔

دریچے کے آخر کے دو مضامین مثلاً'' غار کابت'' اور'' افواہیں'' ہیں،'' غار کابت'' میں ہندو رسم ورواج سے جنم لینے والی کہانی ہے۔جو مصنف کے بچپن کے تجسس سے شروع ہوکر جوانی کی جستجو تک پھیلی ہوئی ہے اور'' افواہیں'' میں دوسری جنگ عظیم کے دوران پیش آنے والے ایک واقعہ کو ڈرامائی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔یہ چھاونی کے کلب میں فیسٹی،نینسی،نوازی،شارٹی اور آبدار کرداروں کے درمیان ہونے والی دلچسپ گفتگو پر مبنی کہانی ہے۔چنانچہ شفیق الرحمٰن کی خاکہ نگاری کے متعلق اشتیاق احمد درک نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یہ تمام اسکیچ شفیق الرحمٰن کے بے ساختہ مزاح کا نہایت عمدہ نمونہ تو ہیں ہی البتہ انہیں پڑھ کے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ خاکہ نگاری کی صنف کی طرف باقاعدہ مائل ہوتے تو اس میدان میں بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ سکتے تھے کہ کسی بھی فرض یا حقیقی شخصیت کے نقوش اور عیب و ہنر جس مہارت اور پر لطف انداز سے وہ بیان کرتے ہیں وہ کسی بھی خاکہ نگار کے لئے قابل رشک ہے''۔21ے

اشتیاق احمد ورک کی اس رائے بلا شبہ اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ اگر شفیق الرحمٰن باقاعدہ طور پر خاکہ نگاری کی طرف مائل ہوتے تو یقیناً اور زیادہ شہرت حاصل کر سکتے تھے۔کیوں کہ انھوں نے اپنے

خاکوں میں اور خاکہ تمام مضامین میں خاکہ نگاری کے لوازمات کو پوری ایمانداری کے ساتھ برتا مثلاً حلیہ نگاری، کردار نگاری شخصیات کو پسند ناپسند، عادتوں اور اچھی بری صفحات کا بیان غیر جانبدرراری اور حقیقت پسندی سے کردی ہے۔ ان کا اسلوب طنزیہ، مزاحیہ ہے انھوں نے کہیں کہیں لطائف کا استعمال کر کے بھی اپنے اسلوب میں دلکشی و دلچسپی پیدا کردی ہے۔ شگفتگی و تازگی بے ساختگی سادگی ان کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔ غرض شفیق الرحمٰن اردو ادب میں اپنے مزاحیہ خاکوں کی بدولت ہمیشہ یاد رکھیں جائیں گے۔

☆☆☆

حواشی

1۔ فکر تونسوی، مشمولہ، دریچے، ص:45

2۔پدرم سلطانی، مشمولہ، دریچے، ص:108

3۔ دریحانہ خانم، مشمولہ، ریچے، ص:113

4۔ بی۔ایل۔مفکر، مشملہ، دریچے، ص:108

5۔ ش۔م۔میر، مشمولہ، دریچے، ص:116

6۔مسٹر منظور افضل، مشمولہ، دریچے، ص:124

7۔ مہر نگار، مشمولہ، دریچے، ص:127

8۔ منشی اعجاز حسن، مشمولہ، دریچے، ص:131

9۔ ازبر رومانی، مشمولہ، دریچے، ص:104

10۔ اظہر سماجی، مشمولہ، دریچے، ص:104

11۔آغا حکیم اختر، مشمولہ، دریچے، ص:105

12۔:بی۔ایل۔مفکر، مشمولہ، دریچے، ص:107

13۔ نسیم۔اے۔ڈی، مشمولہ، دریچے، ص:134

14۔منشی اعجاز حسن، مشمولہ، دریچے، ص:131

15۔ استفسارات وجوابات، مشمولہ، دریچے،ص:14

16۔استفسارات وجوابات، مشمولہ، دریچے،ص:15

17۔استفسارات وجوابات، مشمولہ، دریچے،ص:23

18۔استفسارات وجوابات، مشمولہ، دریچے،ص:24

19۔استفسارات وجوابات، مشمولہ، دریچے،ص:30

20۔استفسارات وجوابات، مشمولہ، دریچے،ص: 15

21۔مزاح اور خاکہ، مشمولہ، اردو نثر میں طنز و مزاح، ص:412

☆☆☆

محمد خالد اختر (پیدائش 1919 ۔وفات 2002)

محمد خالد اختر 1919ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے طنز و مزاح نگاری میں ایک خاص مقام بنایا ہے، وہ معروف مزاح نگار شفیق الرحمٰن کے ہم عصر ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1946ء میں ہوا۔ چراغ حسن حسرت کے ہفت روزہ شیرازہ میں ان کی پہلی مزاحیہ تحریر شائد ہوئی۔ محمد خالد اختر کی پہلی مزاحیہ تصنیف ''ڈیپلو سے نوکوٹ تک'' ہے۔ یہ ان کا مزاحیہ سفرنامہ ہے اس تصنیف کو احمد ندیم قاسمی نے ''ادب لطیف'' میں شائع کیا تھا۔ ان کی دوسری تصانیف میں بیس سو گیارہ، چا کی واڑہ میں وصال، کھویا ہوا افق یا دو سفر، عبدالباقی کی کہانیاں، ابلیس جہاں حیرت میں، وغیرہ شامل ہیں

خالد اختر نے مزاح نگاری کے علاوہ خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے ''کھویا ہوا افق'' ان کے مزاحیہ مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیف ''عبدالباقی کی کہانیاں'' بھی مشہور ہے۔ اس میں شامل دو کرداروں کا شمار اردو کئے مشہور مزاحیہ کرداروں میں ہوتا ہے، مثلاً وہ چچا عبدالباقی اور بھتیجا بختیار کے کردار ہیں۔

محمد خلد اختر نے احمد ندیم قاسمی کے خاکے ''ایک دوست کا مرقع'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ احمد ندیم قاسمی سے پہلی بار 1934ء میں ملے تھے۔ اس وقت خالد اختر ایس۔ای۔کالج بہاول پور میں فرسٹ ائیر کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور احمد ندیم خالد اختر کے سینئیر تھے۔ ان سے پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> '' ندیم میری زندگی میں 1934ء میں آیا، جب میں ایس ۔ ای کالج
> بہاول پور میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ یہ اس کریملن کی طرح پیازی گنبدوں

کی درس گاہ کے ہالوں میں تھا کہ ہم پہلے پہل ملے اور ایسی دوستی کی بنیاد پڑی جو زمانے کی سب تلخ کامیوں اور حادثات کے بعد اب بھی فاتحانہ طور پر زندہ ہے۔ندیم مجھ سے تین سال سینئر تھا۔فورتھ ایئر کا طالب علم!''۔1؎

خالد اختر کے خاکوں میں موضوع خاکہ کی شخصیت کے علاوہ دیگر شخصیات سے بھی تعارف ہوتا ہے اور مثلاً خالد اختر نے احمد ندیم قاسمی کے خاکے میں اپنے ایک استاد پروفیسر پیرزادہ کے حلیہ کا بیان بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''پروفیسر پیرزادہ ہم چھوٹوں کے لیے فی الواقع انگلش لٹریچر کے مندر کا بڑا پروہت (Doyen) تھا۔ اب میں سوچتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ پروفیسر پیرزادہ اتنی بڑی بلا نہ تھا جتنا ہم اسے سمجھتے تھے۔ وہ ایک گول سر، سانولے ربر کے سے چہرے والا پستہ قد شخص تھا جو اٹک اٹک کر ایک (Staccato) اور حکمی لہجے میں پڑھتا تھا۔اس سے بڑی قابلیت اور وسیع علم کا تاثر ہوتا تھا''۔2؎

احمد ندیم قاسمی نے کبھی انگریزی لباس نہیں پہنے تھے۔اور وہ ہمیشہ دیسی لباس پہنتے تھے۔اور پگڑی باندھتے تھے اور یہ پگڑی ان پر بہت سجتی تھی چنانچہ خالد اختر ان کے لباس اور پگڑی کا بیان یوں کرتے ہیں:

''مجھے یاد نہیں کہ کالج میں اس نے کبھی انگریزی لباس پہنا ہو۔وہ ہمیشہ اپنے دیس کا پر رنگ لباس پہنتا تھا۔وہ ہمیشہ ایک بانکی پگڑی پہنتا تھا۔جو صرف اس پر خوب سجتی تھی''۔3؎

احمد ندیم قاسمی کے چوڑی دار پائجامہ پہننے کے واقعہ کو ایک لطیفہ کے ذریعہ بیان کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اس کی یہ ادبی یادیں ہمیشہ پر لطف ہوتی ہیں۔ دوسری بھی کم دلچسپ اور

انوکھی نہیں ہوتیں۔ مثلاً اپنے خط سے فارغ ہوکر وہ یک لخت کہے گا کہ آج اس کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ جب وہ حبیب اشعر صاحب کا دیا ہوا چوڑی دار پاجامہ پہنے گلی میں گذرا تو سب بچے اس کے پیچھے شور مچانے لگے، 'ٹیڈی اوئے ......ٹیڈی اوئے......' اسے جلدی سے ٹانگہ لے کر وہاں سے بھاگنا پڑا اور اس لیے اب وہ چوڑی دار پاجامہ پہننے سے کتراتا ہے''۔4

اس سے احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کے لباس کو زیادہ پسند فرماتے ہیں۔ خالد اختر کے موضوع خاکہ کی پسند ناپسند اور عادتوں کا ذکر مختلف واقعات کے ذریعہ بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا بیان بھی حقیقت پسندی سے کردیا ہے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی دوستی بنانے میں جلد باز تھے دوراسی قدر دوستی نبھاتے بھی تھے۔ مثلاً بت پرستی کی حد تک دوستوں کا خیال رکھتے تھے۔ ان کی اسی کمزوری کا ذکر کرتے ہوئے خالد اختر لکھتے ہیں:

''1937ء سے 1939ء تک وہ اکثر لاہور میں رہا۔ اس کی رہائش ایک گھپ اندھیری کوٹھڑ میں تھی اور کئی کئی دن اس نے فاقے کاٹے۔ لاہور میں وہ اختر شیرانی اور عبدالمجید سالک سے ملا، جنہوں نے اس نوعمر شاعر کے جوہر اور اس کی صلاحیتوں کو پہچانا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اسے وہ سب مکمل اور محبوب انسان لگے۔ ندیم حد درجہ مخلص ہونے کی وجہ سے ہر ایک کو بت پرستی کے حد تک پوجنے لگتا اور آسانی سے متاثر ہوجاتا۔ اس نے ہمیشہ زندگی میں شدید جذباتی دوستیاں بنانے کی کوشش کی ہے''۔5

احمد ندیم قاسمی کے خلوص کی وجہ سے انھیں کئی دفعہ نقصان بھی ہوا لیکن باوجود اس کے انھوں نے دوستی نبھایا اسی خلوص و محبت کے ساتھ۔ ان کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی سے نہ حسد و جلن رکھتے تھے اور نہ کبھی کسی کے خلاف کوئی بات کرتے۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر خالد اختر نے بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے مثلاً لکھتے ہیں:

''اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے اس کا انداز خوش دلانہ اور گرمجوشی کا ہے اور غریب سے غریب آدمی سے متواضع اور پرشفقت! اس پرتنوع کیریرز کے آدمی (محرر، ٹیلی فون آپریٹر، اکسائز سب انسپکٹر، ریڈیو فیچر رائٹر، ایڈیٹر، پبلشر، فکاہیہ نگار، جیل برڈ) کتنی بے پایاں قوت بھری ہوئی ہے۔۔۔۔۔ نامساعد اور کڑے حالات کے باوجود ہمیشہ مسکراتا ہوا۔ میں نے اسے کبھی غصے میں یا کسی کے خلاف کینے سے جلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک ساتھی ادیب نے جس کی اپنی تحریریں چھچھورپنے کی باتوں اور سستی پھبتیوں کا مجموعہ ہوتی ہیں، اپنے ماہنامے میں اس کی افسانہ نگاری اور فکاہیہ نویسی پر اوچھا حملہ کرنا مناسب سمجھا۔ یہ فی الواقع بڑا ہی اوچھا حملہ تھا۔ ندیم نے بڑے لطف سے ان فقروں کو ہمیں پڑھ کر سنایا اور کہا کہ اسے حیرت ہے کہ صاحب موصوف نے، اس کی شاعری کو معاف کر دیا ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ 'وہ اب اس کا جواب نہیں دے گا کیوں کہ وہ صاحب اب واقعی ناراض ہوگئے ہیں۔ ایک شخص جو ناراض ہوگیا ہو نوک جھونک فضول ہے' اس کے ابرو پر ایک چین تک نہ تھی''۔ 6

احمد ندیم قاسمی کے خلوص اور ادبی دیانتداری کا یہ عالم تھا کہ ان کے دوست واحباب میں بہت سے لوگ ان سے ملنے کے لئے ان کے دفتر پر آتے تھے، حالاں کہ کمرہ بہت چھوٹا تھا لیکن خلوص ومحبت کی وجہ سے ملنے والوں کی بڑی تعداد یہاں آیا کرتی تھی ان کی شخصیت کی اسی کشش کا بیان ان کے کمرہ کی منظرکشی کے ذریعہ خالد اختریوں کرتے ہیں:

''یہ مرقع ڈیڑھ دو سال ہوتے ہیں، میں نے لکھا تھا۔ تب اس عمدہ ادبی مجلّے 'فنون' (جسے ندیم ایڈٹ کرتا ہے) کا دفتر بائیبل بک سوسائٹی کے سامنے ایک اسٹیشنر کی دکان کی بالائی منزل پر تھا۔۔۔ ایک چھوٹا سا نیچی چھت کا کمرہ جو ہمیشہ ملنے والوں سے بھرا رہتا تھا۔ اس میں آٹھ نو کرسیاں تھیں لیکن وہ ہمیشہ کم

ہوجاتیں اور اکثر ہمیں ایک کرسی پر دو دو ہو کر بیٹھنا پڑتا''۔7

خاکہ نگاری میں موضوع خاکے کی شخصیت کے پہلو بہ پہلو خاکہ نگار کی شخصیت بھی نمایاں ہوجاتی ہے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کو طویل خط لکھنے کی عادت تھی۔ان کی اس عادت کی عکاسی کرتے ہوئے خالد اختر نے اپنی شخصیت کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اس کے جانے کے بعد ایک مستقل اور لمبی خط و کتابت ہمارے درمیان شروع ہوئی۔اس کے خط کئی کئی صفحوں کے ہوتے تھے اور ہمشہ جذباتی! میرے خط اس کے خطوں سے بھی لمبے ہوتے تھے۔کاش میں ان خطوں کو سنبھال کر رکھتا''۔8

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی جذباتی انسان تھے اور اپنے جذبات کا اظہار طویل طویل خطوط کے ذریعہ خالد اختر سے کرتے تھے یقیناً خالد اختر بھی اسی قدر جذباتی انسان ہوں گے کیوں کہ وہ احمد ندیم قاسمی زیادہ طویل خط لکھا کرتے تھے۔محمد خالد اختر نے احمد ندیم قاسمی کے خاکے میں ان کے حلیے کے علاوہ ان کے والد کا حلیہ بھی دلکش تشبیہات کے زریعہ بیان کیا ہے۔مثال دیکھئے:

''ندیم کو اپنے والد ایک بوڑھے برف جیسی ڈاڑھی والے بزرگ کی حیثیت سے یاد ہیں جو ہمیشہ مصلے پر عبادت میں مصروف رہتے تھے۔دنیا داری کے معاملات میں اتنے معصوم جتنا ایک بچہ اور گھر کی ضروریات کے متعلق قطعاً بیگانہ! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ بے حد مفلس تھے اور اکثر ان پر فاقوں کی نوبت بھی آجاتی''۔9

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے خاکوں میں خاکہ نگاری کے تمام فنی لوزمات کو بڑی خوبصورتی سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ان کے خاکوں میں حلیہ نگاری شخصیات کی پسند ناپسند، ان کی عادات واطوار، ان کے لباس اور رہن سہن، ان کی ملنساری، خلوص ومحبت اور دیگر خوبیوں کے علاوہ ان کی کمزوریوں کا بیان میں غیر جانبداری سے کیا ہے۔ان کے

خاکوں میں اسلوب کی چاشنی، شگفتگی و دلکشی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ دلکش محاوروں اور نادر تشبیہات کے ذریعہ بڑی خوبصورتی سے موضوع خاکہ کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں ان کے خاکوں میں دیگر اشخاص کی شخصیت سے بھی تعارف ہوتا ہے ساتھ ہی خود خاکہ نگار کی شخصیت کے بعض پہلو بھی عیاں ہوتے ہیں غرض ان کی خاکہ نگاری میں خاکہ نگاری کی تمام خصوصیات فنی چابکدستی کے ساتھ بیان ہوئے، ساتھ ہی مزاحیہ اسلوب کا بھی لطف لطیفوں اور مختلف واقعات کی عکاسی کے ذریعہ آتا ہے۔

☆☆☆

حواشی

1۔ ایک دوست کا مرقع، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:510
2۔ ایک دوست کا مرقع، مشموہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دو، ص:570
3۔ ایک دوست کا مرقع، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:574
4۔ ایک دوست کا مرقع، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:585
5۔ ایک دوست کا مرقع، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:577
6۔ ایک دوست کا مرقع، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:584
7۔ ایک دوست کا مرقع، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:568
8۔ ایک دوست کا مرقع، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:576
9۔ ایک دوست کا مرقع، مشمولہ، اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد دوم، ص:573

☆☆☆

یوسف ناظم (پیدائش 2009۔وفات 1921)

یوسف ناظم اردو نثر میں طنز ومزاح کی مشہور ومقبول شخصیت ہیں۔ان کا اصلی نام سید محمد یوسف ہے۔وہ 1921ء میں مہاراشٹرا میں پیدا ہوئے۔ یہ 91 سال کی عمر میں 23/جولائی 2009ء میں ان کا انتقال ہوا۔انھوں نے بی اے اور ایم اے (اردو) کی ڈگری عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے حاصل کی۔انھیں 1984ء میں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ہریانہ کی اردو اکیڈیمی نے انھیں 1992ء میں مہیندر سنگھ بیدی، ایوارڈ سے نوازا ہے۔

یوسف ناظم اٹھارہ تصانیف کے مصنف ہیں۔انھوں نے اپنی تصانیف میں سماج کے مختلف مسائل کی طرف طنز ومزاح کے ذریعے توجہ دی ہے۔انھوں نے بچوں کے لیے بھی کئی کتابیں تصنیف کی ہیں اور نظموں کے تراجم بھی کئے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے خاکہ نگاری کی جانب بھی توجہ مبذول کی ہے۔ ان کی خاکہ نگاری کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''سائے ہمسائے'' ہے جو 1975ء میں شائع ہوا۔دوسرا مجموعہ ''ذکر خیر'' کے عنوان سے 1982ء میں منظر عام پر آیا۔ڈاکٹر اشتیاق احمد ورک ان کے خاکوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یوسف ناظم کی پہچان بھی اگرچہ خاکہ نگار کی بجائے مضمون نگار کی حیثیت سے ہے لیکن پھر بھی ان کی کتابیں ''سائے ہمسائے'' (1975ء) اور ''ذکر خیر'' (1982ء) میں چند ادیبوں، شاعروں کے خاکے مل جاتے ہیں جو شگفتہ انداز

میں لکھے گئے ہیں''۔1؎

یوسف ناظم نے ان شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں جن سے ان کے قریبی روابط اور دوستانہ تعلقات رہے ہیں اور یہ تمام خاکے کسی نہ کسی موقع کے لیے لکھے گئے ہیں۔

''سائے ہمسائے'' میں پہلا خاکہ اشفاق حسین کا ہے۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے یوسف ناظم نے لکھا ہے کہ وہ مولوی عبدالحق کی یادگاروں میں سے ایک یادگار ہیں اور اشفاق حسین اپنے ضلع کے پہلے پڑھے لکھے شخص تھے۔اس خاکے میں سراپا نگاری کے متعلق کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔

یوسف ناظم کے خاکوں کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خاکوں کی شروعات میں مختلف انداز فلسفیانہ طریقے سے کی ہے۔ جس سے یہ محسوس ہی نہیں ہو پاتا ہے کہ یہاں موضوع خاکہ شخصیت کا ذکر ہونے والا ہے۔ چنانچہ مخدوم محی الدین کے خاکے کی شروعات بھی اسی انداز میں کی گئی ہے مثلاً لکھتے ہیں:

> ''نباتیات یا شاید حیوانیات کی کسی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جیسے جیسے آدمی کی عمر بڑھتی جاتی ہے، وہ بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔مخدوم محی الدین نے بڑے ہی مہذب انداز میں اور نہایت خاموشی کے ساتھ چپائے چپائے اس قاعدے کو غلط بیان ثابت کر دیا''۔2؎

مذکورہ بالا اقتباس کے ذریعہ خاکہ نگاری نے سائنٹفک انداز سے انسان اور نباتات میں ظاہر کے انسانی نشو ونما کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یوسف ناظم کے خاکوں میں موضوع خاکہ کے حلیے اور خدوخال کا ذکر بھی چلتا ہے۔مثلاً بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جس شاعر کی شیروانی کے پورے گیارہ بٹن ہک تک گنے ہوئے ہوں وہ شاعر کسی طرح نظر آئے گا۔اچھا خاصا آدمی دکھائی دے گا۔سلیمان خطیب ہمیشہ مجھے سامعین ہی دکھائی دیئے۔لوگوں میں ایک عرصے تک ان کے متعلق غلط فہمی

پھیلی رہی اور جب بھی یہ اپنی مکمل شیروانی اور روئیں دار دہری تہری ٹوپی کے ساتھ کسی محفل میں ڈائس پر نمودار ہوتے، لوگ انھیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ اب ان کے پیچھے سازندے بھی آئیں گے اور انھیں کوئی پھڑکتی ہوئی چیز سننے کو ملے گی لیکن رفتہ رفتہ لوگ ان کی شاعری اور حلیے کے عادی ہو گئے اور اب انھیں کوئی چیز ناگوار نہیں گزرتی بلکہ اب تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس مصنوعی حلیے کا جو بھی آدمی کہیں نظر آجاتا ہے۔ لوگ اس سے ساس بہو کی نظم سنانے کی فرمائش کر بیٹھتے ہیں اور اس شخص کو بڑی مشکل سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا پڑتا ہے۔ کہ بھائی میں سلیمان خطیب نہیں معقول آدمی ہوں'' ۔3

سلیمان خطیب کے ٹوپی کا ذکر بھی دلچسپ اور مزاحیہ انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''سلیمان خطیب کی شخصیت کا اہم حصہ ان کی وہ ٹوپی ہے جو اگر ان کے سر سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا ہو جائے، تو دنیا خالی خالی نظر آنے لگے۔ عافیت اسی میں ہے کہ یہ ٹوپی جہاں رکھی ہے وہیں رکھی رہے۔ ان کی ٹوپی کے باہر جتنے بال ہیں وہی ان کا کل سرمایہ ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے مینی فیسٹو بھی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ بظاہر زرخیز اور درحقیقت بے فیض۔'' 4

اس اقتباس میں انھوں نے ان کے بالوں کو سیاسی جماعتوں کے مینی فیسٹو سے تشبیہ دی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کو پان کھانے کی عادت تھی۔ اور وہ پان کھاتے وقت کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اپنے پان کی عادت کی وجہ سے وہ خود ہی نہیں بلکہ دوسروں کے کپڑوں کو بھی لال کر دیتے تھے۔ پان ان کی کمزوری تھی۔ ایک مرتبہ بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے تھے جو بھی ان سے ملنے کے لیے اسپتال آتا تو ان کے کمرے تک جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ وہ نرسنگ ہوم کے قریب کے دکان سے پان کی دکان ہی میں مل جاتے تھے۔ ان کی پان کھانے کی اس عادت کا بیان بڑے پر لطف انداز میں محاوروں، تلمیح اور صنعت تجنیس اور الفاظ کی الٹ پھیر سے روشنی ڈالی ہے:

''لڑکپن کے ہم ساز راجندر سنگھ بیدی آگے چل کر دوستوں سے دم ساز تو بنے لیکن زمانہ ساز نہ بن سکے۔ یہ فن انھیں نہیں آیا۔ وہ بس دوستوں پر جان اور محفلوں پر پان چھڑکتے رہے۔ جب وہ بے تحاشہ پان کھاتے تھے تو نہ رستم کی پروا کرتے تھے نہ سکندر کی۔ ان کے اپنے کپڑے تو ان کے اپنے ہی کپڑے تھے لیکن دوسروں کے کپڑوں سے بھی انھوں نے غیریت نہیں برتی۔ ان کا مخاطب ہمیشہ لہولہان ہو جاتا تھا۔ کہتے تھے یہ خلوص کی نشانی ہے اور کیا یاد کروگے کہ کسی رئیس سے سابقہ پڑا تھا۔ ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو کھاؤ (بمبئی) کے کسی نرسنگ ہوم میں رکھے گئے۔ جب بھی ان کے تیمارداران سے ملنے جاتے انھیں نرسنگ ہوم میں داخل ہو کر ان کے کمرے تک جانے کی کبھی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ راجندر سنگھ بیدی نرسنگ ہوم کے قریب ہی کی ایک پان کی دکان پر کھڑے مل جاتے۔ کئی پان ان کے منہ میں اور پانوں کا ایک پلندہ ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ اس بات کو ہوئے کئی سال ہو گئے لیکن وہ دکان دار اب بھی نرسنگ ہوم جا کر کسی نہ کسی ملازم سے ضرور پوچھ آتا ہے۔ بھائی صاحب! وہ سردار جی پھر بیمار نہیں ہوئے۔ میرا کاروبار مندا پڑا ہے۔ انھیں کسی طرح بلائے۔ کہتے تھے۔ ان کی دکان پر مجھے بار بار اس لیے جانا پڑتا ہے کہ نرسنگ ہوم میں کھانا ہی کتنا ملتا ہے۔ پان انھوں نے کبھی گن کر نہیں کھائے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ گننے سے پان کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ پان میں وہ تمباکو اس مقدار میں ڈالتے ہیں کہ پھر پان کو موڑا نہیں جاسکتا۔ سگریٹیں بھی انھوں نے کم نہیں پی ہیں۔ اصل میں انھوں نے کم وبیش اور بیش وکم کا جھگڑا ہی کبھی مول نہیں لیا''۔5

اقتباس ذرا طویل ہو گیا ہے لیکن ان کے اسلوب کی شگفتگی اور راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت کے اس پہلو کی نشاندہی کے لیے اس کا دینا ضروری تھا۔ یوسف ناظم نے کرشن چندر کی شخصیت پر بھی خاکہ لکھا ہے کرشن چندر کی عادتوں کا ذکر بھی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''کرشن جی دعوتیں کھانے اور کمانے سے زیادہ دعوتیں کھلانے کے بے حد شوقین تھے۔ یہ ان کی دوسری کمزوری تھی۔ پہلی کمزوری کیا تھی۔ مجھے اس کا علم نہیں۔6

انھوں نے نہ صرف موضوع خاکہ کی عادتوں کا ذکر اپنے خاکوں میں کیا بلکہ پسند ناپسند اور شوق کا بیان کیا ہے۔مولانا شہاب کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ شوق ان کی کمزوری تھا چنانچہ اس کمزوری کا بیان وہ یوں کرتے ہیں:

''مولانا شہاب مطالعے سے شوقین یا شائق نہیں،اس کے دیوانے تھے۔ان کی بینائی،ان کی دبیز شیشوں والی عینک انھیں منع کرتی کہ اتنا نہ پڑھا کیجیے۔لیکن وہ ہر چیز پڑھتے تھے۔''7

کرشن چندر کولکھنا بہت پسند تھا مگر وہ لکھنے کے لیے کسی عام قلم اور کاغذ کا استعمال نہیں کرتے تھے ۔قلم اور کاغذ کے انتخاب میں بھی بڑی دلچسپی سے کام لیتے تھے ان کی لکھنے کی اس عادت کو یوسف ناظم پرلطف انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

''کرشن جی لکھنے کے لیے پیدا ہوئے تھے (یہ بات انھیں بھی معلوم تھی) معمولی قلم سے معمولی کاغذ پر لکھنا انھیں پسند تو کیا، گوارا بھی نہیں تھا۔قلم اور کاغذ کے انتخاب میں بڑی دلچسپی لیتے تھے، بلکہ خاص محنت کرتے تھے۔اپنے صدارتی خطبے کے لیے انھوں نے عابد روڈ کی ایک دکان سے بڑا خوبصورت پیڈ خریدا تھا (دکان دار انھیں بار بار دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ صاحب رائٹنگ پیڈ خرید رہے ہیں یا دکان) کوئی 30 منٹ لگے ہوں گے۔اچھے کاغذ پر لکھنا ان کی پرانی عادت تھی اب تو اتنا نفیس کاغذ کہیں نظر بھی نہیں آتا''۔8

راجندر سنگھ بیدی کو گوشت کھانا بہت پسند تھا۔گوشت کھا کر اس کی لذت کی تعریف ضرور کرتے ان کی اس پسند پر مزاحیہ انداز میں یوسف ناظم یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''گوشت خوری ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور مرغی کے شکار کو وہ سب سے بہتر شکار سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں شکار کے لیے بیاباں کیوں جایا جائے۔ دستر خواں ہی کیوں نہ چنا جائے۔ کسی مسلماں دوست کے ہاں کھانا کھاتے تو ضرور داد دیتے اور کہتے گوشت تو مسلمانوں ہی کا کھانا چاہئے''۔9

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور مخدوم کی دوستی بے مثال تھی۔ان کی دوستی اتنی پکی تھی کہ یہ لوگ عادتاً یا مجبوراً ایک دوسرے کی چیزوں کو استعمال کرلیا کرتے تھے۔ یوسف ناظم نے ان کی دوستی کو مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

''مخدوم محی الدین بڑے امداد باہمی قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے راج بہادر گوڑ نے مل کر بڑی مثالی امداد باہمیاں انجام دی ہیں۔غالباً 1944ء میں ان دونوں کے درمیان ایک ہی سوٹ تھا۔جس دن مخدوم کوٹ پہنتے، پتلون بالکل نہیں پہنتے۔لیکن کئی برسوں یہ گرم سوٹ ان دونوں کے پاس رہا لیکن ایک دن بھی ان میں سے کسی کو پورا سوٹ پہننے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ یہ سوٹ اصل میں تھا کس کا''۔10

یوسف ناظم نے اپنے طرز تحریر کے ذریعہ مختلف تجربوں کا بیان کیا ہے۔انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیت سے مختلف گوشوں کو دلچسپ واقعات کے ذریعے پیش کیا ہے۔مزاح ان کی تحریروں کا خاص وصف ہے۔وہ اپنے خاکوں میں شخصیت کی مختلف عادات، اطوار پر طنز بھی کرتے ہیں۔چنانچہ باقر مہدی کی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں۔ملاحظہ فرمائیے:

''اگر سب لوگ پانی کی تلاش میں دریا کی طرف جارہے ہوں اور صرف ایک شخص ریگستان کی سمت جارہا ہو تو وہ تنہا شخص سوائے باقر مہدی کے اور کوئی نہیں ہوسکتا''۔11

یوسف ناظم کا خاکہ ان کے اہم خاکوں میں شامل ہے۔انھوں نے مختصر الفاظ کے ذریعے

باقر مہدی کی پوری شخصیت کو بیان کر دیتے ہیں۔ بقول محمد صدیق نقوی یوسف ناظم کو کوزے کو سمندر میں قید کرنے کا کمال حاصل ہے۔ وہ اختصار ہی میں اپنے فن کا اعجاز دکھاتے ہیں''۔

کرشن چندر کی شخصیت میں حسد جلن نام کی کوئی شئے نہیں تھی۔ بلکہ وہ اپنے احباب کو آگے بڑھتا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ان کی شخصیت کے اس خاص وصف پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''کرشن جی ادیب تھے اور ادیب ہونے کی حیثیت سے انھیں تنگ دل ہونے کا حق تھا لیکن وہ اوروں کو آگے بڑھتا دیکھ کر خوش بلکہ بے حد خوش ہونے والے تھے، کسی ادیب اور شاعر کے بارے میں قلم روک کر مقدمہ لکھنا انھیں مطلق پسند نہ تھا''۔12

بڑے حساب سے کرتے تھے۔ بولتے ضرور تھے لیکن بڑے حساب سے معتدل انداز میں کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر صنعتِ تجنیس کے اس خوبصورت استعمال سے پر لطف انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ظ۔ انصاری تقریر کرتے وقت ہر لفظ کو پہلے تولتے اور پھر بولتے ہیں۔ وہ تولنا بھول سکتے ہیں۔ لیکن بولنا نہیں بھول سکتے۔''13

مولانا شہاب نے بلا کا حافظہ پایا تھا قرآن شریف کی تمام آیتیں انھیں یاد تھیں۔ ان کے حافظ کی خصوصیت کا سابق انھوں نے اس طرح کیا ہے:

''مولانا شہاب جتنے تندرست و توانا تھے، اتنا ہی تندرست و توانا ان کا حافظہ تھا۔ قرآن پاک تو انھوں نے اپنی عمر میں کتنے ہی ختم کیئے ہوں گے انھیں اس عمر میں بھی یاد تھا کہ کون سی آیت کس سورہ میں اور کس پارے میں ہے کوئی بھی پوچھتا تو بتا دیتے''۔14

باقر مہدی اپنے علاوہ دوسروں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کے اس تاریک پہلو پر بڑے مزاحیہ انداز میں انھوں نے روشنی ڈالی ہے:

''باقر مہدی صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلوان کا روادارانہ مزاج ہے اور وہ سب کو یکساں طور پر ناپسند کرتے ہیں۔اس میں وہ شدت اور نرمی کا فرق نہیں برتتے۔ باقر مہدی صاحب اس معاملہ میں بڑی محتاط ہیں اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کی زبان یا قلم سے کسی کے حق میں کوئی کلمہ خیر نہ نکل جائے۔ اتنا محتاط آدمی ہمیں تو کیا باقر مہدی کو آئینے میں بھی نہیں ملے گا۔ باقر مہدی چوں کہ اپنی مثال آپ ہیں اس لیے ان کا عکس بھی ان سے مختلف ہے''۔15؎

یوسف ناظم بڑے عمدہ مزاح نگار تھے۔انھوں نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا۔ ان کی صفات و کردار کا بیان مزاحیہ انداز میں کیا ہے۔مثلاً سکندر علی وجد کم آمیز شخصیت کے مالک تھے۔اور شاعری سے متعلق بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی اس عادت پر مزاحیہ انداز میں یوسف ناظم لکھتے ہیں:

''وجد صاحب جو کہ پہلے ہی سے الگ تھلگ رہنے کے شوقین تھے۔مصنف بننے کے بعد اور بھی کم آمیز بلکہ نا آمیز ہو گئے،کسی کو بھی ملنے کا موقع دیتے تو اس سے پہلے ہی کہہ دیتے شاعری کی بات مت کرنا۔ وہ بے چارہ چپ بیٹھا رہتا۔ کیوں کہ قانون کی بات تو وہ کرنے سے رہا۔ میں نے تو ایک مرتبہ کہا بھی کلام الٰہی سننے کی لوگوں کو اتنی سہولت حاصل ہے لیکن آپ کا کلام سننے میں اتنی دقتیں پیش آتی ہیں نہیں سمجھے۔اس لیے نہیں سمجھے کہ یہ بات میں نے ان سے کبھی کہی ہی نہیں۔ ہر شاعر میں انا ہوتی ہے لیکن الف سے ہوتی ہے۔ان کی انا عین سے تھی۔''16؎

سے حسن نعیم کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ جو بھی کام کرتے اسے بگاڑ دیتے تھے۔ان کی شخصیت کے اس پہلو پر مزاحیہ انداز میں یوں روشنی ڈالی ہے:

''خود اپنا کام بگاڑ لینا بھی ایک فن ہے۔حسن نعیم نے اس میں کمال پیدا کیا ہے۔وہ کہتے ہیں جو بھی کام کرو اس میں کمال حاصل کرو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جب نوجوان تھے تو انھوں نے کوئی کھیل نہیں چھوڑا تھا۔مطلب یہ کہ ہاکی ،فٹ بال،ٹیبل ٹینس اور سبھی کھیل کھیلتے تھے اور خود ان ہی کا بیان ہے علی گڑھ یونیورسٹی کے ٹیبل ٹینس چمپئن تھے (اس وقت کا معیار خواہ کچھ رہا ہو۔چمپئن ہونے کے بہر حال کچھ معنی ہوتے ہیں اور ویسے بھی ٹیبل ٹینس چمپئن ہونے سے شاعری میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا)۔منصوبہ بندی سے انھیں فطرت رغبت ہے۔ منصوبے بنانے میں یہ کسی سرکاری محکمے سے کم نہیں''۔17؎

یوسف ناظم نے ذکر خیر میں ''تپائی'' کے عنوان سے ایک خاکہ لکھا ہے۔اس عنوان سے یہ خاکہ نہیں لگتا ہے بلکہ ایک مضمون معلوم ہوتا ہے۔لیکن اس عنوان کے تحت یوسف ناظم نے تین افسانہ نگاروں کے خاکے لکھے ہیں۔اس میں انور خان،سلام بن رزاق،اور انور قمر کے خاکہ تحریر کئے گئے ہیں۔اس طرح کے خاکے کو اجتماعی خاکہ کہتے ہیں۔جس میں بہ یک وقت کئی شخصیتوں کا ذکر آ جاتا ہے اور اس طرح کے خاکے سے ہم صرف ایک شخص نہیں بلکہ کئی شخصیات سے متعارف ہو سکتے ہیں اس خاکے میں بیک وقت تین افسانہ نگاروں کا تعارف۔یوسف ناظم نے کچھ اس طرح سے کرایا ہے: ملاحظہ کیجیے:

''انور خان،سلام بن رزاق اور انور قمر ہم عصر بھی ہیں اور ہم عمر بھی۔ہم عصری کے لیے ہم عمری کی شرط لازمی نہیں ہے لیکن ان تینوں نے اخلاقاً اس کا لحاظ رکھا ہے اور قریب قریب کی تاریخوں میں نہ صرف پیدا ہوئے بلکہ ان کی افسانہ نگاری کے آغاز کی تاریخوں میں بھی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ان تینوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ 1976ء، 1977، اور 1978 میں سے کوئی سال بچنے نہ پائے۔پہلے ''راستے اور کھڑکیاں کھیلیں'' 1976ء پھر ''ننگی دوپہر میں

سپاہی'' کی روانگی عمل میں آئی، 1977ء۔اس کے بعد معاملہ ''چاندنی'' کے

سپرد ہوا1978ء''۔18

یوسف ناظم نے جہاں شخصیتوں کی خوبیاں بیان کی ہیں وہیں ان کی خامیوں کو بھی پیش کردیا ہے وہ شخصیتوں کی خامیوں کا بیان اس طرح سے کرتے ہیں موضوع خاکہ کو ان پر غصہ نہیں آتا بلکہ ہنسی آجاتی ہے چنانچہ راجندر سنگھ بیدی کے بھولنے کی عادت کے متعلق فرماتے ہیں:

''انگریزی لباس میں پھنسے پھنسائے، اردو افسانے میں بسے بسائے، پنجابی پگڑی میں سجے سجائے اور زعفرانی پتی کے پان میں رنگے رنگائے بیدی صاحب سے آپ جب بھی ملیں پہلے اپنا نام انھیں بتادیں۔ میں ہمیشہ۔ ہی کرتا ہوں''۔19

راجندر سنگھ نے ابتدائے عمر میں ایک مرتبہ کسی کا کلام چرا کر چھپایا تھا جس پر انھیں بہت دنوں تک افسوس رہا۔ان کی اسی بات کو یوسف ناظم لطیفہ کے انداز میں یوں کرتے ہیں:

''بیدی صاحب نے ابتدائے عمر میں لوگوں کا کلام بھی چرایا اور اپنے نام سے چھپوایا ہے (زیادہ لوگوں کا نہیں صرف ایک لوگ کا اور وہ بھی صرف ایک مرتبہ چوری کرنے کا) اس کا انھیں افسوس ہے پتہ نہیں افسوس چوری کا ہے یا صرف ایک مرتبہ چوری کرنے کا''۔20

باقر مہدی جھگڑالو انسان تھے۔ وہ ہر کسی سے جھگڑتے تھے۔ ان کی اس عادت سے خورشید اسلام واقف تھے۔اس لیے انھوں نے خط لکھا کہ ان کے دوست رالف رسل آرہے ہیں ان سے مت لڑیئے۔ مگر یہ خط ان کو کچھ دیر بعد ملا۔ جب تک وہ رالف رسل سے لڑ چکے تھے۔ان کی اس جھگڑنے کی عادت کے متعلق مزاحیہ انداز میں یوسف ناظم لکھتے ہیں:

''غالباً دوسال ہوئے کہ لندن یونیورسٹی کے اردو کے پروفیسر رالف رسل غلطی سے بمبئی آگئے۔ان کی آمد سے متعلق باقر مہدی صاحب کے ایک دوست

خورشدالاسلام نے انھیں خط لکھا کہ رالف رسل میرے اچھے دوست ہیں، تم سے ملنے آئیں گے۔ خدا کے لیے ان سے لڑنا مت...... افسوس، صد افسوس کہ خورشیدالاسلام کا یہ خط باقر مہدی کو تین بجے ملا جب تک وہ رالف رسل سے لڑ کر فارغ ہو چکے تھے......اس واقعہ کے راوی باقر مہدی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ بات یہیں ختم نہیں ہوئی ہوگی اس کے بعد وہ یقیناً خورشیداسلام سے لڑے ہوں گے کہ انھوں نے یہ خط ٹھیک وقت پر کیوں نہیں بھیجا''۔21؎

عبدلا مجید خان کو اپنے شعر سنا کر داد حاصل کرنا بہت پسند تھا۔ اگر ان کو داد نہیں مل رہی ہے تو وہ زبردستی داد حاصل کرنے میں بھی تکلف نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس عادت پر مزاحیہ انداز میں یوسف ناظم یوں لکھتے ہیں:

''مرزا عزیز جاوید کو جب یہ احساس ہوا کہ لوگ ان کے ترنم کو زیادہ شوق اور توجہ سے سنتے ہیں تو انھیں بہت افسوس ہوا (یعنی قلق ہوا) اور انھوں نے خود ہی اپنے ترنم پر دفعہ 144 لگادی (ممکن ہے وہ دفعہ 145 ہو) اور کہا سننا ہے۔ تو صرف شعر سنو اور داد دو۔ اب کئی سال سے مرزا عزیز جاوید تحت الفظ میں کلام سناتے ہیں۔ رک رک کر شعر پڑھتے ہیں۔ 70 شعروں کی غزل جس سے ایک شعر عمداً اور ایک شعر قصداً بھول جاتے ہیں، لیکن داد کے معاملے میں ان کی نظر بہت تیز ہے۔ وہ جب بھی شعر سناتے ہیں پوری محفل پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں کہ کہاں سے داد نہیں آرہی ہے۔ داد تو خیر انھیں یوں بھی ملتی ہی ہے لیکن وہ زبردستی داد وصول کرنے میں بھی تکلیف نہیں کرتے''۔22؎

سید حسن نعیم کو غیبت کرنے اور گالیاں دینے کی عادت تھی اور جب وہ کسی کو گالی دیتے اس کی غیر موجودگی میں دیتے تھے۔ ان کی اس کمزوری کو یوسف ناظم مزاحیہ انداز میں یوں بے نقاب کرتے ہیں:

''سید حسن نعیم، لوگوں کی غیبت کرنے میں مجھ سے آگے نکل جانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں لیکن جہاں تک داد و دہش کا تعلق ہے یہ مجھ سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ گالیاں معلوم نہیں کب اور کہاں سیکھی تھیں۔ انھیں اب تک حفظ ہیں اور اس معاملے میں وہ اعراب وغیرہ کی غلطیاں نہیں کرتے جب بھی کسی کو گالی دیتے ہیں یہ کہہ دیتے ہیں کہ رعایت کر رہا ہوں میں اسے مان لیتا ہوں۔ اس لیے بھی کہ یہ جسے بھی گالی دیتے ہیں وہ اس وقت موجود نہیں ہوتا ہے''۔23ؔ

یوسف ناظم نے اپنے خاکوں میں شخصیات کے حلیہ کا بیان ہو کہ ان کی پسند ناپسند کا یا پھر عادت و اطوار کا بیان ہر جگہ مزاحیہ اسلوب سے کام لیا ہے۔ وہ شخصیات کی سیرت و کردار اور ان سے متعلق واقعات کے بیان میں لطائف و شگفتہ اسلوب کا استعمال کرتے ہیں بات بات میں ہنسا اور شخصیات کی صفات ان کی خامیوں اور خوبیوں کا بیان مزاحیہ اناز میں کیا ہے۔ مزاح نگاری ان کے خاکوں کا خاص وصف ہے۔ چنانچہ وہ باقر مہدی کی ولادت کا بیان بھی مزاح نگاری کے ذریعہ یوں کرتے ہیں:

''باقر مہدی صاحب بھی ردولی جیسے مردم خیز خطے میں پیدا ہوئے۔ نقادوں کو یون بھی قدرت کی طرف سے کھلی اجازت ہے کہ وہ جہاں چاہیں پیدا ہوجائیں۔ باقر مہدی کی ولادت سے ان کے وطن مالوف کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان کے بعد پھر کسی نقاد کی ہمت نہیں ہوئی کہ ردولی میں پیدا ہو''۔24ؔ

ان کے خاکوں کے اس جائزہ کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر یا غیر ضروری واقعات اور قصوں کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ شخصیتوں کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے ذریعہ ان کی شخصیات کی عکاسی اس طرح سے کرتے ہیں کہ مزاح خود بہ خود پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کا انداز بیان پر لطف اور دلکش ہے۔ انھوں نے ہم وزن اور ہم آواز الفاظ کو اس خوبی سے اپنے خاکوں میں استعمال کیا ہے کہ ان کی تحریروں میں دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ یوسف ناظم کے کچھ

خاکے بہت مختصر ہیں کیوں کہ انھیں انھوں نے کسی نہ کسی ہنگامی حالت میں لکھے ہیں۔ان کی مزاح کی وجہ سے ان کے خاکوں میں ایک حسن پیدا ہو گیا ہے۔انھوں نے شخصیات کے ظاہری اور باطنی خوبیوں اور خامیوں کا بیان غیر جانبداری سے کیا ہے۔ان کے خاکے یقیناً اردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔

☆☆☆

حواشی

1 اردو نثر میں طنز و مزاح، اشتیاک احمد ورک، ص:425

2 اشفاق حسین مشمولہ، سائے ہمسائے، ص:13

3 جشن خطیبی، مشمولہ، ذکر خیر، ص:90

4 جشن خطیبی، ذکر خیر، ص:90

5 پورا آدمی ادھورا خاکہ، مشمولہ، ذکر خیر، ص:10

6 کرشن کتھا، مشمولہ، ذکر خیر، ص:20

7 حرف تمنا، مشمولہ، ذکر خیر، ص:83

8 کرشن کتھا، مشمولہ، ذکر خیر، ص:19

9 پورا آدمی ادھورا خاکہ، مشمولہ، ذکر خیر، ص:11

10 مخدوم محی الدین، مشمولہ، سائے ہمسائے، ص:15

11 باقر مہدی، مشمولہ، اردو کے منتخب خاکے، ص:144

12 کرشن کتھا، مشمولہ، ذکر خیر، ص:22

13 وہ نام خدا سرے سے ہیں تا ناخن، مشمولہ، ذکر خیر، ص:56

14 حرف تمنا، مشمولہ، ذکر خیر، ص:82

15 باقر مہدی، مشمولہ، اردو کے منخب خاکے، ص:113

16 کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں، مشمولہ، ذکر خیر، ص:36

17 ازالہ حیثیت عرفی کا شاعر، مشمولہ، ذکر خیر، ص:120

18 تپائی، مشمولہ، ذکر خیر، ص:103

19 راجیند رسنگھ بیدی، مشمولہ، سائے ہمسائے۔ص:28

20۔پورا آدمی ادھوراخاکہ،مشمولہ،ذکرخیر،ص:15
21۔باقر مہدی،مشمولہ،اردو کے منتخب خاکے،ص:112
22۔کئی تخلصوں کا شاعر،مشمولہ،ذکرخیر،ص:96
23۔ازالہٰ حیثیت عرفی شاعر،مشمولہ،ذکرخیر،ص:121
24۔باقر مہدی،مشمولہ،اردو کے منتخب خاکے،ص:112

☆☆☆

مجتبیٰ حسین (پیدائش 1936)

اردو کے ممتاز اور منفرد مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ولادت 15 / جولائی 1936 کو گلبرگہ کے گاؤں چنچولی میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور چوتھی جماعت کی تعلیم کے لیے وہ گلبرگہ کے آصف گنج کے مدرسہ تحتانیہ میں داخل ہوئے۔ گلبرگہ ہی میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد چلے آئے۔

مجتبیٰ حسین کے آٹھ بھائی اور ایک بہن تھیں۔ ان کے بھائیوں میں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس اپنی صحافتی اور ادبی سرگرمیوں کے سبب مشہور ہوئے۔ محبوب حسین جگر روزنامہ ''سیاست'' کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ وہ زندگی بھر اسی اخبار سے وابستہ رہے۔ ابراہیم جلیس افسانہ نگار اور طنز نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ مجتبیٰ حسین کی شادی 1956 میں ان کی چچازاد بہن 'ناصرہ رئیس' کے ساتھ ہوئی۔ انھیں چھ اولاد ہوئیں۔ ان میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی کا انتقال ہو چکا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی ادبی اور شخصی زندگی میں دو شہروں کو اہمیت حاصل ہے ایک دہلی اور دوسرا حیدرآباد۔ ان کی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ 'سیاست' سے ہوا۔ اس وقت روزنامہ سیاست کے مزاحیہ کالم نگار شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد، اس کالم کی ذمہ داری مجتبیٰ حسین کو سونپی گئی۔ اس اخبار میں 1962ء سے مسلسل مزاحیہ کالم نگاری کی شروعات ہوئی۔ ان کی صحافتی زندگی کی ابتداء کے

بارے میں محمد اسلم لکھتے ہیں:

''صحافت کے میدان میں ان کی ترتیب محبوب حسین جگر کے ہاتھوں میں ہوئی تقریباً سات برسوں تک وہ صحافی کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے رہے۔ اکتیس جولائی 1962ء کو روزنامہ سیاست کے مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کا انتقال ہوا تو سیاست کے انتظامیہ کو ایک ایسے ادیب کی ضرورت لاحق ہوئی جو یہ کالم لکھ سکے۔ شاہد صدیقی اپنے وقت کے بے حد مقبول کالم نویس تھے۔ بالآخر مجتبیٰ حسین کا نام نکلا اور 12/اگست 1962ء کو صبح جب وہ اپنے دفتر پہنچے تو ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے حکم دیا کہ وہ اس دن کا مزاحیہ کالم لکھیں۔ یہیں سے مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا آغاز ہوتا ہے''۔1

مجتبیٰ حسین اپنی مزاحیہ کالم نگاری ''کوہ پیما'' کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے اصلی نام سے 1964ء میں ''ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' کے مضمون سے کے زریعہ سے لکھنا شروع کیا۔

مجتبیٰ حسین کی تصانیف میں ''تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہر حال، آدمی نامہ، بالآخر، جاپان چلو جاپان چلو، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ وغیرہ شامل ہیں۔

مجتبیٰ حسین کو پہلا اعزاز اُڑیہ زبان کے ادیبوں کی تنظیم ''سرس ساہتیہ سمیتی'' کی جانب سے ملا تھا۔ اس تنظیم نے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ اُڑیہ زبان میں شائع کیا، اور انھیں کٹک بلوا کر ایک خصوصی تقریب میں ''ہاسیہ رتن'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ انھیں غالب ایوارڈ اور مخدوم ایوارڈ سے بھی نوزا گیا ہے۔

مجتبیٰ حسین ایک مشہور مزاح نگار کے ساتھ ساتھ ایک خاکہ نگاری بھی ہیں۔ ان کے خاکوں کے مجموعوں میں آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ اور آپکی تعریف، ہوئے ہم دوست جس کے

وغیرہ ہیں۔انھوں نے 1969ء سے خاکے لکھنا شروع کیا۔اور تقریباً دوسو سے زیادہ خاکے وہ لکھ چکے ہیں۔ان میں کچھ خاکے نہایت مختصر ہیں تو کچھ تفصیلی ہیں۔

ادبی زندگی میں ان کا ڈاکلہ مزاحیہ کالم نویسی کی حیثیت سے ہوا مگر اتفاقیہ طور پر انھوں نے خاکہ نگاری میں قدم رکھا ہے۔انھوں نے اپنا پہلا خاکہ 'حکیم یوسف حسین خاں' پر خود ان ہی کی فرمائش پر لکھا تھا۔اور یہ یوسف حسین خان کی کتاب ''خواب زلیخا'' کی رسم اجراء کے موقع پر پڑھا گیا تھا حسن مثنیٰ ان کے پہلے خاکے سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''حکیم یوسف خاں کا خاکہ مجتبیٰ حسین کا تحریر کردہ پہلا خاکہ تھا جسے انھوں نے ان ہی کی فرمائش پر 1968ء میں لکھا تھا۔اس وقت سے آج تک سینکڑوں خاکے لکھ چکے ہیں۔جن میں فرمائشی اور غیر فرمائشی دونوں قسم ے خاکے شامل ہیں''۔2

اس کے بعد ان کے خاکوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوگیا کہ وہ آج تک چل رہا ہے، اور انھوں نے فرمائشی اور غیر فرمائشی دونوں طرح کے خاکے تصنیف کئے ہیں۔

مجتبیٰ حسن کے مزاحیہ مضامیں کا مجموعہ ''قطع کلام'' 1969ء میں شائع ہوا،جس میں تقریبا تیرہ مزاحیہ مضامین بین اور چار شخصی خاکے بھی شامل ہیں۔وہ راجندر سنگھ بیدی کنھیا لال کپور،صادقین اور مشفق راجا کے خاکے شامل ہیں۔''قصہ مختصر'' بھی ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے اس میں بھی تین شخصی خاکے شامل ہیں۔وہ سلیمان اریب،ایم۔ایف حسین،اور سعید بن محمد کے خاکے ہیں۔

آدمی نامہ،سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ، ہوئے ہم دوست جس کے،آپ کی تعریف وغیرہ مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ان میں مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''آدمی نامہ'' ہے۔یہ 1981ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا انھوں نے نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم ''آدمی نامہ'' کی مناسبت سے اپنے خاکوں کے پہلے مجموعے کا نام آدمی نامہ رکھا ہے۔اس مجموعے میں کل پندرہ خاکے

شامل ہیں۔ ان خاکوں کی خاص بات یہ ہے کہ خاکوں کے ہر عنوان کے ساتھ آدمی لگا رکھا

'سو ہے وہ بھی آدمی' ان کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 1987 'میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں پورے چودہ خاکے شامل ہیں۔ اس میں صرف ادبی شخصیتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔'چہرہ در چہرہ' ان خاکوں کا تیسرا مجموعہ ہے یہ مجموعہ 1992ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل خاکوں میں ان کا اپنا خود کا خاکہ ''اپنی یاد'' کے عنوان سے شامل ہے۔

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے خاکوں کے نام دلچسپ رکھتے ہیں بلکہ اپنی دلچسپ طرز تحریر کے ذریعے موضوع خاکہ کے حلیے، لباس، عادات واطوار، ان سے متعلق تاثرات کے علاوہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے تقریباً تمام خاکوں میں شخصیت سے پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ مثلاً سجاد ظہیر (بنے بھائی) سے اپنی پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کا بیان وہ یوں کرتے ہیں:

> ''بنے بھائی کے بارے میں اتنا کچھ پڑھ رکھا تھا کہ انہیں دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ انھیں پہلے پہل حیدرآباد کے ایک ادبی جلسے میں دیکھا۔ جب تقریر کے لئے ان کا نام پکارا گیا تو وہ حاضرین کے سامنے والی قطار میں سے اٹھ کر یوں سبک خرامی کے ساتھ مائیک پر آئے کہ انہیں دیکھنے کی ساری آرزو کا ستیاناس ہوگیا۔ ان کے چلنے کے انداز میں ایسی نرمی۔ آہستگی، ٹھہراؤ اور دھیما پن تھا کہ یکبارگی مجھے یہ وجہ سمجھ میں آگئی کہ ہمارے ملک میں انقلاب کے آنے ہیں اتنی دیر کیوں ہورہی ہے، ایک انقلابی کا تصور ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ اسے سراسر شعلہ سراسر حرکت اور سراسر تیزی ہونا چاہئے۔ یقین ہی ہونا چاہئے۔ یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی بنے بھائی ہیں جن سے حکومت قائف ہے۔ پھر حکومت پر بھی ترس آیا کہ یہ کیسی کیسی معصوم اور بے ضرر شخصیتوں سے خوف زدہ اپنی ہے''[3]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین نے سجاد ظہیر سے پہلی ملاقات کا ذکر مزاحیہ انداز میں کیا

ہے آدمی کی شخصیت کا ایک الگ تصور ہمارے ذہن میں ہوتا ہے لیکن ملنے کے بعد کبھی وہ تصور سچ ثابت ہوتا کبھی غلط۔ یقیناً مجتبیٰ حسین نے بھی سجاد ظہری کی شخصیت کا کچھ الگ تصور رکھا تھا دیکھنے پر انھیں مایوسی ہوئی۔ چنانچہ اپنے پہلے تاثر کا بیان انھوں نے بڑے پر لطف انداز میں کیا ہے۔ اسی طرح ان کی پہلی ملاقات کنہیا لال کپور ہوا سے دہلی کے ٹی ہاؤس میں ہوئی تھی اس وقت وہ ان سے بڑے خلوص سے ملے۔ اور بڑے پیار سے گلے لگایا ان سے پہلی ملاقات کے ساتھ ساتھ ان کے مصافحہ کی عادت کا ذکر بھی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''پھر یوں ہوا کہ کئی برسوں بعد ایک دن اچانک دہلی میں میرے دفتر کے فون کی گھنٹی بجی، پیغام تھا، کنہیا لال کپور آپ سے آج شام ٹی، ہاؤس میں ملنا چاہتے ہیں۔ ٹھیک چھ بجے پہنچ جایئے۔ کسی طرح اعتبار نہ آتا تھا کہ جو قطب مینار برسوں سے لیٹا ہوا وہ آخر کس طرح اٹھ کر کھڑا ہوگیا ہے۔ میں بھاگا بھاگا ٹی، ہاؤس پہنچا تو دیکھا کہ کپور صاحب، جان نثار اختر اور فکر تونسوی ایک میز پر بیٹھے ہیں۔ کپور صاحب نے مجھے بڑے پیار سے گلے لگایا، کرسی پر بٹھایا اور کرسی پر بٹھاتے ہی ایک لطیفہ سنایا اور لطیفہ سناتے ہی میرے طرف ہاتھ بڑھا کر مجھے کرسی سے کھینچا اور اس زور سے کھینچا کہ میں پھر کرسی سے نیچے آ گیا۔ اپنی ہنسی کو روک کر پھر مجھے کرسی پر۔ میں حیران ہوا تو فکر تونسوی بولے، کپور صاحب کی یہ عادت ہے کہ جب بھی کوئی اچھا فقرہ یا لطیفہ کہتے ہیں تو اس آدمی سے بے ساختہ مصافحہ کرتے ہیں۔ جس پر یہ بہت زیادہ مہربان ہوتے ہیں۔، میں خود بھی ان کی مہربانی سے کئی بار گر چکا ہوں۔ اب یہ مہربانی تمہارے حصے میں آئی ہے۔ بیٹا طنز نگاروں کی اور قدرت کرو''۔[4]

عمیق حنفی سے مجتبیٰ حسین کی پہلی ملاقات 1969ء میں دہلی میں ہوئی تھی سلام مچھلی نے ان کا تعارف عمیق حنفی سے کرایا تھا۔ اس وقت وہ کچھ جلدی میں تھے اس وقت ان کے مصافحے کا انداز انھیں

عجیب معلوم ہوا۔ ان کے مصافحے کے اسی انداز کو دلکش تشبیہہ کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ مثلاً مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''مجھے یاد ہے کہ 1969ء میں دہلی ریڈیو اسٹیشن پر'' قادر الکلامی'' سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ سلام مچھلی شہری نے میرا تعارف ان سے کرایا تھا، وہ اس وقت عجلت میں تھے اور کہیں جا رہے تھے۔ تعارف کے بعد قسمت میں ان سے مصافحہ کرنا تو لکھا ہی تھا مگر انھوں نے مجھ سے کچھ اس طرح مصافحہ کیا جیسے بجلی کے تار کو چھونے جا رہے ہوں۔ ایک سکنڈ میں مصافحہ کے نام پر وہ مجھے چھو کر یوں چلے گئے جیسے واش بیسن میں انھیں اپنے ہاتھوں کو دھونے کی جلدی ہو۔ وہ اپنی ان چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی مدد سے جو بڑی مشکل سے زمین تک پہنچ رہی تھی۔ تیز تیز چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ یہ تک نہیں کہا کہ'' مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی'' یہ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا جیسا کہ عام طور پر بجلی کے شاک میں ہوتا ہے کہ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ سلام مچھلی شہری نے میرے اندرونی تاثرات کو بھانپ کر ہنستے ہوئے کہا'' انھیں لوگوں سے مل کر خوشی نہیں ہوتی اور میں نے کہا اور لوگوں کو بھی ان سے مل کر کہاں خوشی ہوتی ہے''۔5

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی ملاقات میں شخصیات سے ملنے پر ان کے کیا تاثرات رہے۔ جن شخصیات کا ان کے ذہن میں جو تصور تھا ملنے کے بعد انھیں مایوسی ہوئی، اور انھوں نے اس ملاقات کو تاثر کا بیان دلچسپ طرز تحریر کے ذریعے بیان کیا ہے:

خاکہ نگاری کے فنی لوازمات میں حلیہ کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ حلیہ نگاری میں موضوع خاکہ کے رنگ روپ، شکل وصورت، اور خدوخال کا بیان کیا جاتا ہے، مجتبیٰ حسین بڑے دلکش انداز میں شخصیات کی حلیہ نگاری کی ہے۔ مثلاً خواجہ عبدالغفور کے حلیے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ابھی میں اپنی نوجوانی کے جوش کا عملی مظاہرہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک

موٹر کوٹھی کے اندر سے برآمد ہوئی۔ اس موٹر میں پچھلی سیٹ پر ایک کلکٹر بیٹھا تھا۔ بالکل ایک بت کی طرح۔ خدوخال کسی یونانی مجسمہ کی مانند، گورا رنگ، لمبی اونچی ناک جو اس وقت مجھے ناک کم اور خطرناک زیادہ نظر آئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں اور بھرے بھرے گال، گلا نکٹائی میں یوں پھنسا تھا جیسے یہ نکٹائی خود انھوں نے نہ باندھی ہو بلکہ کسی دشمن نے باندھی ہو۔

جب کلکٹر کا یونانی مجسمہ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا تو میں نے کوٹھی کے پھاٹک پر نظر ڈالی وہاں لکھا تھا، خواجہ عبدالغفور آئی۔اے۔ایس''۔6

خواجہ عبدالغفور کے حلیے کے بیان میں تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے، مثلاً خواجہ عبدالغفور کو ایک بت سے تشبیہہ دی ہے ان کی خدوخال کو یونانی مجسمہ کہا ہے۔

حسن الدین احمد کو دیکھ کر ان کی صورت پر نہیں بلکہ ان بھنویں پر ہی نظر رک گئی تھی۔ ان کی بھنوؤں، مونچھوں اور ناک کا بیان بھی پر لطف اسلوب کے ذریعے کیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

حیدرآباد میں انھیں چیدہ چیدہ طور پر دیکھا تھا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انھیں تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جو میں نے تفصیل سے انھیں دیکھنے کی کوشش کی تو ان کی آنکھوں کے اوپر پھیلی ہوئی تفصیل بھنوؤں پر ہی نظر جم کر رہ گئی۔ ایسی تفصیل بھنویں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ ایسی گھنی اور گنجان بھنویں کہ لگتا ہے بھنویں نہیں مونچھیں ہیں کیونکہ انھوں نے مختصر سی مونچھیں رکھی ہیں جو ہٹلر کی مونچھوں سے بس ذرا سی بڑی ہیں۔ گورا چٹا رنگ، عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، ناک ایسی ستواں کہ عینک کا فریم بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس پر جم جاتا ہے۔ ایسی ناکیں عینک کا فریم رکھنے کے لیے بہت موزوں ہوتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بینائی کی کمزوری کی بنا پر عینک لگاتے ہوں مگر قدرت نے انھیں ایک ایسی ناک بھی فراہم کی ہے جس پر عینک کا

فریم بہت بھلا لگتا ہے''۔7

مجتبیٰ حسین نے شخصیات کی حلیہ نگاری کے علاوہ ان کی پسند ناپسند ان کے مشاغل اور عادتوں کا ذکر بھی بڑے دلچپ انداز میں کیا ہے، مثلاً کرشن چندر کھانے کے بڑے شوقین تھے کھانوں میں بھی چٹپٹی چیزوں کو بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ 1968ء میں جب ان پر قلب کا حملہ ہوا تو ڈاکٹر نے انھیں مصالحہ دار اور چکنی چیزیں کھانے منع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ چوری چھپے کھالیا کرتے تھے، چنانچہ اسی بات کا ذکر مجتبیٰ حسین مزاحیہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

''کھانے کے وہ بڑے شوقین تھے۔ چٹپٹی چیزیں تو بہت شوق سے کھاتے تھے، 1968ء کی بات ہے، ان کے قلب پر حملے کے بعد ڈاکٹر نے انھیں مصالحہ دار اور چکنی چیزیں کھانے سے منع کر دیا تھا۔ سلمیٰ آپا (سلمیٰ صدیقی) ان پر کڑی نگرانی رکھی تھیں کہ یہ کہیں کچھ کھا نہ لیں۔ ان دنوں وہ کھار کے ''گرونواس'' والے مکان میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر نے انھیں چہل قدمی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں ان سے ملتے پہنچا۔ تو سلمیٰ آپا سے اجازت لے کر میرے ساتھ چہل قدمی کے ارادے سے سڑک پر اپنے گھر کے سامنے کی ساری سڑک عبور کی ، دوسری سڑک پر مڑ کر دوا کچھ دیکھا۔ اپنی جیب میں کچھ تلاش کیا۔ پھر مجھ سے بولے ''تمہارے پاس ایک روپیہ ہے؟'' میں نے کہا ''کرشن جی، بھلا ایک روپیہ کی کیا بات ہے؟'' یہ سنتے ہی اپنی چہل قدی کو تیز کر کے سڑک پر ٹھہرے ہوئے ایک ٹھیلے کے پاس پہنچے جہاں گرم گرم پکوڑے تل کر بیچے جا رہے تھے اور انھوں نے مشین کی سی تیزی کے ساتھ پکوڑے کھانے شروع کر دیئے۔ اس وقت ان کے چہرے پر عجیب وغریب معصومیت کھیل رہی تھی۔ میں نے ایسی معصومیت کسی بڑے ادیب کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی۔ جب کھا چکے تو مجھ سے کہا ''تم بھی کھانا چاہو تو کھالینا، بہت اچھے بنے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی

سادگی پر ہنسی آ گئی۔ واپسی پر بولے" خبردار سلمٰی کو نہیں بتانا یہ عورتیں تو یوں ہی
پریشان رہتی ہیں اور ہاں بمبئی میں کتنے دن ٹھہرو گے ۔ جب تک رہو شام
میں چہل قدمی کے لئے یہاں چلے آنا"۔8

اس طرح مجتبیٰ حسین نے کے۔ایل۔نارنگ کے چنے کھانے کے شوق کا بھی ذکر کیا ہے ان کے چنے کھانے کی اس عادت کو گھوڑے کے شوق سے تشبیہ دی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"یوں بھی ساقی اور ریس کے گھوڑے میں مجھے بڑی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔
مضبوط،توانا، پھرتیلا اور خوبرو،تو یہ کہ چنے بھی وہ بڑے شوق سے کھاتے
ہیں، گھر اور دفتر دونوں ہی جگہ ان کے برابر مرتبان میں چنے رکھے ہوئے مل
جائیں گے۔فرق صرف اتنا ہے کہ گھوڑا تو بڑے سے چنے کھاتا ہے اور یہ مرتبان
سے نکال کر کھاتے ہیں"۔9

امیر قزلباش کو جو چیز نہیں آتی تھی وہ، وہ کیا کرتے تھے مثلاً انھیں گاڑی چلانے کا شوق تھا مگر چلانی نہیں آتی تھی۔ان کے اسی شوق کا ذکر ایک دلچسپ واقعہ سے کرتے ہیں کہ پورا منظر نظروں میں گھوم جاتا ہے۔وہ مزاحیہ انداز میں اس واقعہ کا بیان یوں کرتے ہیں:

"خطرناک کھیل امیر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ایک رات جامع مسجد پر
اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اپنے اسکوٹر پر اسے نظام الدین چھوڑ دوں ۔
میں اسکوٹر اسٹارٹ کرنے لگا تو اس نے اصرار کیا کہ اسکوٹر وہ خود چلائیگا۔اسکوٹر
میں نے اس کے حوالے کیا اور پیچھے بیٹھ گیا۔اب جو اسکوٹر اسٹارٹ ہوا تو ایک
فٹ اچھ کر زمین پر آ گیا۔میری کمر میں زبردست دھکا سا لگا میں سنبھل ہی رہا تھا
کہ یہ فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔میں نے آنکھیں بند کیں تو یہ فٹ پاتھ سے نیچے آ گیا
۔ پتہ نہیں اسکوٹر اس وقت کون سے گیر میں تھا۔ پھر جب یہ اسّی کلومیٹر کی رفتار
سے دوڑنے لگا تو میں نے امیر سے کہا" یار! اسکوٹر کو کہیں کچھ ہو نہ جائے"

امیر نے کہا'' ویسے تو زندگی کے سفر میں رکنے کا کوئی وال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر بھی مجھے یہ بتاؤ کہ سکوٹر روکنے کا بریک کہاں ہوتا ہے'' اس جملہ پر میں نے آنکھیں بند کرلیں ورا پنی موت کا انتظار کرنے لگا۔ راستہ میں اسکوٹر کسی جاندار شئے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے اپنی بند آنکھوں کے ساتھ امیر سے پوچھا''ابھی ابھی کسی جاندار کو چھوکر ہمارا اسکوٹر آگے آیا ہے''

امیر نے کہا'' یہ کیسے پتہ چلاسکتا ہوں جب کہ میری آنکھیں بند ہیں''؟

انمیر نے کہاتم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میری آنکھیں کھلی ہیں۔ یار آنکھیں تو میری بھی بند ہیں۔

میرے دل کی حرکت بند ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مگر اللہ کو غالباً اردو مزاح نگاروں کے مستقبل سے دلچسپی تھی۔ اسکوٹر میں اچانک پٹرول ریزرو میں آگیا اور وہ خود بہ خود رک گیا۔ میں اس رات کے واقعہ کو جب بھی یاد کرتا ہوں تو دل کی حرکت تیز ہوجاتی ہے''۔10؎

ان تمام مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے ہ مجتبیٰ حسین نے شخصیتوں کی عادات واطوار اور پسند ناپسند کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ یہ مجتبیٰ حسین کے اسلوب کا ہی لطف ہے کہ وہ طنز بھی کرتے ہیں تو مزاحیہ اسلوب کے ساتھ کرتے ہیں بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے اور موضوع خاکہ کی شخصیت سے ہمیں ہمدردی ہونے لگتی ہے۔

اختر حسین کو اپنی زندگی میں مسائل حل کرنے سے زیادہ مسائل پیدا کرنے میں بڑی دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کئی بڑی اچھی ملازمتوں کو چھوڑ کر دوسری ملازمتیں اختیار کیں ان کی اس عادت کا ذکر کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین دلچسپ انداز میں لکھا ہے:

''ہمارے ملک میں بیروزگاری کا جو رونا رویا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ ایک ہی شخص کو جب اتنی ساری ملازمتیں مل سکتی ہیں تو کیسی بیروزگاری اور کہاں

کی بیروزگاری؟ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس ملک میں پہلے تو ملازمت کا ملنا دشوار ہوجاتا ہے۔ پتہ نہیں اختر بھائی نے کس طرح اتنی ساری ملازمتیں حاصل کیں اور پھر انہیں چھوڑا کیسے! یہ گروہ کسی کو نہیں بناتے۔اصل میں اختر بھائی تن آسانی کے قائل نہیں ہیں۔ جب زندگی میں سکون اور خوشحالی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں تو وہ فوراً ایک عدد ملازمت چھوڑ دیتے ہیں۔اپنی شخصی زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں وہ اتنی دلچسپی نہیں لیتے جتنی دلچسپی وہ اپنے لئے مسائل کو پیدا کرنے میں لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اختر بھائی آج بھی بڑی بھرپور زندگی گزار رہے ہیں۔حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے،مسائل سے لڑتے ہوئےاور نت نئی آزمائیشوں سے گزرتے ہوتے''۔11

کرشن چندر کا محبوب مشغلہ مہمان نوازی تھا۔وہ خود بڑے خلوص سے مہمانوں کو کھانا کھلاتے تھے۔اور نفاست کے ساتھ ہر کام کرتے تھے مجتبیٰ حسین ان کی شخصیت کے انھیں پہلوؤں کی طرف مزاحیہ انداز میں یوں اشارہ کیا ہے:

''مہمان نوازی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔کوئی ملنے جاتا تو اس کے سامنے پھلوں کا پلیٹ رکھ کر خود پھلوں کو کاٹنے میں مصروف ہوجاتے تھے۔سیب اسی نفاست سے کاٹتے تھے کہ ایک جگہ چاقو لگادیتے تو سارے چھلکے کو بیک جنبش قلم اتار دیتے تھے۔ان کو سیب کاٹتے دیکھنا بھی ایک انوکھی مسرت تھی۔ وہ ایک سیب کاٹ لیتے تو کہنے کو جی چاہتا تھا'' سبحان اللہ مرحبا، مکرر ارشاد ہو، کیا فصاحت ہے، کیا بلاغت ہے''۔12

کمار پاشی اپنے دوستوں کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوجاتے تھے۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے شراب پینا چھوڑ دیا تھا۔لیکن شرابی دوستوں کی بے رخی کی وجہ سے انھیں دوبارہ شراب نوشی کرنا پڑا۔ن کی اسی عادت کا ذکر مجتبیٰ حسین نے ایک واقعے کے حوالے سے لطیف انداز میں بیان کیا

ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

چند برس پہلے ایک دن ایک دوست نے اطلاع دی کہ کمار پاشی نے شراب چھوڑ دی ہے۔ میں بہت خوش ہوا کہ اب انھیں انصاف مانگنے کے لیے آدھی رات کو سپریم کورٹ میں جانا نہیں پڑے گا۔ انھیں اس فیصلہ پر مبارک باد دینے گیا تو بڑی سنجیدگی سے نظریں جھکا کر میری مبارک باد قبول کرتے رہے۔ چار پانچ مہینوں تک ان کی پاکبازی کے قصے دلی کے ادبی حلقوں میں گشت کرتے رہے جگہ جگہ کمار پاشی کی مثال دی جانے لگی کہ دیکھو آدمی ہو تو ایسا ہو۔ مگر ایک دن اچانک سرور کی حالت میں مل گئے تو میں نے کہا ''یار تم نے پھر سے شروع کردی، اچھا خاصہ فیصلہ کیا تھا''۔

بولے ''کیا کروں جب سے شراب چھوڑی ہے شرابی دوستوں نے ناتا توڑ لیا ہے میرے جتنے اچھے دوست تھے وہ سب کے سب برے ہیں۔ ان سے ناتا جوڑنے کے لیے پھر سے شروع کردی ہے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب میں نے سگریٹ چھوڑ دی ہے''۔13

راجندر سنگھ بیدی کا حافظہ بہت کمزور تھا۔ ان کے کمزور حافظے کا یہ حال تھا کہ انھوں نے اپنے قریبی دوستوں کے نام بھی بھول جاتے تھے لحاظہ وہ لکھتے ہیں:

''بیدی صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کا حافظہ کمزور ہے۔ وہ اپنے قریبی دوستوں کے نام بھی بھول جاتے ہیں اسی لیے یوسف ناظم نے بیدی صاحب کی شخصیت پر اپنے بھرپور خاکہ میں بیدی صاحب کے دوستوں کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ وہ جب بھی ان سے ملیں تو حفظ ما تقدم کے طور پر اپنا نام بتادیں''۔14

انھوں نے اپنے خاکوں میں واقعات کے ذریعہ سے موضوع خاکہ کی عادات و اطوار، رہن

سہن طور طریقے اور سیرت و کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً ظ۔ انصاری دوسروں پر نہیں بلکہ خود کو مذاق کا موضوع بناتے تھے۔ ان کی اسی عادت کا ذکر مجتبیٰ حسین نے ایک مزاحیہ واقعہ کے ذریعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ظ۔ انصاری کی کن کن باتوں کو یاد کروں۔ دس برس پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ جامعہ ملیہ کے ایک سمینار کے بعد ڈنر جاری تھا۔ میں اور باقر مہدی ہاتھوں میں پلیٹیں لئے کھانے میں مصروف تھے۔ ظ۔ انصاری دور کھڑے کسی دوست سے ہم کلام تھے۔ وہ اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجے میں دوست سے کہہ رہے تھے بھائی بہت زندگی جی لی، بہت سنگھرش کیا۔ اب تو یہ تمنا ہے کہ دس برس اور جی لوں تا کہ ذرا اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ اس زندگی کو سمیٹوں جواب تک آپادھاپی میں جی ہے۔

اتنا سنتے ہی باقر مہدی ان کی طرف لپکے اور اپنے مخصوص لہجہ میں کہنے لگے ''یار دس برس! دس برس! بہت ہیں یار دس برس۔ اگر تمہیں معلوم ہو کہ تمہیں دس برس جینا ہے تو اور بھی برا لکھو گے۔ اس مہلت کو کم کرو۔ ایمان سے۔

ظ۔ انصاری نے بے ساختہ قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا ''تو پھر تمہاری رائے میں مجھے اپنی زندگی کو سمیٹنے کے لیے کتنی مہلت درکار ہوگی؟

باقر مہدی بولے ''پانچ برس کافی ہیں۔ پانچ برس کافی ہیں''۔ ظ۔ انصاری بولے ''اچھا بھئی تمہاری خاطر پانچ برس ہی جی لیتے ہیں''۔ باقر مہدی بولے ''تو پھر وعدہ رہا بعد میں وعدہ خلافی نہیں ہوگی۔

اس کے بعد باقر مہدی نے کئی دوستوں کے پاس جا جا کر کہا ''یار! تمہیں خوش خبری سنانی ہے کہ ظ۔ انصاری اب صرف پانچ برس تک ہمارے درمیان رہیں گے۔

اس وقت سب نے اس بات کا مزہ لیا تھا لیکن پورے دس بر دس گزر جانے

کے بعد اب یہ واقعہ مجھے یاد آیا تو احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے سچ مچ ظ۔ انصاری کی بات مان لی تھی۔ وہ سچ مچ دس بردس اوراس دنیا میں زندہ رہے۔ پتہ نہیں اس عرصہ میں انھوں نے اپنے آپ کو کتنا سمیٹا۔ سمیٹا بھی یا کچھ اور بکھر گئے۔ آج کے انسان کی زندگی کا المیہ ہے کہ وہ جتنا اپنے آپ کو سمیٹنا چاہتا ہے اتنا ہی بکھرتا چلا جاتا ہے''۔15؎

اس اقتباس سے ظ۔ انصاری کی شخصیت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اعجاز صدیقی کو اپنی غزل دوسروں کو سنانے کا شوق تھا۔ ان کی اسی عادت کی طرف ایک دلچسپ واقعہ کے ذریعے مجتبیٰ حسین یوں اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی نئی غزل کہتے تو اسے سنانے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ اپنی اس عادت سے متعلق خود ہی ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے غزل ہوگئی تو فوراً اور ینٹ ہوٹل چلے آئے کہ کوئی مائی کا لال مل جائے تو اسے غزل سنائیں۔ یہاں کوئی نہ ملا تو 'صبا' کے دفتر چلے گئے۔ وہاں بھی کوئی نہ ملا۔ تھک ہار کر جائنیز بار میں چلے گئے۔ بار کے بیرے قاسم کو بلا کر کہا ''دو پیگ وہسکی لیتے آؤ۔ قاسم وسکی لے آیا تو اس سے بولے'' بیٹھو اور ویسکی پیو، دو پیک ویسکی اور لے آؤ۔ دوسرے دور میں بھی انھوں نے قاسم کو وہسکی پلائی۔ پھر تیسرا دور چلا۔ اس کے بعد مخدوم نے قاسم سے کہا۔

اچھا قاسم، اب میرے سامنے بیٹھو، میں تمھیں اپنی تازہ غزل کے کچھ شعر سنانا چاہتا ہوں۔

یہ سنتے ہی قاسم نے کہا۔ صاحب، آپ بہت پی چکے ہیں۔ آپ کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ چلئے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔

مخدوم کہا کرتے تھے کہ اپنی ہوش مندی کے ہزار ثبوت پیش کرنے کے باوجود قاسم نے اس رات ان کی غزل نہیں سنی۔ یہ لطیفہ سنا کر خود ہی ہنستے تھے اور

مخاطب سے زوردار مصافحہ کرتے تھے''۔16؎

کسی بھی شاعر کی اگر کوئی نظم مشہور ہوجاتی ہے تو یہ نظم انھیں ہر جگہ سنانی پڑتی۔ اسی طرح کا واقعہ زبیر رضوی کے ساتھ بھی وقوع پذیر ہوا تھا۔ ان کی نظم ''یہ ہے میرا ہندوستان'' بہت مشہور ہوئی اس کا اثر ثابت ہوا کہ رضوی صاحب جہاں بھی جاتے انھیں یہ گیت گانے کی فرمائش کی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان ہوجاتے تھے۔ اگر کبھی کوئی اس گیت کی فرمائش نہیں کرتا تو ان کو بہت خوشی ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک واقعہ کے ذریعہ سے زبیر رضوی کی حالت کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں

ہمارے ہاں اکثر یہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر کی کوئی نظم جب بہت زیادہ مقبول ہوجاتی ہے جو خود شاعر کے لیے یہ نظم ایک آسیب کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ جیسے ساحر لدھیانوی کے لیے' تاج محل' اور سکندر علی وجد کے لیے' اجنتا'۔ یہ ہے میرا ہندوستان والا گیت بھی زبیر کی ذات سے کچھ اس طرح مربوط و منسلک ہوگیا ہے کہ زبیر کسی مشاعرے میں جائیں یا کسی نجی محفل میں لوگ اس گیت کی فرمائش ضرور کرتے ہیں۔ آپ حیرت کریں گے کہ میں نے 1962 میں زبیر کو حیدرآباد کے ایک مشاعرے میں یہ گیت سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور ابھی کچھ دن پہلے میں نے زبیر کو دہلی کے مشاعرے میں گیت سناتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس گیت سے خود زبیر کی الجھن کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ ایک شام زبیر بہت خوش دکھائی دیئے۔ خوشی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کئی ہفتوں بعد وہ خوش گوار دن آیا ہے جب کسی کو ہندوستان کا خیال نہیں آیا۔ میں نے پوچھا کیا مطلب ہے''۔ بولے آج کا دن وہ مبارک دن ہے جب میں نے کسی کو یہ ہے میرا ہندوستان والا گیت نہیں سنایا۔

میں نے کہا اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج ہندوستان تمہارا نہیں رہا۔

بولے جی نہیں۔ آج ہندوستان سچ مچ اپنا لگ رہا ہے۔ ٹوٹ کر پیار

آرہا ہے۔اس پر بلکہ یوں سمجھو کہ میرے حق میں ہندوستان آج ہی آزاد ہوا ہے کیوں کہ آج میں اپنے ہی گیت کی غلامی سے آزاد ہوں۔ دیکھو آج جمنا ندی کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہے اور ہاں آج موسم کتنا خوشگوار ہو گیا ہے۔ چلو آج قاضی سلیم کے ہاں چلتے ہیں۔

ہم قاضی سلیم کے ہاں پہنچے۔گھنٹی بجائی تو قاضی سلیم کی سات سالہ بیٹی سلمٰی نے دروازہ کھولا۔اندر سے قاضی سلیم نے بیٹی سے پوچھا۔بیٹی کون ہے۔

سلمٰی نے کہا مجتبیٰ انکل اور یہ ہے میرا ہندوستان آئے ہیں۔ 17؎

ان واقعات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکوں کے لیے ایسے واقعات کا انتخاب کیا جو دلچسپ تھے اور شخصیت کی عکاسی کے لیے مناسب تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خاکوں میں مختلف پرلطف واقعات کے ذریعہ شخصیات کی بعض اہم خصوصیات کی عکاسی کی ہے جس سے شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکوں میں شخصیات کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی بیان کیا ہے۔لیکن انھوں نے شخصیات کی خامیوں کا اتنے پرلطف اور مزاحیہ انداز میں کیا ہے کہ ہمیں شخصیات کی خامیاں بری نہیں لگتی ہیں بلکہ موضوع خاکہ سے ہمدردی ہونے لگتی ہیں۔مثلاً فکر تونسوی کے خاکے میں انھوں نے ان کے گنوار پن کی طرف مزاحیہ انداز میں یوں روشنی ڈالی ہے۔مثال دیکھئے:

''میں نے فکر تونسوی کو جس قدر قریب سے دیکھا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ اردو کے اس بڑے طنز نگار کے اندر ایک معصوم گنوار بیٹھا ہے۔ یہ گنوار انھیں اپنے گھر کے خوبصورت صوفہ پر اکڑوں بٹھواتا ہے، یہی گنوار ان کے کان میں سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا رکھوا دیتا ہے، یہی گنوار انھیں چائے کی پیالیوں میں سگریٹ کی راکھ جھاڑنے پر مجبور کرتا ہے اور تو اور یہی گنوار انھیں ان سے ریفریجریٹر میں ''بدنام کتاب'' کے نسخے رکھواتا ہے۔ پرسوں میں نے ان کے گھر

کا فریج کھولا تو دیکھا کہ ''بدنام کتاب'' کے دو نسخے بڑی قابل رحم حالت میں وہاں پڑے تھے۔ میں ریفریجریٹر میں کتابوں کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ تو خفت مٹانے کے لیے بولے ''بھئی میں نے اصل میں پانی پینے کے لیے فریج کھولا تھا۔ شاید غلطی سے یہ نسخے وہاں رہ گئے ایمان سے۔ پھر خود ہی کچھ سوچ کر ایک طنزیہ فقرہ میری طرف اچھالتے ہوئے بولے ''مگر یار یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اردو کی کتابیں اب ریفریجریٹر میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ میں پھر ہنسنے لگا تو بولے ''دیکھ بیٹا مجھے یہ فریج، یہ ٹی وی یہ صوفہ سیٹ، یہ قالین، ایک آنکھ نہیں بھاتے ایمان سے۔ میں تو بڑی مشکل کے ساتھ ان سے اڈجسٹ کرتا ہوں۔ یہ پھول کمار نہ جانے گھر میں کیا کیا لا کر بھرتا چلا جا رہا ہے''۔ 18ء

حکیم یوسف حسین نے اچانک شاعری شروع کر دی ان کی اس بات پر مجتبیٰ حسین کو یقین نہ آ رہا تھا کہ کوئی شخص اچانک سے شاعر بن جائے گا۔ اسی بات کو حقیقت پسندی کے ساتھ مزاحیہ اسلوب کے ذریعہ یوں بیان کرتے ہیں۔ مثال دیکھئے۔

''آپ حکیم صاحب کو نہایت سچا اور ایماندار آدمی سمجھتے ہوں تو سمجھا کریں لیکن میں یہ کہوں گا کہ حکیم صاحب بڑی صفائی سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ذرا دیکھئے کہ حکیم صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے پچاس برس کی عمر میں شاعری شروع کی۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ حکیم صاحب غلط کہتے ہیں۔ بھلا بتائیے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص پچاس برس کی عمر میں اچانک شاعری شروع کر دے اور وہ بھی ایسی شاعری کہ جس کے لیے برسوں کے ریاضی ضرورت ہو۔ کم از کم میں تو ان کے اس جھوٹ کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر مجھے یہ گمان گزرتا ہے کہ ضرور حکیم صاحب برسوں سے خفیہ طور پر شاعری کر رہے ہیں۔ وہ بالکل اسی راز داری کے ساتھ شاعری کرتے رہے جیسے کوئی خفیہ طور پر پر شراب کی ناجائز کشید کر رہا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ میں غلط کہہ رہا ہوں لیکن کیسے یقین

کیا جائے کہ حکیم صاحب آن کی آن میں شاعر بن گئے۔ یعنی رات کو سوئے تو
اچھے خاصے حکیم تھے جو صبح اٹھے تو شاعر بن کر اٹھے۔ میرا خیال ہے کہ
حکیم صاحب نے اپنی شاعری کے آغاز کے بارے میں بیان کو توڑ مروڑ کر پیش
کیا ہے''۔19ے

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے ان مثالوں کے مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیتوں کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے شخصیت اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی اہم خصوصیت ان کا اسلوب ہے۔ وہ اردو کے معروف ومشہور مزاح نگار ہیں۔ اس لیے ان کے خاکوں میں بھی پر لطف مزاح کے علاوہ تیکھا طنز بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے مزاحیہ اسلوب کو دلکش تشبیہات اور محاورات کے ذریعہ مزید پر لطف بنانے کی کوشش کی ہے۔ اشتیاق احمد ورک مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے اسلوب کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں تبسم زیر لب کی صورت تو مسلسل چلتی رہتی ہے البتہ کہیں کہیں نوبت قہقہے تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح خالص مزاح کا سلسلہ بھی ان کے ہاں تواتر سے رواں دواں رہتا ہے لیکن طنز کے مواقع کم کم ہی آتے ہیں، اگر کبھی طنز کے تیور دکھائی دیتے ہیں تو اس کا انداز بڑا دھیما ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر جیسے نزاکتوں میں پلے ہوئے ادیب کا ترقی پسندوں سے تعلق دیکھ کر ہمارے اکثر مزاح نگاروں کی رگ ظرافت بلکہ رگِ طنز بھڑک اٹھتی تھی۔ مجتبیٰ حسین نے بھی اس تضاد کو عمدگی سے بیان کیا ہے''۔20ے

مجتبیٰ حسین اپنے خاکوں میں لطیفہ گوئی سے کام لیتے ہیں۔ مخدوم محی الدین سے متعلق ایک واقعہ کے ذریعہ وہ ان کی شخصیت کی عکاسی شگفتہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

''مخدوم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے بے شمار واقعات مجھے یاد ہیں۔ اپنا

مذاق آپ اڑانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک بار علی الصبح اورینٹ ہوٹل میں پہنچ کر بیرے سے پوچھا

''تمہاری ہے؟

بیرا بولا نہیں ہے۔

مخدوم نے پوچھا آملیٹ ہے

بیرا بولا نہیں ہے۔

مخدوم نے پوچھا، کھانے کے لیے کچھ ہے

بیرا بولا اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہے۔

اس پر مخدوم بولے، یہ ہوٹل ہے یا ہمارا گھر کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔'' 21

رضا نقوی راہی کی شخصیت دلچسپ تھی وہ اپنی صحت کی خرابی کا ذکر کیا کرتے تھے لیکن وہ رہتے ایسے تھے جیسے وہ بہت صحت مند آدمی ہیں۔ ان کی شخصیت کے اسی پہلو کی عکاسی وہ ایک واقعہ کے ذریعے لطیف انداز میں کرتے ہیں:

''واہی صاحب کو ایک بار ہم نے حیدرآباد بلایا تھا۔ بڑی مشکل سے آئے۔ عذر یہ پیش کرتے تھے کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی صحت کی خرابی کا اعلان کچھ اس زور وشور سے اور تفصیل سے کیا تھا کہ ہم اسٹریچر لے کر انھیں لینے اسٹیشن پہنچے بلکہ ایک ڈاکٹر بھی حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے ساتھ رکھا۔ یہ ٹرین سے اترے تو دیکھا کہ ایک نہایت صحت مند آدمی سامنے کھڑا ہے سخت مایوسی ہوئی۔ اسٹیشن سے واپسی میں ہم اسٹریچر پر آئے اور وہ ٹیکسی میں۔ جتنے دن حیدرآباد میں رہے دھما چوکڑی مچاتے رہے۔ سمجھ میں نہیں آیا، وہ کب بیمار رہتے ہیں کیسے بیمار رہتے ہیں کیا بیمار رہتے ہیں۔ یکمشت بیمار رہتے ہیں یا قسطوں میں بیمار رہتے ہیں۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران میں ایسی صحت مند حرکتیں کیں کہ ہم دنگ رہ گئے''۔ 22

مجتبیٰ حسین عمیق حنفی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر مزاحیہ انداز میں نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شاعری کے معاملے میں بھی وہ چومکھے پن کے قائل ہیں۔ان کی نظموں میں جہاں عریاں اشارے ملیں گے وہیں خالص مذہبی رنگ بھی ملے گا۔اس لیے میں ہمشہ کہتا ہوں کہ عمیق حنفی کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے نہ صرف 'مہارت' کی بلکہ' طہارت' کی بھی ضرورت ہے میرا اشارہ ان کی مشہور نعتیہ نظم 'صلصلۃ الجرس'' کی طرف ہے''۔23؎

شریف الحسن نقوی محنتی آدمی تھے وہ سخت محنت کرنے کے باوجود نام نہاد شہرت سے کوسوں دور رہتے تھے۔ان کی شخصیت کے اسی پہلو کا بیان وہ دلچسپ تشبیہ کے ذریعہ یوں کرتے ہیں کہ مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔مثلاً فرماتے ہیں:

> شریف الحسن نقوی کی یہ ادا بھی مجھے بہت پسند ہے کہ اتنی محنت کرنے کے باوجود جلسوں میں اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرتے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو جلسہ سے یوں الگ تھلگ اور دور رکھیں گے جیسے ہندوستان کے نقشہ میں سری لنکا واقع ہے۔نام ونمود شہرت سے ہمیشہ دور بھاگتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اچھے عہد یدار کی نیک نامی اس کی گمنامی میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے''۔24؎

رضا نقوی واہی ہمشیہ منظوم خط لکھتے تھے۔انھوں نے مجتبیٰ حسین کو بھی 1969 میں پہلی بار خط لکھا۔ان کے خط لکھنے کی اس عادت کا ذکر وہ مزاحیہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

> ''وہ ہمیں اکثر ایسے خط لکھتے رہے ہیں جن کے جواب دینے کی نہ ہم میں تاب ہے نہ مجال۔آپ جانتے ہیں کہ واہی ساحب بہت اچھے منظوم' خط کہتے' ہیں۔آپ کو ہماری گرامر کا نہیں واہی صاحب کے خطوں کا قصور ہے۔جب نظم کہی جاتی ہے غزل کہی جاتی ہے تو منظوم خط بھی کہے جاتے ہیں۔ لکھے نہیں

جاتے، 1969ء کے اوائل میں ان کا پہلا منظوم خط ہمیں ملا تھا۔ اس خط کو پا کر ہم کئی دن پریشان رہے کہ انھیں کیسے جواب دیں کیوں کہ ہم 'ہمیشہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے' کے عادی رہے ہیں اور یہاں ہمارا یہ حال تھا کہ نہ ردیف کی خبر ہے نہ قافیہ معلوم۔'' 25؎

عمیق حنفی ایک چھوٹے قد کے انسان تھے۔ ان کے قد ر پر مزاحیہ انداز میں یوں روشنی ڈالی ہے:

ہم ریڈیو اسٹیشن کی سیڑھیوں سے اتر کر آنے لگے تو دیکھا کہ عمیق حنفی اپنے پستہ قد کو زمین سے گھستے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ پستہ قد لوگوں کو میں ہمیشہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ زمین پر کم سے کم چلیں۔ قدرت نے جتنا بھی قد دیا ہے اس کی جی جان سے حفاظت کریں۔ اگر خدانخواستہ یہ کثرت استعمال سے گھس گیا تو زمین پر آدمی کی بجائے ٹوپی چلے گی''۔ 26؎

فیض احمد فیض اپنا کلام بے دلی سے سناتے تھے۔ ان کے کلام سنانے کے بارے میں مزاحیہ انداز میں مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''میں نے فیض کو کئی برس پہلے حیدرآباد کے ایک مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ اپنے محبوب شاعر کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ایک سامع کی حیثیت سے میں انھیں بہت دیر تک دیکھتا رہا مگر جب انھوں نے کلام سنانا شروع کیا تو انھیں دیکھنے کا سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ ایسی بے دلی سے کلام سناتے تھے جیسے کسی دشمن کا کلام سنا رہے ہوں۔ سناتے وقت وہ اپنی اتنی اچھی شاعری کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے تھے''۔ 27؎

ظفر پیامی کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا جب مجتبیٰ حسین ان کے گھر میں داخل ہوئے تھے ان کو کتوں کی بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ اس واقعہ کو ایک لطیفے کے ذریعے یوں بیان کرتے ہیں:

''میں نے دیوان صاحب سے پوچھا بھی کہ ان کے گھر میں کتنے کتّے پلتے ہیں، بولے ہیں تو دو ہی کتّے لیکن بھونکتے کچھ اس طرح ہیں کہ بیک وقت چار پانچ کتّوں کی بھونک، بھونکتے ہیں''۔28؎

مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکوں میں مزاح نگاری کے ساتھ انھوں نے اردو زبان کے تعلق سے حکومت پر طنز بھی کیا ہے۔ایک واقعہ انھوں نے دوست کی شادی کے سلسلے میں سنایا ہے اس میں ان کے طنز پر روشنی پڑتی ہے مثال دیکھئے:

''گجرال کمیٹی اب اپنی مخصوص شہرت کے باعث ضرب المثل کے طور پر بھی استعمال ہونے لگی ہے۔کسی طرح استعمال ہو رہی ہے اس کے لیے چند مکالمے ملاحظہ ہوں۔

یار!اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ میرے ساتھ گجرال کمیٹی کر رہی ہے،

ایک زمانہ تھا جب آٹھوں پہر تمہاری یاد آتی تھی اب یہ حال ہے کہ گجرال کمیٹی کی طرح یاد آتی ہو۔

بیٹی تمہارے والدین نے جہیز میں ایک تنکا تک نہیں دیا۔کچھ دینے کی سکت نہیں تو گجرال کمیتی کی رپورٹ ہی دے دیتے جس پر عمل آوری کی آس لگائے بیٹھے تو رہتے۔

بھیّا! وہ جو میں نے تمہیں دس سال پہلے قرض دیا تھا اسے اب واپس ہونا چاہئے۔اس سے زیادہ گجرال کمیتی نہیں چلے گی۔ گجرال کمیتی کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔29؎

اس طرح مجتبیٰ حسین نے گجرال کمیٹی کے واقعہ کو ضرب المثال کے طور پر استعمال کر کے حکومت پر طنز کیا ہے۔اسی اقتباس سے ان کی مزاح نگاری کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ساتھ ہی گجرال کمیٹی

کے ذریعہ سے اردو کے ساتھ کی جانے والی ناانصاف اور سوتیلے برتاؤ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اپنے ذہن میں بسے واقعات کے ذریعہ سے موضوع خاکہ کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔ البتہ انھوں نے شخص کے خدوخال، چہرے کے نقوش کو پیش کرنے تمام قوت کو اپنی طرف مبذول کرویا یہی وجہ ہے کہ قاری کی توجہ خاکے کو مکمل پڑھنے تک برقرار رہتی ہے۔ چنانچہ کنہیالال کپور کے خاکے کی شروعات اس طرح سے کرتے ہیں؛

''کنہیالال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں تو قطب مینار کی یاد آتی ہے اور جب قطب مینار کو دیکھتا ہوں تو آپ جان گئے ہوں کہ کس کی یاد آتی ہوگی''۔30

اس طرح اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کے خاکے کی شروعات ان مزاحیہ الفاظ میں کرتے ہیں کہ دلچسپی قائم ہوجاتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

ابراہیم جلیس افسانہ نگار تھے۔ مگر میرے لیے صرف افسانہ تھے حالانکہ وہ میرے بڑے بھائی تھے''۔31

مجتبیٰ حسین نے جوگیندر پال کے خاکے کی شروعات میں مزاحیہ انداز میں ان کی شریف النفسی پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً دیکھئے

''کسی آدمی کے بہت زیادہ شریف اور مہذب ہونے کے یوں تو ان گنت فائدے ہیں لیکن ایک نقصان یہ ہے کہ شریف آدمی کا بھرپور خاکہ نہیں لکھا جاسکتا''۔32

مندرجہ بالا تمام اقتباسات سے مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے طرز اسلوب کا بھی پتہ چلتا ہے اور خاکے کی ابتداء ہی سے شخصیت کی تصویر کشی کی عکاسی کرتے ہیں مثلاً ان کے حلیے، گفتگو، رہن سہن، عادت و اطوار اور صفات و کردار کی خوبیوں اور خامیوں کا بیان مزاحیہ و پرلطف اسلوب کے ذریعے کرتے ہیں انھوں نے نہ تو شخصیات کی کمزوریوں اور خامیوں میں بت شکنی

کی کوشش کی اور نہ ہی ان کی صفات و کردار کی خوبیوں کو بت پرستی کے انداز میں پیش کیا بلکہ ان کی خامیوں کا بیان کسی نہ کسی مزاحیہ و پر لطف واقعے کے ذریعہ یا پھر لطائف کے ذریعہ کیا ہے اور طنز بھی کیا ہے تو مزاح کے پردے میں جس سے موضوع خاکہ کی دل شکنی نہیں ہوتی بلکہ وہ بھی اپنی اصلاح پر مجبور ہو جاتا ہے اور ان کے مزاح کے لطف سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہی ان کے اسلوب کا کمال ہے کہ انھوں نے اتنے زیادہ تعداد میں اتنے عمدہ خاکے تحریر کئے ہیں کہ یقیناً جب کبھی بھی خاکہ نگاری کی تاریخ لکھی جائے گی وہ مجتبیٰ حسین کی تحریروں کے ذکر بغیر ادھوری سمجھی جائے گی۔

☆☆☆

حواشی

1۔ محمد اسلم، مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری، مجتبیٰ حسین نمبر، ماہنامہ شگوفہ، نومبر، 1987، ص:34

2۔ مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری، مشمولہ، مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کا ایک تجزیہ، 2003، ص: 117
3۔ سجاد ظہیر مسکراہٹوں کا آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2010، ص:48
4۔ کنہیالال کپور، لمبا آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:10
5۔ عمیق حنفی، آدمی در آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:72
6۔ خواجہ عبدالغفور، لطیفوں کا آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:88
7۔ حسن الدین احمد، لطیفوں کا آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص: 96
8۔ کرشن چندر، آدمی ہی آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:44
9۔ کے۔ ایل نارنگ ساقی، مشمولہ، چہرہ در چہرہ، ص:137
10۔ امیر قزلباش، مشمولہ، چہرہ در چہرہ، ص:110
11۔ اختر حسین، مشمولہ، چہرہ در چہرہ، ص:30
12۔ کرشن چندر، آدمی ہی آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:44
13۔ کمار پاشی، مشمولہ، چہرہ در چہرہ، ص:96
14۔ راجیندر سنگھ بیدی، سو ہے وہ بھی آدمی، آدمی نامہ، ص:21
15۔ ظ۔ انصاری، مشمولہ، چہرہ در چہرہ، ص:44
16۔ مخدوم محی الدین، یادوں میں بسا آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:36
17۔ زبیر رضوی، مشمولہ، چہرہ در چہرہ، ص:99
18۔ فکر تونسوی۔ بھیڑ کا آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:64
19۔ حکیم یوسف حسین خان، مشمولہ، مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، ص:179
20۔ خاکہ نگاری اور مزاح، مشمولہ، اردو نثر میں طنز و مزاح، ص:428
21۔ مخدوم محی الدین، یادوں میں بسا آمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:36

22۔ رضا نقوی واہی، منظوم آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:83

23۔ عمیق حنفی، آدمی در آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:79

24۔ شریف الحسن نقوی، مشمولہ، چہرہ دار چہرہ، ص:89

25۔ رضا نقوی واہی، منظوم آدمی، مشمولہ، آدمی نامہ، ص:81

26۔ عمیق حنفی، مشمولہ، مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، ص:136

27۔ فیض احمد فیض، مشمولہ، سو ہے وہ بھی آدمی، ص:13

28۔ ظفر پیامی، مشمولہ، چہرہ در چہرہ، ص:58

29۔ اندر کمال گجرال، مشمولہ، چہرہ در چہرہ، ص:16

30۔ کنہیالال کپور، مشمولہ، مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، ص:45

31۔ ابراہیم جلیس، مشمولہ، مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، ص:80

32۔ جوگیندر پال، مشمولہ، چہرہ در چہرہ، ص:45

☆☆☆

عطاالحق قاسمی (پیدائش 1943)

عطاالحق قاسمی یکم فروری 1943ء میں پیدا ہوئے۔ان کا شمار اردو کے اہم مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق صحافت کے شعبے سے بھی تھا۔صحافت کے میدان میں قدم رکھنے والے مزاح نگاروں میں ابن انشاء اور مشفق خواجہ کے بعد عطاالحق قاسمی کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔انھوں نے مزاحیہ کالم نگاری کے علاوہ مزاحیہ سفرنامے،ڈرامے اور خاکے بھی تصنیف کئے ہیں۔عطاالحق قاسمی کے خاکوں کے دو مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''عطایئے'' ہے۔ یہ مجموعہ 1982ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ ''مزید گنجے فرشتے'' ہے۔اس کو 1997ء میں شائع کیا گیا۔

جیسا کہ ذکر آچکا کہ ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''عطایئے'' ہے۔اس میں چوبیس کالم اور سولہ خاکے شامل ہیں۔اور ''مزید گنجے فرشتے'' میں کل اڑتیس خاکے شامل ہیں۔ان خاکوں میں تین خاکے خواتین کے ہیں۔اور ادیبوں کے دو دو خاکے بھی شامل ہیں۔بعض خاکے ''عطایئے'' میں بھی شامل ہیں۔چنانچہ مزید گنجے فرشتے کے متعلق اشتیاق احمد ورک لکھتے ہیں:

> ''کتاب کا نام جیسا ظاہر ہے منٹو کے 'گنجے فرشتے' کا تتبع ہے،لیکن اس کتاب میں منٹو کے کردار کے برعکس چند ایسی شخصیات کے بھی خاکے ہیں جو واقعی فرشتہ صفت انسان ہیں اور جنھیں عطاء نے فرشتوں سے بہتر انسان ثابت کیا ہے۔ یہاں عطاء الحق قاسمی نے ایک مزاح نگار ہونے اور منٹو سے نام مستعار لینے کے باوجود استرا ہاتھ میں پکڑ کے انھیں گنجا کرنے کی کوشش نہیں کی۔انھوں نے جملے ضائع کر دیئے ہوں تو الگ بات، بندے

ہرگز ضائع نہیں کئے''۔1

عطاالحق قاسمی نے حسین احمد شیرازی سے پہلی بار ایک کتاب کے سلسلہ میں ملاقات کی تھی۔ اس وقت وہ ایسے لگتے تھے کہ دبلے پتلے انسان اور عمر ساٹھ سے زیادہ تھی۔ لحاظہ شیزادی کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسین احمد شیرازی سے میری ملاقات ان کی کتاب ''بابونگر'' کے حوالے سے اس وقت ہوئی جب وہ یہ کتاب مجھے دینے آئے تھے۔ایک دبلے پتلے سے شخص، کم بولنے والے بظاہر لٹریچر سے نارمل سا تعلق، مجھے لگا جیسے میں کسی ایسے شخص سے مل رہا ہوں جو میرے مزاج کا نہیں ہے۔انسان کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہو جائے تو اسے اسمارٹ رہنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ کیا فائدہ ہے''۔2

پہلی ملاقات میں کچھ خاص اثر مرتب نہ ہوسکا چنانچہ ان کی کم گوئی اور بات نہ کرنے کی عادت نے انھیں مایوس کیا۔ چنانچہ اپنی پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کا بیان اس طرح کیا:

اگر بولنا نہیں تو نہ منہ میں زبان کس لیے رکھی ہے۔زبان تو ہے ہی اس لیے کہ بس آپ بولتے رہیں اور دوسرے سنتے رہیں۔ایک سابق بیوروکریٹ میں تو یہ خصوصیت دوسروں سے کہیں زیادہ ہونی چاہئے کہ وہ جب بولتا ہے تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ایک بات مجھے یہ بھی عجیب لگی کہ بندہ ایک کتاب کا مصنف ہے اور ادب پر کوئی بات بھی نہیں کر رہا چنانچہ مجھے شیرازی صاحب کی شخصیت میں کوئی دلکشی نظر نہ آئی۔لیکن وہ جو شاعر نے کہا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ 3

حسین احمد شیرازی حفظ مراتب کا خاص خیال رکھتے تھے وہ بڑے مہذب انسان تھے۔ دوستوں کے خلوص کا خاص خیال رکھتے تھے۔انھیں یہ بات گوارا نہیں تھی کہ ان کی وجہ سے کسی کو تکلیف ہو۔مثال کے طور پر اگر وہ کسی کے گھر ان سے ملنے جا رہے ہیں۔تو پہلے فون کر کے پوچھ لیتے تھے اور

پھر جانے کے بعد یہ بھی سوچتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کہیں ان صاحب کا وقت تو ضائع نہیں ہو رہا ہے۔ ان کی شخصیت کی ان خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں:

مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی شخصیت اتنا مہذب اور وضعدار بھی ہو سکتا ہے۔ فون کرنے سے پہلے پیغام بھیجنا کہ آپ مصروف تو نہیں ہیں، آنے سے پہلے فون کرنا اور پھر منٹوں کے حساب سے ٹھیک وقت پر پہنچنا۔ زبان پہ کسی کے لیے بھی حرف شکایت یا حرف غیبت نہ لاتا، جتنی دیر بھی بیٹھنا اس امر کا خیال رکھنا کہ کہیں میں اس شخص کے معمولات میں دخیل تو نہیں ہو رہا اور اگر محسوس کرنا کہ جس سے ملاقات کے لیے وہ آئے ہیں اسے اور بھی کام کرنا ہیں، اجازت لے کر رخصت ہو جانا۔ اگر کسی دوست نے کھانے پر بلایا ہے تو کیک یا پھولوں کے ساتھ آنا اور واپسی پر شکریے کا پیغام بھیجنا۔ میں تو اس شخص کی یہ عادات واطوار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے تو لگا کہ یہ کوئی پرانا انگریز ہے جو اتفاق سے پاکستان میں پیدا ہو گیا ہے'' ۔4

شیرازہ صاحب کی کھانے کا انداز بھی عطا الحق قاسمی کو نرالہ لگا کیوں کہ کھانے کی میز پر ہم صرف کھانے پر دھیان دیتے ہیں لیکن ان کی شرافت یہی تھی کہ وہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے خلوص سے بات کرتے ہیں چنانچہ وہ ان کی شخصیت کی اس خاص خوبی کی عکاسی یوں کی ہے:

مجھے اس وقت ان کی اسمارٹنس کا راز بھی معلوم ہوا جب کبھی کھانے کی میز پر ان سے ملاقات ہوئی، ہم سب تو کھانے کے ساتھ گتم گتھا ہو رہے ہوتے ہیں اور شیرازی صاحب یہاں انواع واقسام کے کھانوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے صرف یہی کہتے نظر آتے ہیں۔ ''نائس ٹوسی یو'' اور ہاں محبت کرتے ہیں تو ٹوٹ کرتے ہیں۔'' 5

عطاء الحق اسی کے خاکوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے خاکوں میں موقع بہ موقع

ایسے ایسے جملے استعمال ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

''بیوی سے عشقیہ گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایسی جگہ خارش کرے جہاں خارش نہ ہورہی ہو''۔

فاضل پور میں ایک مشاعرہ تھا جس میں 118 شاعر سامعین کی سرکوبی کے لیے موجود تھے۔6

عطاء الحق قاسمی نے اپنے خاکوں میں طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے۔ اقباس ملاحظہ فرمایئے۔ مثلاً ایک مرتبہ فہمیدہ ریاض نے اپنے انٹرویو کے ایک جملے میں طنز ومزاح سے کام لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''فہمیدہ ریاض نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ بات کہی کہ احمد ندیم ایک شریف آدمی ہیں اور شریف آدمی کبھی عظیم فن کار نہیں ہوسکتا۔ اس ضمن میں صرف دو باتیں کہنے کو جی چاہتا ہے پہلی بات تو قاسمی صاحب سے کہنے کی ہے کہ ''قاسمی صاحب! ''ہور چوپو'' اور دوسری بات متذکرہ بیان کی تصدیق کے سلسلہ میں ہے کیوں کہ میں خود ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ ایک شریف آدمی عظیم فن کار نہیں ہوسکتا۔ عظیم فن کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم بستہ ب کا بدمعاش ہو اور وہ جیل میں یوں جائے جس طرح لوگ سسرال میں جاتے ہیں''7

عصر حاضر کے شعراء کی صورتحال پر بھی طنز سے کام لیا ہے، جو خیالات مستعار لیتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

ہمارے ہاں ایسے شاعر بھی موجود ہیں۔ جن کے امپورٹڈ خیال اور اظہار کو دیکھتے ہوئے یہ مطالبہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کم از کم دو سو فیصد کسٹم ڈیوٹی عاید کی جائے''۔8

عطاءالحق قاسمی کے خاکوں میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے نشتر بھی نظر آتے ہیں۔مثلاً ان کے خاکے میں ان کی خود کو نوجوان دکھانے کی عادت پر طنزیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''پچانوے بس کی عمر میں تو انسان کی فوت ہوئے بھی کم از کم پچیس برس گذر چکے ہوتے ہیں لیکن ہمارے بابا جی پچپن برس کے نوجوانون کی طرح ایکٹر نظر آتے ہیں''۔9؎

سلیم اختر کے حلیہ عکاسی کرتے وقت پاکستان کے 1973ء کے آئین کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں

''سلیم اختر کی شکل میں جو چیز بن گئی ہے وہ اتفاق سے اچھی چیز ہے لہٰذا اسے جوں کا توں رہنے دینا چاہیے ورنہ ترمیمات سے اس کی شکل بھی 1973ء کے آئین جیسی ہو سکتی ہے''۔10؎

عطاءالحق قاسمی کے ہاں مزاح کے پہلو بہ پہلو طنز کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔مثلاً ایک جگہ پر طنز اور مزاح کا خوب صورت امتزاج بھی نظر آتا ہے۔مثلاً ناصر زیدی کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہوئے ایک واقعہ کے حوالے سے عصر حاضر کے ادب پر طنز کیا ہے:

''ہمارے فارسی کے عالم فاضل استاد مسٹر تابان سردیوں میں اسکول کے لان میں کلاس لیتے، ہم گھاس پر بیٹھ جاتے اور وہ ہاتھ میں مولا بخش لیے پان چباتے اکثر یہ پیش گوئی کرتے، میری بات لکھ لو، تم گنڈیریاں بیچو گے، ان ان کی پیش گوئی کم از کم ناصر زیدی کے بارے میں درست ثابت نہیں ہوئی، کیوں کہ ناصر گنڈیریاں نہیں بیچتا، اپنی نظمیں غزلیں معاوضہ دینے والے سرکاری پرچوں، ریڈیو اور ٹی وی کے پاس بیچتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ گنڈیریوں کی قیمت پر بیچتا ہے۔ہمارے ہاں ادب اسی قیمت پر بکتا ہے''۔11؎

ان تمام اقتباسات کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی کے کہ انھوں اپنے خاکوں میں

خاکہ نگاری کے فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح کے عناصر بھی شامل کئے ہیں۔ان کے خاکوں میں طبعی شگفتگی اور فطری ظرافت تو ملتا ہے مگر یہ خصوصیات ان کے اُن خاکوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں جو خاکے انھوں نے فرمائشی طور پر کسی تقاریب کے سلسلے میں لکھی تھیں چنانچہ ان کے ایسے ہی خاکوں سے متعلق اشتیاق احمد ورک اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مثال کے طور پر امجد اسلام امجد کا خاکہ ان کی مثالی دوستی اور رنگارنگ شخصیت کی بناء پر اور قاسمی صاحب کا خاکہ ان کی عقیدت اور محبت کی وجہ سے نکھر گیا ہے۔

احسان دانش کے خاکے میں ان کی ظاہری سنجیدگی اور باطنی شگفتگی اور چھیڑ چھاڑ کے دلچسپ تذکرے نے رنگ بھر دیئے ہیں۔عبدالعزیز خالد کے خاکے میں ان کے دوسرے شعراء کے ساتھ مواز نے مزید ارصورت حال پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح شبنم رومانی اور عارف المتین کے خاکے کے آغاز میں تو نہایت دلچسپ ہیں مگر بعد میں وہ ٹیمپو Tempo برقرار نہیں رکھا جاسکا۔[12]

☆☆☆

حواشی

1۔اردو نثر میں طنز و مزاح،ڈاکٹر اشتاق احمد ورک،انتخاب جدید پریس،لاہور،2004،ص:433

2۔حسین احمد شیرازی،مشمولہ،شگوفہ،شمارہ ا،جلد 49،جنوری 2016،ص:45

3۔حسین احمد شیرازی،مشمولہ،ماہنامہ شگوفہ،جلد 49،شمارہ،1،جنوری،2016،ص:45

4۔حسین احمد شیرازی،مشمولہ،ماہنامہ شگوفہ،جلد،49،شمارہ،1،جنوری،2016،ص:45

5۔حسین احمد شیرازی،مشمولہ،ماہنامہ شگوفہ،جلد،49،شمارہ،1،جنوری،2011،ص:45

6۔بحوالہ،روزنِ دیوار سے،اردو نثر میں طنز و مزاح،اشتیاق احمد ورک،ص:433

7۔بحوالہ،قاسمی اور قاسمی،اردو نثر میں طنز و مزاح،عطاالحق قاسمی،ص:433

8۔بحوالہ،بانڈ سے اختر نمان تک،اردو نثر میں طنز و مزاح،عطاالحق قاسمی،ص:433

9۔ بحوالہ،وقار انبالوی،اردو نثر میں طنز و مزاح،عطاالحق ماسمی،ص:434

10۔ بحوالہ،سلیم اختر ،اردو نثر میں طنز و مزاح،عطاالحق قاسمی،ص:434

11۔ بحوالہ،ناصر زیدی،اردو نثر میں طنز و مزاح،عطاالحق قاسمی،ص:434

12۔ اردو نثر میں طنز و مزاح،اشتیاق احمد ورک،ص:432

☆☆☆

پرویز اللہ مہدی (پیدائش 1943)

پرویز اللہ مہدی 21/جون 1943ء کو فرقہ مہدیہ کے ایک سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔حیدرآباد میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ان کا اصلی نام ''سعید یداللہ مہدی حسینی'' ہے۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔انھوں نے مزاحیہ نثر نگاری کو اپنایا۔ان کے اندر کا شاعر ان کے مضامین میں بھی نظر آجاتا ہے۔مزاحیہ مضامین میں ''چھیڑ چھاڑ'' ان کی پہلی تصنیف ہے جو 1974ء میں شائع ہوئی۔

پرویز اللہ مہدی نے رشید عبدالسمیع جلیل کا خاکہ''حساب دوستان۔۔۔ درنصاب دل'' کے عنوان سے لکھا ہے۔شگوفہ کے ایڈیٹر جو پرویز اللہ مہدی کے عزیز دوست سید مصطفیٰ کمال نے رشید عبدالسمیع سے ان کی ملاقات کروائی تھی۔اس پہلی ملاقات کا حال اور پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

> ''گیارہ برس پہلے کی وہ شام مجھے ابھی تک یاد ہے جب عزیز دوست سید مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ نے بیچلرز کواٹرس کی سیڑھیوں کے پاس شام کے جھٹپٹے میں جھٹپٹی رنگت والے ایک نوخوان سے میرا تعارف کروایا'' یہ رشید عبدالسمیع جلیل ہیں، نوجوان شاعر اور میرے شاگرد۔!'' لفظ شاگرد پر میں نے بجائے شاگرد کے استاد کو گھور کے دیکھا اور سوچا یہ مصطفیٰ کمال پاشاہ ''شگوہ جمال پاشو'' کب سے صفی اورنگ آبادی ہوگئے، حضرت کو شاعری سے کوسوں کا واسطہ نہیں اور شاگرد بنا رکھا ہے ایک شاعر کو۔کمال صاحب نے غالباً میری اس غلط فہمی کو

بھانپ لیا تھا مسکرا کر بولے'' شاعری کے میدان میں سمیع صاحب میرے نہیں شاذ تمکنت صاحب کے شاگرد ہیں۔ البتہ یہ کالج میگزین کے مدیر اعلیٰ ہیں اور طباعتی امور کے سلسلے میں اکثر مجھ سے بڑے خدویانہ انداز میں رجوع فرماتے ہیں۔ اس لیے اس معاملے میں میرے شاگرد کہلائے جا سکتے ہیں''۔ اس تشریح کے بعد کمال صاحب نے روئے سخن اس روسیاہ کی طرف کیا۔ ان کا نام تو آپ نے ادبی غیر ادبی، معیاری غیر معیاری، فلمی، علمی، جنسی غرض ہر قسم کے رسائل و اخبارات میں بارہا پڑھا ہوگا۔ پرویز اللہ مہدی خوب چھپتے ہیں، توقع ہے کہ آئیندہ خوب لکھنے بھی لگیں گے!!''۔ کمال صاحب کو جائز و ناجائز جواز پیش کرنے اور دور کی کوڑی کو قریب کی، قریب کی کوڑی کو دور کی ثابت کرنے میں کمال حاصل ہے۔ آدمی بھی باکمال ہیں۔ اور مدیر بھی باکمال۔ میں نے اس دوران محسوس کیا کہ نوجوان شاعر رشید عبدالسمیع جلیل کا ہاتھ جو تعارفی کاروائی کی ابتداء کے ساتھ ہی مصافحے کی غرض سے میری طرف بے ساختہ بڑھ گیا تھا اسی طرح اسٹیشن ہے تو میں نے خورا مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔' پہلی ملاقات میں لوگ عموماً یہ طرحی مصرح الاپتے ہیں، بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کے، لیکن میں پہلی ہی ملاقات اس مصرع پر گرہ لگانے کا قائل نہیں، یہ بات تو آنے والا وقت ہی بتا تا ہے کہ ہمیں کسی سے مل کے واقعی خوشی ہوئی تھی یا نہیں''۔

میرے اس شوشے پر سمیع نے پوری قوت سے میرا ہاتھ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا۔ اگر یہ بات ہے تو میں ابھی آپ کو اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ مجھ سے مل کر آپ کو یقیناً خوشی ہوگی، کیونکہ خوش ہونے کے معاملے میں، میں آپ کا ہم خیال ہوں''۔ 1

مندرجہ بالا اقتباس سے ان کی پہلی ملاقات کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی شخصیت کا بھی علم ہو جاتا ہے اور یہ دونوں ایک جیسی شخصیت کے حامل تھے۔ اس لئے پروفیسر یزداللہ مہدی کی دوستی

عبدالسمیع سے بہت جلد ہوگئی۔ان کے تعلقات بہت گہرے ہوگئے۔اور اپنے انھیں تعلقات کی بناء پر انھوں نے یہ خاکہ لکھا ہے لحاظہ ان سے دیرپا تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے سہ لکھتے ہیں:

''حالانکہ شاعرنصاب دل سے میری دوستی کوئی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی نہیں بلکہ ہماری دوستی کا اکاؤنٹ 70 کے وائل میں کھلا اور بفضل ربی ابھی تک اسے بند کرنے کی نوبت نہیں آئی،روز بروز اس کھاتے میں خلوص بڑھتا ہی رہا''۔2

عبدالسمیع کے نام کی طوالت کے بارے میں ذکر کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت سے زیادہ ان کے نام سے پرویز اللہ مہدی کو لگاؤ تھا۔کیوں کہ ان کا نام بھی عبدالسمیع کے نام کی طرح لمبا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''سمیع کی اس ادا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں نے آگے کہا۔مجھے دراصل آپ کی شخصیت سے زیادہ آپ کا نام پسند آیا۔حلقہ احباب میں میرے ہم حبشہ بھی ہیں اور ہم غصہ بھی لیکن نام کی طوالت کے معاملے میں آپ پہلے آدمی ہیں جو میرے ہم پلّہ ثابت ہوئے ورنہ ہم اب تک میرا نام کسی چھوٹی بحر کے لنڈورے مصرع کی طرح تھا۔تنہا تنہا اداس اداس لیکن آج آپ سے مل کر لگ رہا ہے جیسے شعر مکمل ہوگیا!!سمیع نے اسی طرح جھٹپٹاتے ہوئے لقمہ دیا،واہ پھر ایک بار آپ کا خیال میرے خیال سے ٹکرا گیا''۔3

پریذ اللہ مہدی کا انداز مزاحیہ ہے جو بھی بات کرتے مزاحیہ انداز میں کرتے تھے سمیع صاحب کی طبیعت بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔اس لیے دونوں میں بہت بنتی تھی۔اس لیے ہر ملاقات میں ان سے مزاحیہ طرز کی گفتگو رہتی تھی۔دوسری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

''اگلی ملاقات میں، میں نے سمیع کو راز کی بات بتائی۔ادبی حلقوں میں طویل نام اکثر بحث کا موضوع بن جاتے ہیں۔اس کی تازہ مثال میرا نام ہے۔جب بھی میرا کوئی مضمون چھپتا ہے یار لوگ یوں اس پر تبصرہ فرماتے ہیں۔یہ

مضمون دراصل تین مزاح نگاروں نے مل کر لکھا ہے۔ ایک کا نام پرویز ہے۔
دوسرے کا ید اللہ اور تیسرے کا مہدی لہٰذا اگلا گرا پچھلا ہوشیا کے مصداق اس سے
پہلے کہ لوگ آپ کے نام کی طوالت کی ٹانگ کھینچیں آپ یہ مشہور کر دیجئے کہ
رشید آپ کے والد بزرگوار کا نام ہے، عبدالسمیع آپ کا ذاتی نام اور جلیل آپ
کے فرزند ار جمند کا نام، اس طرح کریڈیٹ کسی اور کو نہیں جائے گا گھر میں ہی
رہے گا'' میرے اس زریں مشورے پر سمیع بجائے اس کے کہ میرا شکریہ
ادا کرتے حیرت سے بولے۔ آپ تو دو تہائی غائب داں معلوم ہوتے ہیں۔ اس
دو تہائی انکشاف پر میرے غرق حیرت ہونے کی باری تھی۔ سمیع نے وضاحت
کچھ اس طرح فرماتی، آپ کی بات میں دو تہائی سچائی ہے۔ رشید واقعی میرے
والد بزرگوار کے نام کا ایک جز ہے اور عبدالسمیع میرا اپنا نام اب رہا میرے نام کا
آخری جز جلیل۔'' 4

سمیع کو چائے پینے کی عادت تھی۔ یہی چائے ان کی کمزوری بھی تھی کیوں کہ چائے نے ان کی شاعری کو تو زور بیان عطا کیا تھا۔ لیکن وہیں جسمانی طور پر کمزور بھی کر دیا تھا لحاظہ پرویز ان چائے نوشی کی عادت کا ذکر صنعت تکرار کے خوبصورت استعمال سے مزاحیہ لطف کے ساتھ کرتے ہیں:

''ان کی طبع رواں تو معمولی چائے کی پیالی پر ''رواں دواں'' ہو جاتی ہے۔
چائے سمیع کی کمزوری ہے اور اس کمزوری نے جہاں ان کی شاعری کو زور بیان
عطا کیا ہے وہیں انھیں جسمانی طور پر خاصا کمزور کر دیا ہے۔ البتہ سمیع جب چائے
نہیں پی رہے ہوتے سگریٹ پیتے ہیں اور جن لمحوں میں سگریت نہیں پیتے
ناقدری زمانہ پر آنسو پیتے ہیں اور جب آنسو نہیں پی رہے ہوتے دنیا کے مکر و
فریب اور اپنی سادگی و سیدھے پن پر خون کے گھونٹ پیتے ہیں اور جس گھڑی
پینے کے یہ بہانے بھی میسر نہیں آتے تب یہ اپنی اس محرومی کے غم میں غصہ پیتے
ہیں، گویا پینے کا یہ سلسلہ، سلسلہ در سلسلہ چلتا ہے۔'' 5

پرویز اللہ مہدی نے نہ صرف عبدالسمیع کے خاکے میں ان کے حلیہ،ان کی عادتوں وغیرہ کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے۔یہاں بھی ان کا مزاحیہ انداز جھلکتا ہے۔

پرویز یداللہ نے موضوع خاکہ کمزوریوں کا ذکر بھی مزاحیہ انداز میں غیر جانبداری سے کر دیا ہے جس نے ان کی دل شکنی بھی نہ ہوا اور وہ اپنی اصلاح کرلے۔عبدالسمیع ایک الگ شخصیت کے مالک تھے۔وہ زندگی اور شاعری دونوں ہی معاملات میں آہستہ روی کے قائل اس لیے ان آہستہ روی کی وجہ سے اکثر انھیں تکلیف بھی اٹھانی پڑی تھی۔ان کی اس آہستہ روی کا ذکر مزاحیہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

> زندگی ہو یا شاعری سمیع ہر معاملے میں آہستہ روی کے قائل ہیں۔انھوں نے غالباً بعض محاوروں کو غلط ثابت کرنے کا بیڑہ اٹھا کر چبالیا ہے۔محاورہ ہے کل کرے سو آج کر،آج کرے سو اب،اسے غلط ثابت کرنے کے لیے سمیع اب کا کام تب پر اور آج کا کام کل پر ٹالتے رہتے ہیں۔اگر انھیں کہیں دس بجے پہنچنا ہوتا ہے تو یہ کوشش ضرور کرتے ہیں کہ دس بجے ہی مقام مطلوبہ پر پہنچ جائیں، فرق صرف دن اور رات کا ہو جاتا ہے،دن کے دس بجے کا وقت طے ہو تو یہ رات کے دس بجے ضرور پہنچ جاتے ہیں۔6

''حساب دوستاں ......درنصاب دل'' کے خاکے میں پروز یداللہ مہدی نے سمیع کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی عادات واطوار کا بیان بھی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

پرویز یداللہ مہدی نے ''کرداروں کا مسیحا'' کے عنوان سے ابن صفی کا خاکہ بھی تصنیف کیا ہے۔اس خاکے میں ان کے جاسوسی ناولوں کی مقبولیت کا ذکر بھی دلکش انداز میں کیا ہے۔ پرویز اللہ مہدی کو جاسوسی ناول پڑھنے کی عادت تھی،ان کی اس عادت کو وہ اپنے دوستوں اور استادوں کو بھی سیکھا دیتے تھے۔اس خاکے میں انھوں نے خود اپنی کمزوری کا بھی ذکر کیا ہے کہ انھیں بھی یہ

عادت تھی کہ ہر مہینہ جاسوسی ناول خرید کر پڑھنے کا شوق تھا مگر اتنی حیثیت نہیں تھی کہ اس لیے وہ اپنے استاد کو پڑھنے کے بعد اس ناول کو پڑھتے تھے۔

☆☆☆

حواشی

1۔ حساب دوستاں در نصاب دل، مشمولہ، ماہنامہ شگوفہ، جون، 2011ء، ص:29

2۔ حساب دوستاں در نصاب دل، ماہنامہ شگوفہ، جون، 2011ء، ص:29

3۔ حساب دوستاں در نصاب دل، ماہنامہ شگوفہ، جون، 2011، ص:30

4۔ حساب دوستاں در نصاب دل، ماہنامہ شگوفہ، جون، 2011، ص:30

5۔ حساب دوستاں در نصاب دل، ماہنامہ شگوفہ، جون، 2011، ص:31

6۔ حساب دوستاں در نصاب دل، ماہنامہ شگوفہ، جون، 2011، ص:33

انور ظہیر خاں

انور ظہیر خان کے خاکوں کا مجموعہ ''مت سہل ہمیں جانو'' ہے۔ اس میں سات خاکے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاکوں کے عنوان کو دلچسپ انداز میں رکھے ہیں۔ انھوں نے ظ۔ انصاری کے خاکے کا عنوان '' طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ'' اور سردر جعفری کے خاکے کے لیے ''پھینک پھر جذبہ بے تاب کی عالم پہ کمند'' اختر الایمان کے لئے ''زمین اور ضمیر کے شاعر''، باقر مہدی کے لئے '' کتابیں قہقہے'' حسن نعیم کے لئے '' لا مرکز یت کے شکار'' اور عزیز قیسی کے لیے ''حد یقین سے حد گمان تک'' جیسے عنوانات کا استعمال کر کے انفرادی انداز اختیار کیا ہے۔

انور ظہیر خاں کے خاکوں میں خاکہ نگاری کے تمام فنی لوزمات موجود ہیں انھوں نے شخصیات کو دیکھ کر اور پرکھ کر ہی خاکے لکھے ہیں انھوں نے کسی سے سنی سنائی باتوں کو اپنے خاکوں میں بیان نہیں کیا ہے، بلکہ خود اپنے تجربے کی بناء پر یہ خاکے لکھے ہیں۔ چنانچہ انور ظہیر خان خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے ان شخصیتوں کے بارے میں سنی سنائی سے زیادہ انھیں مختلف زاویوں سے اپنے دیکھے اور برتے پر بھروسا کیا ہے۔ چنانچہ ان خاکوں میں ماحول و منظر کے پس منظر میں شخصیت کو پرکھنے کا انداز ملے گا۔ ان خاکوں میں کہیں ڈرامائیت ہے، کہیں تذکرہ نویسی کہیں ماجرا نگاری کہیں رپورتاژ، کہیں فضا آفرینی وغیرہ وغیرہ کا سہارا لیا گیا ہے۔ مگر افسانہ طرازی سے پرہیز کیا ہے''۔ 1

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انور ظہیر کے خاکوں کی خصوصیات کیا ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں کے اسلوب کو ڈرامہ نگاری، تذکرہ نویسی، واقعہ نگاری اور رپورتاژ نگاری کے

اسلوب سے مدد لے کر سجایا اور سنوارا ہے۔

ان کے خاکوں میں خاکہ نگاری کی خصوصیات عمدگی سے ملتی ہیں۔ مثلاً شخصیات کی، پہلی ملاقات میں ابھرنے والا تاثر، حلیہ، عادات اطوار اور شخصیت کی صفات کا بیان وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ندا فاضلی سے پہلی بار بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی ان کے دوست راشد نے ان سے پہلی ملاقات کروائی تھی۔ شخصیات سے پہلی ملاقات پر ان کے کیا تاثرات رہے وہ ندا فاضلی کے خاکے میں بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ ندا فاضلی سے پہلی ملاقات کے بعد جو منفی تاثر ابھرا اس کا بیان بڑی ایمانداری سے کر دیا ہے مثلاً لکھتے ہیں:

> ''بمبئی کی ایک شام، دن بھر کا تھکا ماندہ سورج رات کی آغوش میں سونے جا رہا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر میں دودھیا اور ہلکے نارنجی قمقموں کا اجالا دور تک پھیل جائے گا۔ میں اپنے اسکول کے ساتھی راشد شیخ اور احمد منظور سے باتیں کر رہا ہوں کہ مارواڑی چال کی راہداری سے دو آدمی مولانا آزاد روڈ کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ راشد نے آنکھ کے اشرے سے کہا وہ دیکھو نور احمد (ن۔ا۔ناظر) کے ساتھ ندا فاضلی چلے آ رہے ہیں میں نے بڑھ کر ادب سے آداب کے بعد عرض کیا، ندا صاحب آپ کی نظم ''جنگل کے لوگ'' دیکھی بڑی پر اثر نظم ہے، مبارک ہو۔ انھوں نے شاعرانہ افتخار اور شاعرانہ بے نیازی کے ملے جلے رنگ میں شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گئے کہ شام بے قرار کر رہی تھی۔ وہ ن۔ا۔ناظر کے ساتھ تھے تو یقیناً انھیں میخانے کی دھو میں آواز دے رہی ہوں گی اور کیا عجب کہ اپنے کاشانے سے کوئی شہناز لالہ رخ بھی اشارے کر رہی ہو۔۔۔۔!
>
> مجھے ان کی یہ ادائے معشوقانہ اچھی نہیں لگی۔ دل نے کہا خدایا کیا یہی ندا فاضلی ہیں۔ وہ ندا فاضلی جو جدید شاعر ہیں۔ ترقی پسندی کے کٹر مخالف

انسان دوست اور مظلوم کے ہم نوا ہیں۔ انھیں ایسا تو نہیں ہونا چاہئے۔۔۔۔
وہ ہماری کچی عمر تھی۔ اس وقت نہیں مگر بعد مدت کے معلوم ہوا کہ بڑا بننے یا بڑا ظالم کرنے کے لئے پندار اور انکسار، سرشاری اور بیداری ناز و بے نیازی کا ایک پالہ سا بنائے رکھنا پڑتا ہے۔ قد جب بلندی کے مراحل طے کر رہا ہو تو بعض لوگ بالا قدروں کے بیچ پنجوں کے بل کھڑا ہونے میں بھی عار نہیں سمجھے''۔2ے

حقیقت نگاری اس اقتباس سے ظاہر ہوتی ہے پہلی ملاقات میں شخصیت سے متعلق تو قائم نہیں کی جا سکتی لیکن پہلا تاثر بڑا اہم ہوتا ہے کیوں کہ ہم جن ادیبوں اور شاعروں کو اپنا سوپر ہیرو یا ائیڈیل سمجھتے ہیں اس سے ملنے کے بعد وہ اثر قائم نہ ہو پائے تو پھر بڑی مایوسی ہوتی ہے وہی انور ظہیر کے ساتھ ہوا۔

انور ظہیر خان پہلی بار اختر الایمان سے ایک سیمنار میں ملے تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بہت دھیمی آواز میں بولتے ہیں۔ لحاظہ اختر الایمان سے پہلی ملاقات پر ابھرنے والے تاثر کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'' میں نے پہلی بار انھیں پریم چند پر منعقدہ سیمنار کے افتتاحی اجلاس میں دیکھا اور بہت قریب سے یوں دیکھا کہ اجلاس کے اختتام پر ایک حضرت سردار جعفری صاحب سے بڑی بے تکلفی سے یہ کہتے سنائی دیئے:

''چلو سردار کہیں چل کے بیٹھیں۔

انھوں نے جوابدیا۔ ''ہاں بس ابھی چلتے ہیں''

شام کا جھٹپٹا تھا۔ کہیں چل کے بیٹھنے کا مطلب میں اس وقت تک نہیں جانتا تھا۔ مگر زمانہ سب سے بڑا استاد ہے۔ یہ آدمی کو سب کچھ سکھا دیتا ہے۔

میں سردار جعفری کی علمیت خطابت اور شاعری سے مرعوب تھا۔ سوچنے لگا۔ حجر اسود سے تراشا ہوا یہ آدمی کون ہے۔ جو دھیمی آواز اور دوستانہ انداز میں ان

سے مخاطب ہے۔ میں وہیں پاس ہی کھڑا ایک ٹک اس صاحب کو دیکھ رہا تھا اور شاید انھوں نے بھی تاڑ لیا تھا۔ کچھ دیر میں ایسا محسوس ہوا کہ وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہہ رہے ہو:

یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو:

مجھے جب معلوم ہوا کہ یہی صاحب اختر الایمان ہیں تو ان کے دھیمے طرز کلام پر خود انھیں کے مصرعے یاد آ گئے۔

تمہارے لہجے میں جو گرمی وحلاوت ہے
اسے بھلا سا کوئی نام دو وفا کی جگہ پر
دیار درد میں آمد کہو مسیحا کی۔ 3

انورظہیر خان نے اپنے خاکوں کے مجموعے میں فرد کے حلیے کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ انھوں نے آنکھ، ناک، دانت، ہونٹ، رخسار اور انگلیوں کے بیان میں تشبیہات کا استعمال بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ سردار جعفری کے حلیہ کے بیان میں تصویر کشی سے کام لیا ہے اتنی عمدگی سے شخصیت کی عکاسی کی ہے کہ پورا نقشہ نظروں میں گھوم جاتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''سردار جعفری کے اوسط درجہ کی، سیپ سے کان، موتی جیسے دانت، پھول کی پنکھڑی جیسے پتلے پتلے گلابی لب ہیں۔ ہونٹوں کے دونوں سروں سے رخساروں کو مس کرتے اوپر کو جاتے ہوئے دو خطوط جو ناک کے آدھوں آدھ، پہنچ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح منہ اور گالوں کے درمیان مساوی زاویوں کا ایک مثلث بنتا ہوا (مثلث جو تخلیق، زندگی اور ارتقا کی علامت ہے) اس مثلث کے اوپری دو زاویوں کے مابین دو نتھنے سانس اور آس کا ثبوت دیتے ہوئے۔ رخساروں پر سرخی بھی ہے، سفیدی بھی۔ گویا Pinkesh Rose} کی دو پنکھڑیاں دھری ہوئی۔ غلافی آنکھیں۔ آنکھوں کے دیئے مدھم اور ملائم لو دیتے

ہوئے۔بھنوؤں کے چھدرے بیز اور گنجان جن کے کچھ دراز تنکے اپنی خودسری ،سرکشی اور آزادی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔جبیں ماہ تمام کی سی ،بھنوؤں کے درمیان ذرا اوپر کو اٹھا ہوا گول گول کالا مسار رکھا ہوا، گویا ماہ تمام میں ایک سیاہ داغ سفید مکھن کی طرح لانبی زلفیں گردن کی طرف پلٹی ہوئیں ۔ جو سامنے سے سنوری نظر آتی ہیں مگر گدّی اور کنپٹی کے گرد الجھی الجھی رہتی ہیں۔جنھیں ہوا کے غیر مرئی ہاتھ چمپئی کتابی چہرے پر بکھرانے کے عمل میں مصروف رہتے ہیں اور انھیں بڑے پیار سے تخلیق گنگا بہانے والی انگلیاں سنوارنے میں لگی رہتی ہیں ان کے یہاں سنوارنے کا عمل ہستی سے گیتی تک پھیلا ہوا ہے۔کرتا پائجامہ اور جیکٹ ،شیروانی۔چپل جوتیاں، پینٹ شرٹ،سوٹ بوٹ۔غرض جو جی بولے اور جیسا موسم ہو ویسا لباس،آواز میں جمالی سے زیادہ جلالی لہریئے۔جیسے میدان جنگ میں عرب کا کوئی صور مارجز بڑھ رہا ہو۔دماغ اربوں، کھربوں خلیوں کی آماجگاہ،جس سے ذہانت کی کرنیں پھوٹتی رہتی ہیں''۔4

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے حلیہ نگاری میں تشبیہات کا کمال دکھایا ہے۔ ساتھ ہی ان کے خدوخال کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ گویا محسوس ہوتا ہے کہ، ہمہ بذات خود سردار جعفری سے مل رہے ہوں۔ عزیز قیسی پٹھان تھے۔ان کے آبا و اجداد پٹھان تھے۔اسی لئے ان کی شباہت بھی پٹھانوں جیسی تھی لمبا قد اور چہرہ وجیہہ ان کے حلیہ کا بیان بھی تشبیہات کے عمدہ استعمال کے ذریعہ کیا ہے۔سیرت وصورت کی عکاسی اس قدر دلکشی کے ساتھ کی ہے کہ پوری شخصیت نظروں کے سامنے آجاتی ہے،مثلاً لکھتے ہیں:

''ذہانت مادری اور پدری تھی رگوں میں پٹھانی خون ٹھاٹیں مارتا تھا۔ ہڈیاں افغانوں کی طرح چکلی چوڑی، گوشت کی چٹانیں چوٹی سے ایڑی تک ہاڑ پر دھری ہوئی تھیں۔قد کسی ایورسٹ سے کم نہ تھا۔ رنگ میلے سونے کی

طرح، چہرہ گول اور بڑا، گال متناسب جن میں ہنستے وقت گڑھے پڑ جاتے تھے، سر کا پیالہ بالوں سے ڈھکا ہوا، گردن پہلوانی تھی، ماتھا چوڑا اور سلوٹوں سے پُر، بال دست برد زمانہ سے محفوظ، گھنگھریالے اور تل چاولے تھے، ناک اونچی اور نتھنے پھولے ہوئے، ناک پر کالے فریم کی موٹے موٹے شیشوں کی عینک دھری ہوئی۔ آنکھیں شیشوں کے پیچھے سے ذہانت کا اعلان کرتی ہوئیں، موٹے موٹے ہونٹ، داڑھی موچھ کا نام ونشان نہیں، لہجے میں ٹھہراؤ، بھرے بھرے کندھے، اونچی راس کے گھوڑے کی سی چھاتی، پیٹ کچھ چھاتی، سے باہر نکلا ہوا۔ اکثر پینٹ اور کبھی کبھی پائجامہ پہنتے، گلے میں پوری آستین کا بش بشرٹ یا کرتا ڈالے ہوتے، اور پیروں میں سستے یا اوسط داموں کے چپل، کسی دور میں شیروانی بھی پہنا کرتے تھے جب آتش جواں تھا۔ واقعی ان کے جثے پر شیروانی کی پھبن دلوں میں لگن اور چبھن پیدا کر دیتی ہوگی۔ چال درمیانہ اور وضع قلندرانہ تھی۔ ان آنکھوں نے جب بھی دیکھا ایک سے حال میں دیکھا۔ عمر بھر قلم کا ہل چلایا۔ محنت مشقت سے، دیدہ ریزی، زہن کی زرخیزی سے گیت غزلیں نظمیں، کہانی، مکالمے، سیریو لکھ کر کمایا۔ خود کھایا بچوں وکھلایا پہنایا۔ امیرانہ ٹھاٹھ کبھی نہیں کئے۔ ممکن ہیکہ حسرت رہی ہو مگر کمایا اتنا ہی کہ گھر کی سفیدی اور لباس کے اجلے پر داغ دھبے نہ دکھائی دیں''۔5

باقر مہدی کی حلیہ نگاری بھی اسی عمدگی سے کی ہے، حلیہ نگاری میں انھیں کمال نظر آتا ہے، ایسی دلکشی ایسی دلکش تشبیہات کے ذریعہ شخصیت کا حلیہ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً باقر مہدی کے حلیے کا بیان یوں کرتے ہیں:

''دل بڑا ہے اور سینے کا پھیلاؤ بھی اچھا خاصا ہے۔ چوڑے چوڑے کندھوں پر موٹی سی گردن۔ گردن پر گیند سا چہرہ اور بڑے گھیر کا سہ سر رکھا ہوا ہے جس میں بک شیلف کے بک شیلف سا گئے ہیں۔ تانبے کے تسلےسی چمکتی ہتی ہے۔ بالو کی

چھوتی سی جھالر کنپٹی اور گدی کے اطراف لٹکی ہوئی ہے۔ ہونٹوں کا شمار نہ بہت موٹوں میں ہے نہ بہت پتلوں میں، مگر ان کے سہارے خم کے خم حلق میں انڈیل دیئے''۔6

حلیہ نگاری کے بیان میں بھی غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ ان کے خاکوں میں شخصیت کی عکاسی کرتے وقت بے جا تعریف ہے نہ بے جا طنز، بلکہ غیر جانبداری سے شخصیت کی عکاسی کی ہے کہ موضوع خاکہ کی شخصیت اپنے تمام خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے مثلاً ندا فاضلی کا حلیہ یوں بیان کیا ہے:

''ندا فاضلی کا دہانہ چوڑا ہے، کندھے مضبوط ہیں، ہاڑ اہل پنجاب کا سا ہے، جوانی میں بید مجنوں تھے اب بانس ہو گئے ہیں۔ سینہ فراخ اور دل بھی کسی ساحب خیر کی طرح فراخ ہے۔ اب جب کہ پچاس پچپن کے پیٹے میں ہیں گوشت نے ہڈیوں کو ڈھک لیا ہے، گال نہ گول ہیں نہ گلگلہ، البتہ بھرے بھرے سے ہیں۔ کہاوت ہے قاضی جی کیوں دبلے، شہر کے اندیشے سے، لیکن ندا فاضلی قاضی ہیں نہ تو قائد، لہٰذا انھیں اس طرح کا کوئی اندیشہ ہی نہیں۔ البتہ ندا فاضلی جوانی میں دبلے تھے، اپنی بیکاری کے ہاتھوں۔ اب فربہ اندام ہیں۔۔۔۔۔ سرخی مائل بڑی بڑی آنکھیں، مئے نوشی اور کتب بیداری کا خمار لیے ہوئے۔ آواز کھردری مگر سماعت پر بار ہو نہیں۔ کشادہ پیشانی بلکہ آدھا سر پیشانی میں شامل۔۔۔ چہرہ ڈاڑھی مونچھ کی گراں باری سے عاری ہے، مزاج لڑکپن سے عاشقانہ، کھلتا ہوا گیہوں رنگ ہے''۔7

اختر الایمان کی حلیہ نگاری غیر جانبداری سے کی ہے حلیے کے بیان کے وقت عمدہ تشبیہات استعمال کی ہے مثلاً اختر الایمان کے قد سرو وصنوبر سے۔ ان کے جسم کی مضبوطی کو ساکھ کی لکڑی سے تشبیہ دی ہے۔ ان کے بالوں کو بھینس کے گھی سے تشبیہ دی ہے۔ ان کے سر کے بال اتنے کم تھے کہ انھیں جسم

پر موجود روئیں سے تشبیہ دی ہے ان کے ہونٹوں کو جامن کھانے کے بعد جو رنگ آجاتا ہے اسی سے تشبیہ دی ہے۔ اتنی عمدہ اور نادر تشبیہات کے ذریعہ اختر الایمان کے حلیے کا بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> اختر الایمان کا قد سرو صنوبر تھا۔ جسم ساکھ کی لکڑی کی طرح مضبوط، رنگ دراڑوں کا سا، بال بھینس کے گھی جیسے سر پر بال اتنے ہی تھے جتنے کہ جسم پر روئیں، کھلی کھلی پیشانی، جس کے اطراف تراشیدہ لٹیں جھولتی رہتیں، روشن آنکھیں کچھ ڈھونڈتی کچھ سوچتی سی، چہرے پر تفکر کے آثار نمایاں رہتے۔ ہونٹ یوں لگتے کہ جیسے ابھی ابھی جامنیں کھائی ہوں۔ لبوں نے کھلنا (کھلنا) کم کم سیکھا تھا۔ آواز ذرا سی بھرائی ہوئی جو بولتے وقت دھیمی ہی رہتی مگر لہجے یں اعتماد پایا جاتا۔ طبیعت کی نفاست کپڑوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ ان کے اُجلے اُجلے دامن پر کبھی کوئی داغ دھبا نظر نہیں آیا۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ کلف کئے ہوئے کرتے، علی گڑھ کٹ پائجامے اور کالی جیکٹ میں ہی رہتے۔ جیکٹ کا کالا رنگ دودھیا لباس کو مزید دودھیا کر دیتا۔ یہ لباس ان کے کسرتی بدن پر خوب پھبتا غرض ان کی خوش پوشا کی اور جامہ زیبی میں بڑا گہرا ربط تھا''۔ 8

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انور ظہیر خاں نے حلیے کے بیان تصویر کشی سے کام لیا، اور عجیب و نادر تشبیہات کے استعال سے اپنے اسلوب کو دلکش و دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے حلیہ نگاری کی خاصیت یہی ہے کہ شخصیت کی تصویر نظروں میں گھوم جاتی ہے۔

انور ظہیر خاں موضوع خاکہ کی عادات و اطوار سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مثلاً کتب بینی، چائے کی عادت، شراب نوشی، کتّے پالنے، مٹھّیاں کھانے کی عادت کا کا بیان بڑی تفصیل سے اپنے خاکوں میں کیا ہے۔ باقر مہدی کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ان کی اس شوق کی بناء پر مجروح سلطان پوری نے انھیں کتابوں کی بند الماری کہا تھا۔ اگر انھیں کچھ پوچھا جائے تو وہ اس کا جواب دس کتابوں کے حوالے سے بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی کتب بینی کی عادت کا لوگوں پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی

لوگوں کو بڑی پریشانی بھی ہوتی اور شرمندگی بھی، چنانچہ انور ظہیر ایک واقعہ کے حوالے سے ان کی کتب بینی کا ذکر مزاحیہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ ان کا مطالعہ چوکھی ہے۔ انھوں نے جتنا پڑھ رہا ہے اس کا عشر عشیر بھی ادب کو نہ دے سکے۔ وہ ایک سانس میں دس کتابوں کے حوالے دیتے ہیں اور ہر پانچ منٹ کے بعد سامنے والے کو آزمائش میں ڈالتے ہیں۔

''آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے''

اگر جواب ہاں میں ہوتا ہے تو پھر کسی دوسری کتاب کا نام لے کر پوچھ بیٹھے Have you gone through this book اس طرح سوالوں کا سلسلہ دراز ہوتا رہتا ہے آخر کار مخاطب سوالوں کے نرغے سے باہر نکلنے کے لیے گھبرا کر پڑھی ہوئی کتاب کے بارے میں بھی انکار کر بیٹھتا ہے۔ ان کھٹن لمحوں میں اس بچارے کی حالت بھیگی بلی کی سی ہوتی ہے اور باقر مہدی کی کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے جیسے وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے اور سزا انھیں مل رہی ہے''9

ندا فاضلی کو چائے پینے کی عادت تھی اور وہ بہانے بنا بنا کر چائے پیتے تھے ان کی چائے نوشی کا ذکر ایک دلچسپ واقعہ کے ذریعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''اتوار کو دن ہے، شام کا وقت ہے۔ ندا فاضلی اپنے فلیٹ میں تنہا ہیں اور کلیات قلی قطب شاہ کے مطالعے یں محو ہیں۔ مں پہنچتا ہوں'' بٹھا کے حال احوال پوچھنے کے بعد کہتے ہیں'' چائے پی جائے'' اور یہ کہہ کر سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا'' کیوں زحمت کرتے ہیں'' کہنے لگے، زحمت کی کیا بات ہے۔ آپ کے بہانے میں بھی پی لوں گا۔ ویسے شام ہو رہی ہے چائے کا وقت بھی ہے''

میں نے عرض کیا'' وقت جام کا بھی ہے''

مسکرائے اور پوچھا ''کیا آپ ڈرنک کرتے ہیں''۔

میں نے جواب دیا ''پان، بیری، سگریٹ، شراب غرض جتنی اچھی عادتیں ہیں میں نے اختیار نہیں کی ہیں۔ زور سے ہنسنے لگے اور کچن کا رخ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں گرما گرم بھر کپ چائے لیے برآمد ہوئے''۔10؎

ظ۔ انصاری کو مٹھائیاں بہت پسند تھیں۔ وہ کہیں بھی جاتے وہاں کی خاص خاص مٹھائیاں اپنے ساتھ ضرور لاتے تھے۔ وہ خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ ساتھ ہی میٹھائیوں پر لکچرز بھی دیتے تھے چنانچہ انور ظہیر خان ظ۔ انصاری کی اس پسند کا ذکر کرتے ہیں:

''مٹھائی کے حد درجہ شوقین تھے۔ جگہ جگہ جا کے مٹھائی کھاتے اور کھلاتے۔ کہیں باہر جاتے تو وہاں کی مشہور یا اپنی من بھاون مٹھائی ضرور لاتے اور لوگوں کو بہ اصرار کھلاتے۔ ساتھ ہی خاندانی حلوائیوں، مٹھائی کی قسموں، مختلف مقامات کی مٹھائیوں کی لذتوں پر لیکچر بھی دیتے جاتے۔ لیکچر اتنی دلجمعی، زبان کی شیرنی اور چٹخارے کے ساتھ دیتے کہ چاٹ نہ کھانے کے باوجود چاٹ کا بھی سارا مزہ آجاتا''۔11؎

مندرجہ بالا اقتباس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انور ظہیر خان نے شخصیتوں کی عادت و اطوار اور پسند ناپسند کا بیان بڑی دلکشی و پرلطف اسلوب کے ساتھ کیا ہے۔ کسی واقعہ کے ذریعہ ان کے شوق عادتوں کا بیان عمدہ منظر نگاری کے ذریعہ کیا ہے کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس مقام پر ہم خود موجود ہیں۔ یہی ان کے اسلوب کا کمال ہے۔

خاکے کے فنی لوازمات میں شخصیت کو خاص مقام حاصل ہے کیونکہ خاکے کا دار و مدار شخصیت کی تصویر کشی پر ہوتا ہے ہر فرد کی یہی انفرادیت ہوتی ہے اور اپنی الگ شناخت اور خصوصیات کی وجہ سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ندا فاضلی کی شخصیت کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ محتاجوں مصیبت میں رہنے والوں کے دکھ درد کو بانٹتے ہیں جن سے ان کا کوئی قریبی رشتہ نہ ہو۔ ان کی بھی مدد کرتے تھے۔ ان کی

ایسی صفت نے انور ظہیر کو متاثر کیا چنانچہ وہ ندا فاضلی کی شخصیت کی ان خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آج جب کہ ہمارے روز وشب منافقوں کے درمیان بسر ہو رہے ہیں۔ ہر فرد کو اپنے مفادات سے غرض ہے۔ یہ خلوص وفا یہ ایفائے دوستی، بند مٹھی کو مصیبت کے مارے کی جیب میں کھول دینا انسانیت نہیں تو اور کیا ہے۔ ندا فاضلی ان لوگوں میں سے ہیں جو محتاجوں، مصیبت کے ماروں ہم عصر فنکاروں کا دکھ درد بانٹ لیتے ہیں۔ جیسے کوئی قریبی عزیز اپنی بساط بھر، اپنی سی تدبیر اپنوں کے ساتھ کرتا ہے لیکن یہاں تو خون کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ البتہ تین رشتے ہوتے ہیں، انسانیت، فنکاری اور دوست داری کا رشتہ۔ ندا فاضلی یہ تینوں رشتے خوب نبھاتے ہیں۔۔۔۔ غرض ندا کی ہر نوا ہے، نوائے عاشقانہ اور ہر ادا ہے، ادائے دلبرانہ!''۔12

عزیز قیسی کو شعر سنانے کے لئے موقع اور فرمائش کی ضرورت ہوتی ہے وہ فرمائش کے بغیر شعر نہیں سناتے تھے۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عزیز قیسی نہ گلے باز تھے نہ مشاعرہ باز، وہ مخصوص نشستوں کے ادیبوں شاعروں کے جمگھٹے کے آدمی تھے، عوامی اسٹیج کے نہیں۔ انھیں عام شاعروں کی طرح کلام سنانے کا کچھ زیادہ ہوکا نہیں تھا۔ وقفہ دے دے کر نظمیں غزلیں کہتے اور بے موقع، بلا فرمائش نہیں سناتے تھے۔ آواز بوجھل تھی اور گلا بھی اندھا ہوا تھا کہ جیسے دل سے قیامت گزر گئی ہو گویا میؔر کے اس شعر کی تفسیر

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جاتا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا 13

باقر مہدی کی شخصیت ایسی تھی کہ اگر وہ کسی بھی شخص سے ناراض ہو جاتے تو پھر ان سے دوبارہ

کبھی نہیں ملتے تھے۔اوران کے لئے باقر مہدی کے گھر کے دوازے ہمیشہ کے لئے بند ہوجاتے تھے۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو سے انور ظہیر متعارف کرواتے ہی:

’’باقر مہدی جس سے خفا ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ان کے گھر کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔کبھی کچھ دنوں کے لیےکبھی ایک طویل عرصے کے لیےکبھی سدا کے لئے۔ان کی ناراضگی کا کچھ یوں ہوتا ہے۔

آج فلاں تاریخ ہے اب آپ دو مہینے بعد فلاں تاریخ کو ملیں گے۔

یا

آپ آج سے دو برس کے بعد تشریف لائے گا‘‘۔14؎

اختر الایمان کو مہمان نوازی کا شوق تھا۔وہ نہ صرف اچھے مہمان نواز تھے بلکہ نیک اورشریف انسان بھی تھے خاطر تواضع کے یہ عالم تھا کہ وہ مہمان کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ان کی شریف النفسی اوراخلاق کا ذکر کتنی عمدگی سے کیا ملاحظہ کیجئے:

’’ڈاکٹر ظ۔انصاری نے بتایا تھا کہ اختر الایمان کے یہاں بارہا کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔توے سے گرما گرم چپاتیاں دسترخوان پر پہنچتی رہیں گی۔آپ کے آگے سے ٹھنڈی چپاتیاں اٹھا کے خود رکھ لیں گے اورتوے سے اتری ہوئی گرم گرم چپاتیاں آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔۔۔۔اخلاق کے شکار آدمی کا یہی وتیرہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ اپنی جان پرجھیل جاتا ہے کہ سامنے والے کو ہر طرح کی خوشی اورراحت ملے‘‘۔15؎

انور ظہیر کو واقعہ نگاری اور منظر نگاری میں کمال حاصل تھا وہ جس واقعہ کا بیان کرتے ہیں اس کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ سارا نظروں کے آگے آجاتا ہے۔انھوں نے اپنے خاکوں میں منظر نگاری کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔انھوں نے باقر مہدی سے پہلی ملاقات کے وقت کے واقعہ کا بیان، منظر کشی کے ذریعہ کیا ہے۔مثلاً لکھتے ہیں:

''دھوپ اپنا سنہرا، ملائم اور مہین آنچل، سمیٹ رہی تھی، شام کا چہرہ لمحہ لمحہ کجلا رہا تھا۔ شہر شام کی دہلیز سے گزر کر رات کی گداز بانہوں میں سما جانے کے لیے ہمک رہا تھا۔ آؤٹرس کلب (باندرہ) سے ڈانڈہ (کھار) تک بل کھائے۔ کبھی چہکتے، کبھی تھکے تھکائے کارٹر روڈ کے کنارے کنارے دور تک پھیلے سمندر کی بے قرار موجیں ساحل کو توڑ دینے یا ڈبو دینے کے جنوں میں سر پھوڑ رہی تھیں ۔میرے اندر کی دنیا میں بھی ایک طوفان برپا تھا''۔16

ظ۔ انصاری کے کمرے اور ان کے بیٹھنے کے منظر کو عمدہ تشبیہات کے ذریعہ سے یوں بیان کرتے ہیں:

'' گائے کے گھی جیسے دن پر شفق کا رنگ حاوی ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری یونیورسٹی کلب ہاؤس کی دوسری منزل پر اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ٹیبل پر کہنیاں ٹکی ہوئی ہیں۔ چہرہ ہاتھوں کے کٹورے میں دھرا ہوا ہے، ہونٹوں کے بیچ سگریٹ پھنسی ہوئی ہے۔ جس سے اٹھتی دھویں کی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیر ایک بالشت بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور کبھی یہی دھواں ان کے ہندروسی نقوش کے گرد پھیل کر حسن بزرگی، رعب، علم اور آگہی کا ملا جلا ایک عجیب خوشگوار سا تاثر پیدا کر رہا ہے۔ سامنے میز پر پلیٹو کی 'ریپبلک' (Republic) رکھی ہے اور نگاہیں اس پر جمی ہوئی ہیں میری آنکھوں میں ان کی علمی مدہوشی کے ایسے نہ جانے کتنے منظر بے ہوئے ہیں''۔17

باقر مہدی کا مکان ہوادار اور کشادہ کمرے کی دیواریں اونچی اور میلی تھیں، ان کے کمرے میں ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے مکان کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بات ان دنوں کی ہے جب باقر مہدی صاحب لولین مجگاؤں (بمبئی) میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے توسط سے سیدنا طاہر سیف الدین کی نوازشوں کے

سائبان تلے رہتے تھے۔ سیڑھیاں چڑھیں تو سامنے باقر مہدی کا پرانا دھرانا، اونچی اونچی، میلی میلی دیواروں والا مکان تھا۔ کشادہ اور ہوادار، کواڑ کے پٹ چور کے کھٹکے سے بے نیازانہ کھلے تھے۔ ذرا اوٹ ہو کر جھاڑی کرنے لگا۔ زمین سے آسمان تک کتابیں ہی کتابیں نظر پڑیں اور نہ نظر آئے تو صاحب خانہ'' 18؎

انور ظہیر خان نے اپنے خاکوں میں شخصیتوں کو ویسے ہی دکھانے کی کوشش کی جسے وہ حقیقت میں ہے یعنی شخصیت کی عکاسی میں غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ ان کی خوبیوں کے پہلو بہ پہلو، ان خامیوں اور کمزوریوں کا ذکر بھی کیا ہے، مثلاً ظ۔ انصاری کی شخصیت میں کفایت شعاری تھی۔ ان کی مد سے بڑی ہوئی کفایت شعاری سے کنجوسی کا دھوکا بھی ہو جاتا تھا۔ لہٰذا ان کی اسی کمزوری کا ذکر وہ غیر جانبداری سے کرتے ہیں مثلاً لکھتے ہیں:

''ظ۔ انصاری بلا کے کفایت شعار تھے۔ ظاہر ہے جب کفایت شعاری بلا کی ہو تو کبھی کبھی بخیلی میں بدل جاتی ہے۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی کفایت شعاری پر کنجوسی کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ خرچیلے نہ تھے۔ پر کم خرچ بھی نہ تھے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ مہینے کے آخری دنوں میں جیب ان کا ساتھ نہیں دے پاتی تھی۔ لہٰذا ادھار لینے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن بینک میں جمع شدہ رقم میں سے کچھ نکالنا اس وقت تک ضروری نہیں سمجھتے تھے جب تک کوئی بڑا اہم اور ضروری کام نہ پڑے''۔ 19؎

حسن نعیم انا پسند شخصیت کے حامل تھے۔ اگر کوئی ان کی انا کو ٹھیس پہنچاتا تو پھر وہ اس کی عزت اتار دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے ان کی انانیت اور تکبر کی اس خاصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انور ظہیر لکھتے ہیں:

''وہ ہمیشہ انا کے اونچے ٹیلے پر بیٹھے رہتے۔ جو انھیں اس بلندی سے نیچے لانا چاہتا اس کے کپڑے اتارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے پھر اس سے بھی اونچے

ٹیلے پر جا کھڑے ہوتے اور جرنیلی قسم کی گالی دے کر کہتے ،اب وہ احمق ،مطلق ،مجھ سے تو کیا کسی سے کبھی نہیں بھڑے گا۔انھیں اس بات کا غرّہ تھا کہ وہ ادب ، مذہب سیاست،سماج،غرض ہر موضوع پر بول سکتے ہیں''۔20ے

اس اقتباس سے حسن نعیم کی شخصیت کی اس کمزوری سے بھرپور واقفیت ہوتی ہے۔انھوں نے ندا فاضلی کی کمزوریوں کو بھی غیر جانبداری سے پیش کر دیا ہے مثلاً ندا فاضلی کو مشاعروں کی لت تھی ، یہ اتنی زیادہ تھی کہ وہ جہاں بھی جاتے وہاں پر اپنے ہو یا دوسروں کے اشعار سنا کر داد لیتے تھے لہٰذا ان کی اس کمزوری کا بیان ودلکش ودلچسپ اندار میں یوں کرتے ہیں:

''مشاعرے سے کسی لت یا علت کی طرح ان کی ذات سے چپک کر رہ گئے ہیں۔وہ کہیں بھی ہوں گھر میں۔سفر میں کسی کے دفتر میں، بزم میں یا بازار میں، اپنے بس میں نہیں رہتے۔کبھی اپنی عادت سے کبھی سامنے والے کے اصرار سے شعر سنانے پر اپنے آپ کو بس پاتے ہیں۔پھر شعر اپنے ہوں۔اپنوں کے ہوں یا غیروں کے بے تحاشہ سناتے اور داد لیتے ہیں۔طرّہ یہ کہ بیداد کو بھی داد سمجھ کر وصول کرتے ہیں کسی مشاعرے میں ان کے کلام پر داد کے ڈونگرے نہیں برستے تو وہ سامعین کو مخاطب کر کے اعلان کر بیٹھتے ہیں۔حضرات! میں قبرستان میں اذان دینے نہیں آیا ہوں۔ پاکستانی شاعر و ناقد سلیم احمد مرحوم کے شعر سے مستعار لئے گئے۔اس خیال اور ان لفظوں پر ہال ہو یا پنڈال قہقہ زار بن جاتا ہے۔اس بھڑکتے اور پر اثر جملے کے بعد بھی اگر داد نہیں ملتی تو سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر داد حاصل کر لیتے ہیں۔ظاہر ہے یہ وصف ہے جو معمولی دل گردے والے کا کام نہیں''۔21ے

مندرجہ بالا تمام اقتباسات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیتوں کے بیان میں غیر جانبداری کو ملحوظ رکھا ہے ان کا خود کا کہنا ہے کہ انھوں نے خاکے میں اس

بات پر خاص توجہ دی ہے کہ خاکہ خاکہ ہی رہے۔قصیدہ یا ہجو نہ بن جائے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے کہ خاکہ خاکہ ہی رہے۔ قصیدہ یا ہجو نہ بن جائے۔ یہاں مجھے سوچ بچار کے صحرا اور آزمائش کے پل صراط سے گزرنا پڑتا کہ لوگ باگ یہ نہ سمجھ بیٹھں کہ ان بڑوں کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے دیتے ان کے گریبان کی خیریت خراب کر کے اپنا قد اونچا کرنا چاہا ہے۔ یقین مانیے میرا اردہ بس یہ تھا کہ خاکے کے چوکھٹے میں شخصیت اپنے وجود اور سایے کے ساتھ آئینہ ہوجائے''۔22؎

غرض ان کے اس اعتراف سے بخوبی علم ہوتا ہے کہ انھوں نے خاکہ نگاری کے لوازمات کا بھرپور استعمال کیا ہے اور غیر جانبداری سے شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں پر نگاہ رکھی ہے اور بڑی ایمانداری وحقیقیت پسندی ہے جوں کا توں پیش کردیا۔انور ظہیر خان نے اپنے خاکوں کے اسلوب کو دلچسپ اور پرلطف بنانے کے لئے تشبیہات واستعارات کا سہارا بھی لیا ہے۔ان کی نثر پرلطف اور شگفتہ ہے جس کی وجہ سے ان کے خاکے اور بھی دلچسپ ہوگئے۔انھوں نے رعایت لفظی سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً ندافاضلی کے نام کی رعایت ہے۔کس طرح کے معنی ومفہوم پیدا کئے ملاحظہ کیجیے:

''ندافاضلی ان دونوں میں ندا ہی سب کچھ ہے اور یہی تخلص ہے۔ فاضلی تو فاضل ہے۔ واقعہ یہ ے کہ ندا کو فاضلی سے کوئی فیض پہنچا اور نہ ہی فاضلی کو ندا سے ہوئی فائدہ۔ جس طرح دنیا میں بہت سی انمول، بے فیض اور فاضل چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ فاضل بھی بے جوڑ ہے۔ اکثر میاں بیوی کے مانند، بے فائدہ ہے۔ سدا کی کڑک مرغی کی طرح اور فاضل بے بانجھ گائے سمان۔ بے جوڑ بیوی، کھڑک مرغی اور بانجھ گائے سے کبھی کبھی حاصل ہو ہی جاتا ہے مگر یہاں تو حاصل صفر ہے اور اس لاحاصل کا ندافاضلی کی ذات سے کیا تعلق؟ جوجھیں اگر بوجھیں تو ہمیں بھی بتائیں''۔23؎

حسن نعیم آزاد پسند انسان تھے اور وہ اپنی آزادی پر پابندی لگا نہیں سکے۔ یہاں بھی لفظ تبدیلی کا استعمال طرح طرح سے کرکے ان کی طبیعت اور شخصیت کی عکاسی کی کوشش کی گئی ہے:

''جب وہ امریکہ سے سعودی عربیہ پہنچے تو وہاں بھی اپنی آزادی پر پابندی نہیں لگا سکے۔ کبھی کبھی جوش اور جولانی میں سفارتی ضابطوں کے سارے بندھن توڑ کر بچھڑے کی طرح قلانچیں بھرنے لگتے۔ دفتر نے پہلے سفارتی اصول یاد دلا کر رویے میں تبدیلی کا انتظار کیا، پھر کڑی نگرانی کی، آنکھیں ان کا تعاقب کرنے لگیں۔ مگر نہ بدلنا نہ بدلے۔ ظاہر ہے جس آدمی کے خمیر میں بدلاؤ نام کا کوئی عنصر ہی نہ ہو تو وہ بہتیرے جتن بھی کرے تو اپنے آپ کو نہیں بدل سکتا، اور نہ ہی زمانے کی الٹ پھیرا سے بدل سکتی ہے''۔ 24؎

انور ظہیر خان اپنے خاکوں کے اسلوب کو لطیفوں کے زریعہ بھی پرلطف اور جاندار بنانے کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً سردار جعفری کی شگفتہ مزاجی کو ایک واقعہ کے ذریعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''بات ان دنوں کی ہے جب کیفی صاحب (اعظمی) پر نالج کا حملہ ہو چکا تھا اور وہ چھڑی کے بغیر چلنے پھرنے سے معذور تھے اور ایک ایکسی ڈنٹ میں شاعر اور صحافی انجم رومانی صاحب کے پیر کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی تھی چنانچہ وہ بھی ایک بیساکھی کے سہارے چل رہے تھے۔ ایک دن مشاعرہ لوٹ کر ڈاکٹر ساغر اعظمی پان چباتے، لمبی لمبی سانسیں لیتے انجم صاحب کے دفتر آ پہنچے اور کہنے لگے ''انجم صاحب یہ بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹ کر رکھ دیجئے اور چلیے میرے ساتھ، نیچے کار میں کیفی صاحب آپ کے منتظر ہیں''۔ وہ پہنچے تو انھوں نے فرمایا ''بھائی انجم بس بیٹھ جایئے۔ جعفری صاحب کے یہاں چلنا ہے''۔ جب یہ صاحبان ان کے دروازے پر پہنچے تو ساغر عظمی نے دستک دی۔ جعفری صاحب نے دروازہ کھولتے ہی جو تین آدمیوں میں سے دو کو لنگڑا لولا دیکھا تو ہنستے ہوئے

بولے کہ بھائیوں شاید آپ حضرات غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ سردار جعفری کا
فلیٹ ہے۔کوئی Orthopedic Centre نہیں اور اس کے بعد میر حسن
کی زبان میں یہ ہوا
ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے''۔ 25؎

انور ظہیر خاں کہیں کہیں ڈرامائی انداز میں واقعہ کی تصویر کشی کرتے ہیں۔مثلاً ظ انصاری کی شخصیت کی عکاسی کرتے وقت وہ ان کے ساتھ پیش آئے لطیفے کا ذکر مکالماتی انداز میں یوں پیش کرتے ہیں کہ سارا واقعہ نظروں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''وہ اپنے کیبن میں براجمان تھے بلکہ بڑے ریلیکس (Relax) موڈ میں
تھے۔چائے والا چائے لے کر آیا تو اس سے پوچھا۔
''کیوں میاں اڈی ٹوریل پڑھا''
وہ بچارہ جواب نہیں دیتا تو، کچھ ڈرا ڈرا سا سوالیہ نگاہوں سے کبھی انھیں اور
کبھی مجھے تکے جا رہا ہے۔پھر سوال کرتے ہیں۔
''ارے میاں ہم پوچھتے ہیں ہمارا آج کا اڈی ٹوریل پڑھا''
وہ اپنے ہواس مجتمع کر کے جواب دیتا ہے۔
''ہم کا جانی ہڈی ٹھوریل کا ہوت ہے''۔
کیوں تم پڑھنا نہیں جانتے۔
صاحب پڑھتے ہوئت تو کاہے چھپا کری دوکنیہ ماں نوکری کرت۔
ہم ہو سسر کوئی جگہیہ کونو اسین کر سب بیٹھے ہوئت،
یہ جواب سنتے ہی چونکے اور سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے بدبدانے
لگے:''اوہ بیرے بھی خوش پوشاک ہونے لگے''۔ 26؎

سردار جعفری اور ترقی پسند تحریک دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے

ہیں کیوں کہ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی کا ذکر پرلطف اسلوب کے ذریعہ کیا ہے مثلاً لکھتے ہیں

''سردار جعفری ایک عالی اور غالی ترقی پسند ہیں۔کبھی کبھی یہ تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ سردار جعفری ترقی پسند تحریک ہیں یا ترقی پسند تحریک سردار جعفری...... سچ تو یہ ہے کہ اس تحریک کے سلسلے میں سب سے زیادہ نام سردار جعفری کا اچھالا یا اچھالا گیا۔یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ جس طرح چاندنی کے بغیر تاج محل کی خوب صورتی پھیکی ہے اسی طرح ترقی پسند تحریک بہت کچھ ہوتے ہوئے موصوف کے بغیر نامکمل سی لگتی ہے۔اگر ان کی ذات سے اسے منہا کردو تو یہ بھی ادھورے سے معلوم پڑتے ہیں''۔27؎

اس اقتباس میں صنعت تجنیس اور صنعت عکس کا استعمال بڑی عمدگی سے ملتا ہے۔تاج محل کی خوبصورتی چاندنی رات کی وجہ سے دوگنی ہوجاتی ہے اسی لیے اس کی مناسبت سے ان کی شخصیت اور ترقی پسند تحریک کو تاج محل اور چاندنی رات سے تشبیہہ دی ہے۔اسی طرح ظ۔انصاری کے خاکے میں محاورے کا بڑا عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

کسی پروسیشن، کسی جلوس کی قیادت کبھی نہیں، جیل کی ہوا جی جان کو راس نہ آئی تھی۔حالانکہ کئی بار جیل جاچکے تھے لیکن جلسوں، کانفرنسوں، سمیناروں اور مشاعروں میں نظامت، خطابت، صدارت اور سرپرستی اپنا حق سمجھتے تھے۔جب تک جئے اپنے سے بہتر کسی کو نہیں جانا، اور نہ جلدی کسی کی دال ہی گلنے دی بلکہ اس میدان کے کھلاڑیوں کے سینے پر ہمشیہ مونگ دلنے کی کوشش کی''۔28؎

مندرجہ بالا تمام اقتباسات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انور ظہیر خان نے اپنے خاکوں میں خاکہ نگاری کی تمام خصوصیات کا بدرجہ اتم استعمال کیا ہے۔غیر جانبداری ان کے خاکوں کا خاص وصف ہے۔کسی شخصیت کی خوبیوں کے پہلو بہ پہلو اس کی خامیوں کی عکاسی میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔اپنے سے بڑوں کو احترام کرنے کے عقیدت پسندی کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ جو شخص جیسا ہے

اسے اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ واقعات نگاری اور منظر نگاری میں وہ کمال رکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتہ بیانی اور لطافت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اپنے اسلوب کو دلکش بنانے کے لیے کہیں اشعار، نادر تشبیہات، استعارات اور مزاحیہ صنعتوں کا بھی استعمال کرتے ہیں کہیں لطافت کے ذریعہ بھی شخصیات سے متعلق واقعات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔

☆☆☆

حواشی

1۔ مدح وقدح کے درمیان، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانور، انور ظہیر خان، لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی، 1996، ص:11

2۔ زندگی کی کشتی اور ندا فاضلی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:152

3۔ زمین اور ضمیر کے شاعر اختر الایمان، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:91

4۔ پھینک پھر جذبہ بے تاب کی عالم پہ کمند۔ سردار جعفری، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:54

5۔ حد یقین سے حد گماں تک۔ عزیز قیسی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:144

6۔ کتابیں، قہقہے اور باقر مہدی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:107

7۔ زندگی کی کشتی اور ندا فاضلی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:154

8۔ زمین اور ضمیر کے شاعر۔ اختر الایمان، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:91

9۔ کتابیں قہقہے اور باقر مہدی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:120

10۔ زندگی کی کشتی اور ندا فاضلی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:162

11۔ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:28

12۔ زندگی کی کشتی اور ندا فاضلی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:171

13۔ حد یقین سے حد گماں تک۔ عزیز قیسی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:143

14۔ کتابیں قہقہے اور باقر مہدی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:109

15۔ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو، ص:98

16۔ کتابیں قہقہے اور باقر مہدی، مشمولہ، مت سہیل ہمیں جانو،ص:113
17۔طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ۔ڈاکٹر ظ۔انصاری، مشمولہ،مت سہیل ہمیں جانو،ص:28
18۔ کتابیں قہقہے اور باقر مہدی، مشمولہ،مت سہیل ہمیں جانو،ص:102
19۔طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ۔ڈاکٹر ظ۔انصاری، مشمولہ،مت سہیل ہمیں جانو،ص:26
20۔لامرکزیت کے شکار۔حسن نعیم،مشمولہ،مت سہیل ہمیں جانو،ص:133
21۔زندگی کی کشتی اور ندا فاضلی ،مشمولہ،مت سہیل،ہمیں جانو،ص:183
22۔مدح وقدح کے درمیان، مشمولہ مت سہیل ہمیں جانو،ص:13
23۔زندگی کی کشتی اور ندا فاضلی ،مشمولہ،مت سہیل ہمیں جانو،ص:155
24۔لامرکزیت کے شکار۔حسن نعیم،مشمولہ،مت سہیل ہمیں جانو۔ص:126
25۔پھینک پھر جذبہ بے تاب کی عالم پہ کمند۔سردار جعفری،مشمولہ،مت سہل ہمیں جانو،ص:64
26۔طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ۔ڈاکٹر ظ۔انصاری، مشمولہ،مت سہل ہمیں جانو،ص:38
27۔پھینک پھر جذبہ بے تاب کی عالم پہ کمند۔سردار جعفری،مشمولہ،مت سہل جانوں،ص:55
28۔طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ۔ڈاکٹر ظ۔انصاری، مشمولہ،مت سہل ہمیں جانو،ص:35

☆☆☆

مشفق خواجہ

آزادی کے بعد ابھرنے والی مزاحیہ کالم نگاروں میں مشفق خواجہ کو اہمیت حاصل ہے۔ مشفق خواجہ نے اردو کی ادبی کتابیں اور اردو کے شاعر و ادیب کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ ہفت روزہ 'تکبیر' میں ''خامہ بگوش'' کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ اس اخبار میں شائع ونے والے مضامین کو اٹھا کر کے مظفر علی سید نے ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کے عنوان شائع کیا۔

شفیق خواجہ کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی کتابیں اور ان کے مصنفین کو طنز کا نشانہ بنایا۔ وہ جس پر بھی اپنا قلم اٹھاتے تو، اس ہنرمندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہ جوان کے طنز کا شکار ہوتا ہے، وہ بھی زیرلب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادبی کالم نگاری میں مشفق خواجہ ایک نئے طرز کے موجد ہیں چنانچہ ان کے اسلوب کے بارے میں نامی انصاری لکھتے ہیں:

> ان کے طنز کا نشانہ اردو کی کتابیں اور ان کے مصنفین ہوتے ہیں وہ جس کتاب پر اپنا زورقلم آزماتے ہیں، اس کا نیا پانچہ کر دیتے ہیں لیکن اس ہنرمندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہ جوان کے طنز کا شکار ہوتا ہے وہ بھی زیرلب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادبی کالم نگاری میں مشفق خواجہ ایک نئے طرز کے موجد ہیں جس کو ''ہجو ملیح'' کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے''۔1

مشفق خواجہ نے خامہ بگوش کے قلمی نام سے ادبی کالم لکنے کے سلسلہ کو 1997ء سے ہمیشہ کے لئے خیرآباد کہہ دیا تھا۔ وہ طنز نگار کے ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق اور خاکہ نگار بھی ہیں۔

مشفق خواجہ نے ابن انشا کا خاکہ ''رسالہ در معرفت ابن انشا'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ اس خاکے کو لکھنے کا سبب وتالیف وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک گمنام ادیب کو دنیا سے متعارف کروانا ہے اس خاکے کے لئے انھوں نے مواد تذکروں، کتابوں کی مدد سے حاصل کیا ہے۔اس خاکے میں انھوں نے ان کے نام کے تعلق سے بھی بحث کیا ہے۔اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ابن انشا ان کا اصلی نام ہے۔اس بات کی تردید انھوں نے خود کی ہے۔کہ ''انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہمارے اصلی نام میں ایک چوپائے کا نام آتا ہے،اس لیے ہم نے اصلی نام ترک کرکے ''ابن انشاء'' اختیار کیا۔

ابن انشا کے اصلی وطن کا بھی ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اور انھوں نے کئی ماخذوں کی چھان بین کرکے اور ان کے ساتھ رہنے والے بزرگوں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر پنجاب کے ہیں مگر جب وہ لکھتے ہیں تو لکھنو اور دہلی والے معلوم ہوتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ابن انشا بنیادی طور پر رہنے والے تو پنجاب کے تھے لیکن لکھنے والے پنجاب سے باہر کے تھے۔یعنی ہر بات اگر یوں کہی جائے تو زیادہ مناسب ہوگی کہ موصوف جب بولتے تھے تو پنجابی معلوم ہوتے تھے لیکن جب لکھتے تھے تو لکھنو اور دہلی والوں کے بھی کان کاٹتے تھے''۔2

اس خاکے میں مشفق خواجہ نے ابن انشا کے حالات زندگی کو الگ الگ عنوان دے کر لکھا ہے۔اس میں ان کی تصانیف ان کے سفر وسیاحت،اور معارین کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور خاتمہ کے عنوان سے خاکے کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

اس خاکے کے جائزہ کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ خاکہ کم اور سوانح عمری زیادہ ہے۔کیوں کہ اس میں ادیب کے حالات زندگی کو عنوانات دے کر بیان کیا گیا ہے۔اس میں ادیبوں کی شخصیت کے بارے میں زیادہ نہیں ہے۔صرف ان کی تصانیف اور ہم عمر ادیبوں کے متعلق زیادہ

بیان کیا گیا ہے۔اس لئے یہ خاکہ خاکہ نگاری کے فن پر پوری طرح نہیں اترتا۔

☆☆☆

حواشی

1۔ بیسویں صدی میں طنز و مزاح، نامی انصاری، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی 2002ء، ص:19

2۔ رسالہ در معرفت ابن انشا، مشمولہ اردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد سوم، کاک آفسٹ پرنٹرس، دہلی، 2007، ص:909

☆☆☆

باب پنجم

مجموعی جائزہ

مجموعی جائزہ

خاکہ نگاری اردو ادب کی منفرد صنف کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اردو کی نثری اصناف میں داستان، ناول، افسانہ اور انشائیہ کی طرح خاکہ بھی ایک جداگانہ، منفرد اور مقبول صنف ہے۔ خاکہ کو انگریزی میں اسکیچ کہتے ہیں۔ اس کے لغوی معنی کچہ نقشہ، ڈھانچہ، چربہ اور حدود وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاح میں خاکے سے مراد دراصل کسی شخص کی وہ لفظی تصویر ہے جس میں اس کی شکل و صورت کے ساتھ ساتھ اُس کے طرز زندگی عادات و اطوار، گفتگو، چال ڈھال رہن سہن، حلیہ، مزاج، پسند ناپسند وغیرہ کو مخصوص اسلوب کے ساتھ اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ قاری کے ذہن میں ایک شخص کی مکمل تصویر ابھر جاتی ہے، اور خاکے کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس شخص سے ہماری بھی ملاقات ہے۔ الیاس شوقی نے خاکے کی جامع تعریف کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''میرے خیال میں خاکہ نگاری کی آسان تعریف یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ کسی فرد کی ایسی قلمی تصویر جسے پڑھنے کے بعد ہم اس شخص سے یوں واقف ہوجاتے ہیں جیسے ہم اسے جانتے ہیں اور اگر کہیں دیکھ لیں تو اسے فوراً پہچان جاتیں خواہ اس سے پہلے ہم اس شخص سے کبھی نہ ملے ہوں''۔ 1

اردو ادب میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش داستانوں، تذکروں اور غالب کے خطوط وغیرہ میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی آب حیات تذکروں کی ترقی یافتہ شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اس میں خاکہ نگاری کے نقوش واضح طور پر نمودار ہوتے ہیں۔ خاکہ نگاروں کی صنف بہت قدیم تو نہیں ہے۔ لیکن اس مختصر سے عرصے میں اس نے ایک مکمل صنف کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مگر اس کے لئے مستقل

طور پر کوئی اصول وضوابط مقرر نہیں ہیں۔

'آب حیات' کو تذکروں کی ترقی یافتہ شکل کہا جاتا ہے مگر باقاعدہ خاکہ نگاری کا آغاز ''مرزا فرحت اللہ بیگ'' کے ہاتھوں ہوا۔فرحت اللہ بیگ بنیادی طور پر ایک مزاح نگار تھے۔ان کے دو خاکے منظر عام پر آچکے ہیں وہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اور دوسرا خاکہ ''وحیدالدین سلیم'' ہے۔ یہ خاکے انھوں نے ان بزرگوں کی وفات کے بعد لکھے ہیں مگر ان بزرگوں کی زندگیوں کے مضحک پہلوؤں کو ابھارنے میں کوئی تکلف نہیں برتا۔انھوں نے مولوی نذیر احمد کی شخصیت سے متعلق مختلف پہلوؤں کو مزاحیہ انداز میں یوں بیان کر دیا ہے کہ خود نذیر احمد کو ان کی بات بری نہ لگے۔ یہی ان کی خاکہ نگاری کا کمال ہے۔ان کے دونوں خاکے ان کے اسلوب نگاری کی عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ان کا خاص وصف یہ ہے کہ موضوع خاکہ کی کمزوریوں کے بیان میں بھی بے باکی اور صاف گوئی کے باوجود ایک ہمدردانہ لہر موجود رہتی ہے، اور ان کے خاکوں میں خاکہ نگاری کے تمام لوازمات کو باقاعدگی سے برتا گیا ہے۔اس مطالعے ک بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو ادب میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بھی مزاح نگار کے ہاتھوں ہوا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے بھی خاکے تصنیف کئے ہیں۔انھوں نے اپنے خاکوں کے موضوع کے طور پر انسانوں کے ساتھ ساتھ حیوانات، نباتات اور مظاہر قدرت کو بھی موضوع بنا کر خاکے لکھے ہیں۔ انھوں نے کائنات کے چھوٹی بڑی ہر چیز کو اپنا موضوع بنایا ہے جیسا کہ گھاس کے تنکے، دیا سلائی، مکھی، مچھر اور اُلّو وغیرہ ہیں۔ حالانکہ یہ ان کے انشائیوں میں شمار ہوتے ہیں، لیکن اکثر محققین نے انھیں خاکے میں بھی شمار کیا ہے۔ان کے خاکوں میں مسٹر آصف علی اور بیگم آصف علی کے خاکے بھی ملتے ہیں۔ ان خاکوں میں ان کا حلیہ، تقریر کا انداز اور شخصیت کے بیان میں مزاح سے کام لیا گیا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد جن مزاح نگاروں نے خاکہ نگاری میں اپنا کمال دکھایا ہے وہ

رشید احمد صدیقی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا شمار اردو کے مشہور و مقبول مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مزاح نگاری کے علاوہ خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے خاکوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''وہ گنج ہائے گراں مایہ'' (1942)، ہم نفسان رفتہ (1966) اور ''ذاکر صاحب'' ہیں۔ ان کے خاکوں میں خاکہ نگاری کی تمام اہم خصوصیات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے خاکوں میں ایک بات سب سے زیادہ دکھائی دیتی ہے وہ ان کی علی گڑھ سے عشق ہے۔ انھوں نے زیادہ تر خاکے علی گڑھ سے تعلق رکھنے والوں کے لکھے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں ممدوح کی شخصی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں اپنی صلاحیت کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ ان کے کارناموں اور سیرت اور کردار پر بھرپور روشنی ڈالے ہیں۔ ان کے خاکوں میں مزاح کا عنصر کم دیکھنے کو ملتا ہے، چنانچہ نامی انصاری لکھتے ہیں:

> ''رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں سیرت نگاری زیادہ اور مزاح کا عنصر کم ہے۔ وہ اپنے ممدوح کی شخصی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں''۔ 2ے

رشید احمد صدیقی کے خاکوں کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے جہاں پر ہندوستان کے صدر جمہوریہ ہند ذاکر صاحب کا خاکہ لکھا ہے۔ وہیں اپنے کالج کے چپراسی کندن کا بھی خاکہ لکھا ہے۔

شوکت تھانوی کا شمار بھی اردو کے اہم مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ ''شیش محل'' اور ''قاعدہ بے قاعدہ'' ہیں۔ یہ تاثراتی قسم کے خاکے ہیں۔ ان کے خاکوں کی پہلی خصوصیت اختصار ہے کیونکہ ان کے زیادہ تر خاکے صفحہ، آدھا صفحہ پر مشتمل ہیں اور حد تک یہ ہے کہ انھوں نے ایک جملے میں بھی خاکے لکھے ہیں ان کے خاکوں کا ایک اہم پہلو ان کا اسلوب ہے۔ ان کا انوکھا اسلوب اور مزاح کی چاشنی نے ان کے خاکوں کو اور دلچسپ بنا دی ہے۔ اس کے علاوہ طنزیہ انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔ شخصیت کے بیان میں شگفتگی کے پردے پر طنز نگاری سے بھی کام لیتے ہیں، لیکن اس میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے ان کے یہاں اسلوب کا ایک خاص

اندازاوراپنے اس اندازتحریر کے ذریعہ سے انھوں نے اپنے خاکوں میں جان ڈال دی ہے۔

اشرف صبوحی کے خاکوں کا مجموعہ'' دلی کی چند عجیب ہستیاں'' ہیں۔اس مجموعے میں انھوں نے ایسی شخصیات کا ذکر کیا ہے، جن کے ذریعہ سے دہلوی تہذیب کی جیتے جاگتے تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے عمدہ خاکوں میں'' گھی کبابی'' اور'' مٹھو بھٹیارہ'' اہم ہیں۔جس کے ذریعے دلی کی اس عہد کی تہذیب اور تمدن کی بھر پور عکاسی ہوتی ہے خصوصاً اس وقت کے لذیذ کھانوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ان خاکوں کی مقبولیت ان کے منفرد اسلوب کی وجہ ہے۔

شاہد احمد دہلوی اردو کے پہلے ناول نگار، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے پوتے ہیں۔ان کے خاکوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔مثلاً'' گنجینۂ گوہر'' اور'' بزم خوش نفساں''۔انھوں نے اپنے خاکوں میں شامل شخصیات کو نہایت شگفتہ اور دلچسپ انداز میں اس طرح عکاسی کی ہے کہ ان کی دل کش اور پُر لطف اسلوب کی وجہ سے ان شخصیات سے نہ صرف بھر پور تعارف ہوتا ہے بلکہ دلی کی ٹکسالی زبان کی شگفتگی اور لطافت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ان کے خاکوں کے دوسرے مجموعے کے مقابلے میں پہلے مجموعے میں شگفتگی کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنے خاکوں کو نادر و دلکش تشبیہات واستعارات کے استعمال سے حسین و پرلطف بنا کر پیش کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو کو ایک مشہور ومقبول افسانہ نگار کی حیثیت سے سب جانتے ہیں۔ جب کہ انھوں نے خاکے بھی تصنیف کئے ہیں۔ان کے خاکوں کے دو مجموعے شامل ہیں وہ'' گنجے فرشتے'' اور '' لاؤڈ اسپیکر'' ہیں۔انھوں نے سیاسی، ادبی، صحافتی اور فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے خاکے لکھے ہیں۔انھوں نے شخصیتوں کی خوبیوں کو غیر جانبدارانہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔انھوں نے یہ خاکے یوں ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ ان شخصیتوں سے اپنی دیرپا ملاقات اور قریبی تعلقات کی بناء پر قلم بند کئے ہیں۔ ان کا افسانوی انداز ان کے خاکوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے خاکوں کے تفصیلی جائزہ

کے بعد یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ان کی دیگر تصانیف سے بحث نہ کرتے ہوئے اگر ان کی خاکہ نگاری کا مطالعہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کی دھوم نے ان کی خاکہ نگاری کے جوہر کم کر دیتے ہیں۔ جبکہ ان کے خاکے اپنے اسلوب کی شگفتگی اور اپنی حقیقت پسندی کی وجہ سے اتنے عمدہ ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر منٹو خاکوں کے علاوہ کچھ اور نہ لکھتے تو بھی وہ اپنی خاکہ نگاری کی بناء پر اردو ادب میں اپنا خاص مقام بنالیتے۔

فکر تونسوی کے خاکوں کا اکلوتا مجموعہ ''خدوخال'' ہے۔ ان میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ چنانچہ صابرہ سعید لکھتی ہیں:

''فکر تونسوی کے خاکوں میں طنز ومزاح کا امتزاج ملتا ہے۔ بلکہ طنز کا پیرایہ زیادہ حاوی نظر آتا ہے''۔ 3

سید ضمیر جعفری نے بھی خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''اڑتے خاکے'' ہیں۔ انھوں نے انسانوں کے بجائے مختلف رویوں اور مختلف معاشرتی کرداروں کے خاکے لکھے ہیں۔ اس مقالے میں ان کا لکھا ہوا چراغ حسن حسرت کا خاکہ بھی شامل ہے۔ اس کا عنوان ''سنگاپور کا میجر حسرت'' ہے۔ اس خاکے میں ان کی عادات واطوار اور سیرت و کردار کا بیان بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔

یوسف ناظم نے خاکوں کے دو مجموعے ''سائے ہمسائے'' اور ''ذکر خیر'' کے عنوان سے تصنیف کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیت سے زیادہ خدوخال پر توجہ صرف کی ہے۔ ان خاکوں کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں موضوع خاکہ سے متعلق ایک واضح تصویر بن جاتی ہے۔ ان کے مجموعہ ''ذکر خیر'' میں شامل خاکہ ظ۔ انصاری کو ناقدین نے سب سے اچھا خاکہ مانا ہے۔

شفیق الرحمٰن قدوائی کے خاکوں کا مجموعہ ''دریچے'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے میں فکر تونسوی، ضمیر جعفری اور ابن انشاء کے خاکے عمدہ ہیں۔ اس میں ایک مضمون

استفسار و جوابات کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس میں رسائل و اخبارات میں چھپنے والے سوالات و جوابات کی بڑی عمدہ پیروڈی پیش کی گئی ہے۔

آزادی کے بعد ابھرنے والے خاکہ نگاروں میں مجتبیٰ حسین کا نام سرفہرست ہے۔ خاکے لکھنے کے متعلق اکثر ان کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ پہلے صاحب خاکہ کی شخصیت کے ایک نمایاں پہلو کو لے کر پھر اسی کی مناسبت سے شخصیت کی پرتیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کنھیا لال کپور کی قد کی لمبائی کو موضوع بنا کر خاکہ لکھا ہے اور اس کا عنوان ''لمبا آدمی'' رکھا ہے۔ ان کی ایک اور خاصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے شخصیت کے اعتبار سے عنوان دیا ہے اور ہر خاکے میں اس عنوان سے انصاف بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر اعجاز صدیقی کے لیے ''اردو کا آدمی''۔ کرشن چندر کے لیے ''آدمی ہی آدمی''، عمیق حنفی کے لیے ''آدمی در آدمی'' اور کنھیا لال کپور کے لیے ''لمبا آدمی'' وغیرہ۔ انھوں نے اپنے ان خاکوں کے مجموعہ کا نام بھی نظیر اکبرآبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' کے عنوان پر ہی رکھا ہے۔ غرض ان خاکوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تمام شخصیتوں سے اپنے قریبی اور دوستانہ تعلقات کی بناء پر خاکے لکھے ہیں۔ ان کے خاکوں کی کامیابی میں ان کا اسلوب اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انھوں نے شخصیتوں کے اوصاف و کردار کو بڑے دلچسپ انداز اور شگفتہ انداز میں نمایاں کر دیا ہے۔ ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے ان کو اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کے خاکوں کی مقبولیت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ کوئی تقریب ان کے خاکے بغیر پوری نہیں ہوتی تھی۔ اس کے متعلق خود مجتبیٰ حسین کا یہ خیال ہے کہ خاکہ نگاری اب ان کی مجبوری بن گئی ہے کیوں کہ کسی ادبی شخصیت کے متعلق کوئی تقریب بغیر ان کے خاکے کے نامکمل ہی سمجھی جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کے علاوہ جن مزاح نگاروں نے خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے ان میں عطا الحق قاسمی، انور ظہیر خان، تخلص بھوپالی، مشفق خواجہ اور پرویز اللہ مہدی وغیرہ ہیں۔ انھوں نے اپنے

خاکوں میں خاکہ نگاری کے تمام فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ اسلوب کا بھی خاص خیال رکھا ہے اور ان کی شگفتہ بیانی سے ان کے خاکوں کو چار چاند لگا دی ہے۔

اس مقالے میں صرف ان خاکہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جو مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ خاکہ نگار بھی ہیں۔اس بات کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ اردو ادب میں باقاعدہ خاکہ نگاری کا آغاز ایک مزاح نگار یعنی مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاتھوں ہوا ہے۔خاکہ نگاری کے متعلق یہ بات عام طور پر رائج ہے کہ خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کرنے والے تقریباً سبھی لوگوں نے اس صنف کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی اپنی منفرد شناخت بنا چکے ہیں۔ان میں زیادہ تر انشائیہ نگار اور مزاح نگار ہیں۔ان لوگوں نے اپنے خاکوں میں شگفتہ و پرلطف اسلوب کے باعث اپنی خاکہ نگاری میں بھی اپنی منفرد شناخت چھوڑی ہے۔بعض لوگ طنز و مزاح کو خاکہ کا لازمی جز مانتے ہیں لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے۔طنز و مزاح خاکہ نگاری کا لازمی جزو ہے کیوں کہ زیادہ تر مزاح نگاروں نے ہی اس صنف کی طرف توجہ کی ہے اس لیے ان کے خاکوں میں مزاح کا عنصر بھی شامل ہو گیا ہے لیکن طنز و مزاح کا ہونا خاکہ نگاری کے لیے ضروری نہیں ہے۔الیاس شوقی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> خاکہ نگاری کے تعلق سے ایک عام غلط فہمی یہ بھی ہے کہ طنز و مزاح اس کا ایک لازمی جزو ہے اور اس کے بغیر خاکہ نہیں بنتا۔ اس مفروضے کی بنیاد غالباً فرحت اللہ کا خاکہ ہے۔ چوں کہ خاکہ نگاری میں اولیت کا سہرا انھیں کے سر بندھتا ہے۔اس لیے ان کے اسلوب کو بھی خاکے کا ناگزیر حصہ مان لیا گیا جب کہ یہ درست نہیں ہے۔ چوں کہ زیادہ تر خاکے مزاح نگاروں نے لکھے ہیں، اس لیے بعض لکھنے والوں نے طنز و مزاح کو خاکے کا بنیادی وصف قرار دے دیا ہے جو قطعاً درست نہیں ہے۔ یقیناً مزاح سے تحریر میں ایک دل کشی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور قاری کو اس میں زیادہ لطف آتا ہے لیکن یہ وصف تو اسلوب کا ہے

اس کا حسن تو کالم نگاری اور بعض موضوعاتی مضامین بھی بجا طور پر نظر آتا ہے''۔4

مزاح نگاروں کے تحریر کردہ خاکوں کے اس تفصیلی جائزہ کے بعد اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس میدان میں مجتبیٰ حسین کے بعد اس پایہ کا مزاح بہت کم نظر آئے گا۔انھوں نے عمدہ اور بڑی تعداد میں خاکے لکھے ہیں۔ان کے خاکوں میں خاکہ نگاری کے لوازمات کے علاوہ اسلوب و بیان کا حسن اور طنز و مزاح کی خوبی بڑی عمدگی سے ملتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں ان کے خاکے اپنی دلکشی اور لطافت کی بدولت مقبول و معروف ہیں۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں مزاح نگاروں نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔اپنی بذلہ سنجی، مزاح کی شگفتگی، دلچسپ انداز تحریر اور فنی محاسن کے بھرپور استعمال کے ذریعہ انھوں نے اپنے خاکوں کے حسن میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ شخصیتوں کے خدوخال اور ان کے محاسن و مصائب کی ایسی دلکش و حقیقی تصویریں پیش کردیں کہ موضوع خاکہ کی شخصیت سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔غرض ان کے خاکے اپنی جاذبیت، دلچسپ و دلکش اسلوب اور فنی چابکدستی کی بدولت اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور بلاشبہ اردو ادب ان مزاح نگاروں کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر پائے گا۔

☆☆☆

حواشی

1. اردو کے منتخب خاکے۔الیاس شوقی ،ایچ۔ایس۔آفسٹ پرنٹرس،نئی دہلی،ص:17
2. نامی انصاری،مزاحیہ خاکہ نگاری،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،2003ء،ص۔182
3. اردو ادب میں خاکہ نگاری،ڈاکٹر صابرہ سعید،دہلی،2009ء،ص۔115
4. اردو کے منتخب خاکے،الیاس شوقی،ایچ ایس۔آفسٹ پرنٹرس،نئی دہلی۔2011ء،ص22

☆☆☆

کتابیات

کتابیات

سلسلہ نشان	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	ابن اسماعیل	اردو طنز و مزاح، احتساب و انتخاب	گلشن پبلشرز سری نگر،	1988
2	ابوالکلام قاسمی	رشید احمد صدیقی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت	، اتر پردیش اردو اکادمی	1990
3	احمد بشیر	جو ملے تھے راستے میں	زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور	1997ء
4	احمد جمال پاشاہ	ظرافت اور تنقید	بہار اردو اکادمی پٹنہ	1982ء
5	اسلم پرویز	مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین	اردو اکادمی دہلی	1989ء
6	اسلوب احمد انصاری	ادب اور تنقید	نیشنل آرٹ پرنٹرس الہ آباد	1968ء
7	اشفاق احمد ورک	اردو نثر میں طنز و مزاح	انتخاب جدید پریس، لاہور	2004ء
8	اشرف صبوحی	دلی کی چند عجیب ہستیاں	لاہور	2005
9	اصغر عباس	رشید احمد صدیقی آثار و اقدار	لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی	1984ء
10	افضل حسین	تعمیری ادب	مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی	1984
11	انور ظہیر خان	مت سہل ہمیں جانو	لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی	1996ء
12	اومکار کول	اردو اصناف (نظم و نثر) کی تدریس	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2003ء
13	آغا محمد باقر	تاریخ نظم و نثر	۔	۔
14	آل احمد سرور	رشید احمد صدیقی کے خطوط	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ	1996ء
15	حبیب ضیاء	حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2007ء
16	حسن چشتی	مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (شخصی خاکوں کا انتخاب)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2009ء
17	حسن چشتی	مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری	، دہلی	2003ء
18	خواجہ عبدالغفور،	طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ،	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔	1983ء
19	خواجہ محمد اکرام الدین	رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ	آفسٹ پرنٹرس، نئی دہلی	1994ء
20	خورشید اسلام	تنقیدیں	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	1964ء
21	خلیق انجم	مولوی عبدالحق ادبی و لسانی خدمات	ثمر آفسٹ پرنٹرس، دہلی	2003ء

22	رشید احمد صدیقی	آشفتہ بیانی میری	لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی	1988ء
23	رشید احمد صدیقی	خنداں	۔	1973ء
24	رشید احمد صدیقی	طنزیات ومضحکات	ہندوستانی اکادمی، الہ آباد	1973ء
25	رشید احمد صدیقی	ہمارے ذاکر صاحب	مکتب جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	1973ء
26	رشید احمد صدیقی	گنجہائے گراں مایہ	لبرٹ آرٹ پریس نئی دہلی	۔
27	رشید احمد صدیقی	مضامین رشید	انجمن ترقی اردو، نئی دہلی	2005ء
28	رشید احمد صدیقی	مضامین رشید	انجمن ترقی اردو، نئی دہلی	2005ء
29	ستار ساحر	جنوبی ہند میں اردو مرقع نگاری	سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی	2009ء
30	سعادت حسن منٹو	گنجے فرشتے	چودھری رشید احمد، مکتبہ جدید لاہور	1953
31	سعادت حسن منٹو	لاؤڈ اسپیکر	ساقی بک ڈپو، دہلی	1993
32	سعید عبداللہ	اردو ادب کی ایک صدی	فائن آفسٹ پرنٹرس دہلی	2002ء
33	سعیدہ جعفر	تاریخ ادب اردو عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک	وی جے پرنٹرس، حیدرآباد	2002ء
34	سلطان آزاد	بہار میں اردو طنز وظرافت	مکتبہ آزاد، پٹنہ	1989ء
35	سلیمان اطہر جاوید	رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن	نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد	1976ء
36	ڈاکٹر سنبل نگار	اردو نثر کا تنقیدی جائزہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2005ء
37	سید اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو	اردو کتاب گھر، دہلی	۔
38	سید عابد حسین	نثر اور اندازِ نثر	نسیم بک ڈپو، لکھنو	1984ء
39	سید نصیر الدین احمد	فکر تونسوی شخصیت اور طنز نگاری	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	1989ء
40	سید بشیر احمد	مزاح نگاراں حیدرآباد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2007ء
41	سید عبدالباری	کاوش نظر (تنقیدی مقالات کا مجموعہ)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2001ء
42	شاہد احمد دہلوی	بزم خوش نفساں	ساقی بک ڈپو، دہلی	2000ء
43	شاہد احمد دہلوی	گنجینۂ گوہر	عظیم پرنٹرز، کراچی	1962ء
44	شاہد احمد دہلوی	چند ادبی شخصیتیں	قلم پبلی کیشنز، ممبئی	1999ء
45	شفیق الرحمٰن	دریچے	فائن آفسیٹ پریس، دہلی	2002ء
46	شفیقہ فرحت	اردو ادب کو خواتین کی دین	اردو اکادمی دہلی	1994ء

47	شمیم حنفی	آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ	اردو اکادمی دہلی	1993ء
48	شوکت تھانوی	شیش محل	غفیف آفسٹ پرنٹرس، دہلی	2015 ء
49	شوکت تھانوی	خدوخال		
50	شہاب الدین ثاقب	انتخاب رشید احمد صدیقی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو	1983ء
51	صابرہ سعید	اردو ادب میں خاکہ نگاری	ایم۔ کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2009ء
52	صادقہ ذکی	ادب خواتین اور سماج	برقی آرٹ پریس، نئی دہلی،	1996ء
53	طارق سعید	اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	1996ء
54	طیبہ خاتون	اردو میں ادبی نثر کی تاریخ	مرکزی پرنٹرز، دہلی	1989ء
55	طاہر تونسوی	طنز و مزاح تاریخ و تنقید		
56	عبدالمغنی	جادہ اعتدال		
57	عرشیہ جبین	شارب ردولوی شخصیت اور تنقید نگاری	سلور لائن پرنٹرس، حیدرآباد	2005ء
58	عصمت چغتائی	دوزخی		
59	عصمت چغتائی	چوٹیں	فائن آفسیٹ پرنٹرس دہلی	2008ء
60	عوض سعید	خاکے	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	1985ء
61	فرمان فتح پوری	اردو نثر کا فنی ارتقاء	کاک آفسٹ پرنٹرس، دہلی	2006ء
62	فرمان فتح پوری	اردو کی ظریفانہ شاعری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004ء
63	فکر تونسوی	خدوخال	لاجپت رائے انڈ سنز	
64	قاضی انیس الحق	سید عابد حسین کے مضامین میں طنز و مزاح	ترسیل پبلیکیشنز بنگلور	
65	قاضی مشتاق احمد	اردو نثر ایک مطالعہ	موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2005ء
66	قمر رئیس	اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت	دہلی،	1986ء
67	کلیم الدین احمد	اردو تنقید پر ایک نظر	سرفراز قومی پریس، لکھنو	1969ء
68	مالک رام	رشید احمد صدیقی کردار افکار و گفتار	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	1875ء
69	مبین مرزا	اردو کے بہترین شخصی خاکے (جلد اول)	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2004ء

70	مبین مرزا	اردو کے بہترین شخصی خاکے (جلد دوم)	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2007ء
71	مبین مرزا	اردو کے بہترین شخصی خاکے (جلد سوم)	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2007ء
72	مجتبیٰ حسین	آدمی نامہ	ایم۔آر۔پبلیشنز، نئی دہلی	2010ء
73	مجتبیٰ حسین	چہرہ در چہرہ	غفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2011ء
74	مجتبیٰ حسین	سو ہے وہ بھی آدمی	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد	1987
75	مجیب احمد خان	ادبی تاثرات	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2002ء
76	محمد اشرف	عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات	غفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی،	2009ء
77	محمد خالد	اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت (سیمنار میں پیش کئے گئے مقالات انشائیوں اور خاکوں کا مجموعہ)	اردو اکادمی، دہلی،	2005ء
78	محمد طاہر	مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات	شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ	2003ء
79	محمد طیب انصاری	عہد آصفیہ اور اردو نثر کا ارتقا		1999ء
80	محمد عبدالرزاق فاروقی	اودھ پنچ کی ادبی خدمات (جلد اول)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2003ء
81	مظفر حنفی	آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح	اردو اکادمی، دہلی،	1992ء
82	مظفر علی شہ میری	کاوش فکر (تحقیقی و تنقیدی مقالات)	معراج پبلیکیشنز، حیدرآباد	2009ء
83	مناظر عاشق ہرگانوی	ادب میں گھوشٹ ازم (طنزیہ و مزاحیہ مضامین)	تخلیق کار پبلیکیشنز، نئی دہلی،	1997ء
84	مولوی عبدالحق	چند اہم عصر	اصلیہ آفسٹ پرنٹرس، دہلی	2004ء
85	مولوی محمد حسین آزاد،	آب حیات	ایچ۔ایس۔آفسٹ پرنٹرس، دہلی	2014ء

86	نامی انصاری	آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2003ء
87	نامی انصاری	بیسویں صدی میں طنز و مزاح	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2002ء
88	ندا فاضلی	ملاقاتیں	تاج کمرشیل آرٹ پرنٹرس، ممبئی	1971ء
89	محمد طیب انصاری	عہد آصفیہ اور اردو نثر کا ارتقاء		1999ء
90	مرزا فرحت اللہ بیگ	نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی	ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی،	1992ء
91	مرزا خلیل احمد بیگ	نذر مسعود	بیکسن بکس، ملتان	1989ء
92	نورالحسن نقوی	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	2006ء
93	نورالحسن نقوی	محمڈن کالج سے مسلم یونیورسٹی تک	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی،	
94	وزیر آغا	اردو ادب میں طنز و مزاح	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، علی گڑھ	1990ء
95	یوسف ناظم	ذکر خیر	نئی آواز جامعہ نگر، دہلی	1982ء
96	یوسف ناظم	سائے ہم سائے	زندن دلان، حیدرآباد، حیدرآباد	1975ء
97	یوسف ناظم	اردو کے منتخب خاکے	ایچ۔ ایس۔ آفسٹ پرنٹرس، نئی دہلی	2011ء
98	ہمایوں اشرف	کلیان منٹو (منٹو کے خاکے)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2007ء
99	ایس جے صادق	کنہیا لعل کپور حیات اور کارنامے		1975ء

الغات

-1	اردو انگلش ڈکشنری	عبدالحق	2001ء
-2	اردو ہندی ڈکشنری	اختر زماں	2003ء
-3	اعجاز الغات		
-4	القاموس الجدید اردو عربی ڈکشنری		
-5	تلگو اردو ڈکشنری	رام،راجو	
-6	رابعہ اردو لغت	سید۔اے۔شیخ	2007ء
-7	علمی اردو لغت	مولوی وارث سرہندی	1983ء
-8	فرہنگ آصفیہ	مولوی سید احمد دہلوی	
-9	فرہنگ عامرہ	محمد عبداللہ خاں	2003ء
-10	فیروز اللغات	مولوی فیروز الدین	2006ء
-11	نوراللغات	مولوی نورالحسن	1975ء
-12	نسیم اللغات	شیخ نیاز احمد	1975ء

English Dictionary

13. "Dictionary of literary terms by Harry shwo"

14. " Follons english urdu dictionary 1976"

15. " Oxford advanced heamers dictionary"

16. " Standared 21th centurey English to urdu dictionary"

17. " Standared 21th centurey urdu to English dictionary"

18. " The new encyclopidia of britanica"

19. " Wordinn Urdu English dictionary "

رسائل

1۔	آج کل	فروری	1996ء
2۔	سب رس	جولائی	1976ء
3۔	سب رس	ڈسمبر	1977ء
4۔	سب رس	اپریل	1976ء
5۔	سب رس	فروری	1976ء
6۔	سب رس	فروری	1977ء
7۔	شگوفہ	اپریل	2008ء
8۔	شگوفہ	اگسٹ	2011ء
9۔	شگوفہ	اگسٹ	2015ء
10۔	شگوفہ	جنوری	2016ء
11۔	شگوفہ	جولائی	2007ء
12۔	شگوفہ	جولائی	2011ء
13۔	شگوفہ	جون	2011ء
14۔	شگوفہ	جون	2015ء
15۔	شگوفہ	ڈسمبر	2009ء
16۔	شگوفہ	ڈسمبر	2015ء
17۔	شگوفہ	سپٹمبر	1999ء
18۔	شگوفہ	مارچ	2008ء
19۔	شگوفہ	مارچ	2015ء
20۔	شگوفہ	مئی	1983
21۔	شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر	نومبر	1987
22۔	فکر و نظر	اکتوبر	1962

23۔ قومی زبان	جولائی	1982
24۔ قومی زبان	اگست	1982
25۔ کتاب نما	جنوری	1985
26۔ نقوش طنز و مزاح نمبر		
27۔ نگار	اپریل	1958
28۔ نگار	گسٹ	1952
29۔ نگار	جولائی	1936
30۔ نگار	مارچ	1956

☆☆☆

اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح نگاروں

کے حوالے سے

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

نگران

ڈاکٹر عرشیہ جبین

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

مقالہ نگار

کے رحمت بی

ایم اے، ایم فل

شعبہ اردو اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔500046

2016

اردو ادب میں خاکہ نگاری

مزاح نگاروں کے حوالے سے

خاکہ اردو ادب کی منفرد صنف کی حیثیت سے مقبول عام ہے۔ خاکہ نہایت مختصر عرصے میں ادب کی ایک اہم ترین صنف کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ جن کی ایک وجہ یہ ہے کہ ادب کا بنیادی مقصد بزات خود انسان ہی کا مطالعہ و مشاہدہ قرار پاتا ہے اور خاکے میں یہ مقصد باقی اصناف کی نسبت زیادہ نمایاں ہو کے سامنے آتا ہے۔ خاکے کے لئے انگریزی اصطلاح Sketch رائج ہے۔ اس کے لغوی معنی کچہ نقشہ، ڈھانچہ، چربہ اور حدود وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاح میں خاکہ دراصل کسی شخصیت کی قلمی تصویر ہوتی ہے جس کا خالق ایک ادیب ہوتا ہے جو اپنی ادیبانہ قوتوں سے کسی شخص کی عکس کشی یا مرقع نگاری کرتا ہے۔ اس کے بنانے میں نہ سنگ تراشی کے اوزاروں کی ضرورت ہے، نہ رنگا رنگ پیالوں اور برش کی، نہ پنسل چارکول کی اور نہ کیمروں، بلکہ یہ صورتیں محض الفظ سے مرتب کی جاتی ہیں اور ان میں تصویروں اور مجسموں سے زیادہ دلکشی اور اثر خیزی ہوتی ہے۔ اور خاکے میں خارجی شخصیت کے مقابلے میں داخلی شخصیت یعنی عادات و اطوار، مزاح، نفسیات، پسند نہ پسند وغیرہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔

خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش شعراء کے تذکروں، مرزا غالب کے خطوط وغیرہ میں ملتے

ہیں۔ مگر محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' تذکروں کی ترقی یافتہ شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اس میں شعراء کے جاندار تصویریں نظر آتی ہیں۔ جن کا ثبوت ہمیں ''آب حیات'' میں شامل میرؔ، انشاؔ اور آتش وغیرہ کے مضامین سے ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد حسین آزد نے خاکہ نگاری کا ناک نقشہ کافی حد تک تیار کر چکے تھے۔

محمد حسین آزاد کے ذریعے رکھی ہوئی اس بنیاد کو مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مضمون ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کے ذریعہ اس کی عمارت کی طرف پہلا قدم رکھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد مولوی عبدالحق ، رشید احمد صدیقی ، خواجہ حسین نظامی ، شوکت تھانوی ، آغا حیدر حسن دہلوی ، عصمت چغتائی ، تخلص بھوپالی ، فکر تونسوی ، رئیس احمد جعفری ، شاہد احمد دہلوی ، سعادت حسن منٹو ، مجتبیٰ حسین اور عطاالحق قاسمی وغیرہ نے خاکہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ خاکہ نگاری کے بارے میں عام بات یہ ہے کہ زیادہ تر خاکہ نگاروں نے اس صنف کے پہلو بہ پہلو طنز و مزاح اور انشائیہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ اس طرح خاکہ نگاری میں دوسرے اصناف کی خصوصیات بھی اس میں شامل ہوگئی ہیں۔ اس طرح ان کی ادبی اہمیت کے پیش نظر میں نے ''اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح نگاروں کے حوالے سے'' کو اپنی پی۔ ایچ ڈی کے تحقیق کے لئے انتخاب کیا ہے۔ اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب ''اردو ادب میں خاکہ اور مزاح کی تعریف اور فن'' رکھا گیا ہے۔ اس باب میں

خاکہ اور مزاح کے لغوی معنی مختلف لغات کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔مثلاً اردو، ہندی، انگریزی، اور تلگو وغیرہ کی لغات کی مدد سے خاکہ اور مزاح کے معنی و مفہوم پیش کئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ مختلف ناقدین کی آراء کی مدد سے خاکہ اور مزاح کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔

دوسرا باب ''اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت'' کے تحت ہے۔اس بات میں شروع سے لے کر اب تک کہ خاکہ نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے اہم خاکوں کو بھی پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ ان کے اہم خاکوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس کی وجہ سے خاکہ نگاری کی تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم ''اردو ادب میں مزاح نگاری کی روایت'' ہے۔اس باب میں شروع سے لے کر اب تک اردو ادب میں مزاح نگاروں کے آغاز و ارتقاء کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔مثلاً مرزا غالب سے لے کر اب تک کے مزاح نگاروں کی ادبی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔اور ان کی اہم اور مشہور تصانیف کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

چوتھا باب ''اردو ادب میں خاکہ نگاری مزاح، نگاروں کے حوالے سے'' رکھا گیا ہے۔اس باب میں ایسے خاکہ نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے جو مزاح نگار بھی ہیں۔اس باب میں خاکہ نگاروں کے حالات زندگی اور شخصیت کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے ان کی خاکہ نگاری کی خصوصیات جیسے پہلی ملاقات، حلیہ، عادات و اطوار، گفتگو، مزاح، لطیفے، محاوروں اور تشبیہات وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

پانچواں باب ''مجموعی جائزہ'' کے تحت ہے اس میں مزاحیہ خاکہ نگاروں کی خصوصیات کا مجموعی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔اور ناقدین کے آراء کی مدد سے ان کے خاکوں کی خصوصیات کا احاطہ

کیا گیا ہے۔

آخر میں کتابیات درج کی گئی ہے۔اس میں ان کتابوں کی فہرست درج ہے جو حوالے کے طور پر استعمال کی گئی ہیں۔

کے۔رحمت۔بی
(ایم۔اے ایم۔فل)

☆☆☆